اُردو

یووک بھارتی

گیارھویں جماعت

بھارت کا آئین

حصہ 4 الف

بنیادی فرائض

حصہ 51 الف

بنیادی فرائض – بھارت کے ہر شہری کا یہ فرض ہوگا کہ وہ...

(الف) آئین پر کاربند رہے اور اس کے نصب العین اور اداروں، قومی پرچم اور قومی ترانے کا احترام کرے۔

(ب) ان اعلیٰ نصب العین کو عزیز رکھے اور ان کی تقلید کرے جو آزادی کی تحریک میں قوم کی رہنمائی کرتے رہے ہیں۔

(ج) بھارت کے اقتدارِ اعلیٰ، اتحاد اور سالمیت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرکے ان کا تحفّظ کرے۔

(د) ملک کی حفاظت کرے اور جب ضرورت پڑے قومی خدمت انجام دے۔

(ہ) مذہبی، لسانی اور علاقائی وطبقاتی تفرقات سے قطع نظر بھارت کے عوام الناس کے مابین یک جہتی اور عام بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دے نیز ایسی حرکات سے باز رہے جن سے خواتین کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہو۔

(و) ملک کی ملی جلی ثقافت کی قدر کرے اور اُسے برقرار رکھے۔

(ز) قدرتی ماحول کو جس میں جنگلات، جھیلیں، دریا اور جنگلی جانور شامل ہیں محفوظ رکھے اور بہتر بنائے اور جانداروں کے تئیں محبت وشفقت کا جذبہ رکھے۔

(ح) دانشورانہ رویے سے کام لے کر انسان دوستی اور تحقیقی واصلاحی شعور کو فروغ دے۔

(ط) قومی جائداد کا تحفظ کرے اور تشدد سے گریز کرے۔

(ی) تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں کی بہتر کارکردگی کے لیے کوشاں رہے تاکہ قوم متواتر ترقی و کامیابی کی منازل طے کرنے میں سرگرمِ عمل رہے۔

(ک) اگر ماں باپ یا ولی ہے، چھے سال سے چودہ سال تک کی عمر کے اپنے بچے یا وارڈ، جیسی بھی صورت ہو، کے لیے تعلیم کے مواقع فراہم کرے۔

سرکاری فیصلہ نمبر : ابھیاس-۲۱۱۶/ (پر-نمبر۱۶/۴۳) ایس ڈی-۴ مؤرّخہ ۲۵/اپریل ۲۰۱۶ء کے مطابق قائم کردہ رابطہ کار کمیٹی کی ۲۰/جون ۲۰۱۹ء کو منعقدہ نشست میں اس کتاب کو تعلیمی سال ۲۰-۲۰۱۹ء سے درسی کتاب کے طور پر منظوری دی گئی۔

زباندانی کے نئے نصاب کے مطابق

اُردو

یووک بھارتی

گیارھویں جماعت

مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک نرمتی و ابھیاس کرم سنشودھن منڈل، پونہ

اپنے اسمارٹ فون میں انسٹال کردہ Diksha App کے توسط سے درسی کتاب کے پہلے صفحے پر درج Q.R. code کے ذریعے ڈیجیٹل درسی کتاب، اسی طرح درس و تدریس کے مواد کے لیے مفید سمعی و بصری وسائل دستیاب ہوں گے۔

C5G3C3

پہلا ایڈیشن : ۲۰۱۹ء
(2019)
تیسرا اصلاح شدہ ایڈیشن: ۲۰۲۲ء
(2022)

© مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک نرمتی واَبھیاس کرم سنشودھن منڈل، پونہ-۴

نئے نصاب کے مطابق مجلسِ مطالعات وادارت اور مجلسِ مشاورت نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب کے جملہ حقوق مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک نرمتی واَبھیاس کرم سنشودھن منڈل، پونہ کے حق میں محفوظ ہیں۔ کتاب کا کوئی بھی حصہ مذکورہ منڈل کے ڈائرکٹر کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

مجلسِ مطالعات وادارت

- ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط (صدر)
- سلیم شہزاد (رکن)
- سلام بن رزّاق (رکن)
- احمد اقبال (رکن)
- ڈاکٹر قمر شریف (رکن)
- ڈاکٹر سیّد صفدر (رکن)
- ڈاکٹر محمد اسداللہ (رکن)
- ڈاکٹر ناصرالدین انصار (رکن)
- خان حسنین عاقب محمد شہباز خان (رکن)
- خان نوید الحق انعام الحق (رکن سکریٹری)

مجلسِ مشاورت

- خان انعام الرحمٰن شبیر احمد
- اعظمی محمد یٰسین محمد عمر
- ڈاکٹر شیخ محمد شرف الدین محمد یوسف
- ڈاکٹر ماجد قاضی
- ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی
- شمیم اقبال مومن
- ظفر عابد محمد مصطفیٰ
- خان عارفہ نوید الحق
- سیّد خالد سیّد اکبر علی
- فاروق سیّد
- محمد ابراہیم حسین لکمیشور
- محمد عالم ندوی
- شیخ حبیب الحسن محمد شعیب
- یوسف دیوان
- سیّد امجد الدین وقار الدین قادری
- ڈاکٹر اشفاق احمد

Co-ordinator:
Khan Navedul Haque Inamul Haque
Special Officer for Urdu, Balbharati

Production:
Shri Sachchitanand Aphale,
Chief Production Officer
Shri Rajendra Chindarkar,
Production Officer
Shri Rajendra Pandloskar,
Asst. Production Officer

D.T.P. & Layout:
Sayyed Asif Nisar,
Yusra Graphics,
Shop No. 5, Anamay Building,
305, Somwar Peth, Pune - 411 011.

Cover: Shri Vivekanand Patil

Paper: 70 GSM Cream Wove

Print Order:

Printer:

Publisher

Shri Vivek Uttam Gosavi
Controller,
M.S. Bureau of Textbook Production,
Prabhadevi, Mumbai - 400 025.

بھارت کا آئین

تمہید

ہم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے **عزم** کرتے ہیں کہ بھارت کو

ایک مقتدر سماج وادی غیر مذہبی عوامی جمہوریہ بنائیں

اوراس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں:

انصاف، سماجی، معاشی اور سیاسی؛

آزادی خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت؛

مساوات بہ اعتبارِ حیثیت اور موقع،

اوران سب میں

اُخوّت کوترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور

سالمیت کا تیقّن ہو؛

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر ۱۹۴۹ءکو یہ آئین

ذریعۂ ہٰذا اختیار کرتے ہیں،

وضع کرتے ہیں اوراپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔

راشٹر گیت

جَن گَن مَن - اَدِھ نایک جَیَہ ہے
بھارَت - بھاگیہ وِدَھاتا۔

پَنجاب، سِندھ، گُجرات، مَراٹھا،
دراوِڑ، اُتکَل، بَنگ،

وِندھیہ، ہِماچَل، یَمُنا، گنگا،
اُچّھل جَل دِھ تَرَنگ،

تَو شُبھ نامے جاگے، تَو شُبھ آشِس ماگے،
گاہے تَو جَیَہ گاتھا،

جَن گَن منگل دایَک جَیَہ ہے،
بھارَت - بھاگیَہ وِدھاتا۔

جَیَہ ہے، جَیَہ ہے، جَیَہ ہے،
جَیَہ جَیَہ جَیَہ، جَیَہ ہے۔

عہد

بھارت میرا ملک ہے۔ سب بھارتی میرے بھائی اور بہنیں ہیں۔

مجھے اپنے وطن سے پیار ہے اور مَیں اس کے عظیم و گونا گوں وِرثے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ مَیں ہمیشہ اِس ورثے کے قابل بننے کی کوشش کروں گا۔

میں اپنے والدین، استادوں اور بزرگوں کی عزّت کروں گا اور ہر ایک سے خوش اخلاقی کا برتاؤ کروں گا۔

میں اپنے ملک اور اپنے لوگوں کے لیے خود کو وقف کرنے کی قسم کھاتا ہوں۔ اُن کی بہتری اور خوش حالی ہی میں میری خوشی ہے۔

پیش لفظ

عزیز طلبہ!

گیارھویں جماعت میں آپ کا استقبال ہے۔اس جماعت میں آموزش کے لیے نئے طرز کی مشقی سرگرمیوں کے ساتھ 'اُردو یووک بھارتی' آپ کو پیش کرتے ہوئے ہمیں بڑی مسرّت ہو رہی ہے۔

سننے اور مشاہدہ کرنے سے زیادہ عملی طور پر حل کی گئی سرگرمیاں آپ کے ذہن پر دیرپا اثر مرتسم کریں گی۔اس کتاب میں نئی سرگرمیوں کو شامل کیا گیا ہے اور ان کی تعداد بھی قدرے زیادہ رکھی گئی ہے۔آپ کتاب کی آموزش کے لیے اساتذہ کے ساتھ ساتھ اپنے سرپرستوں سے بھی مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں شامل اسباق، نظمیں، مشقی سرگرمیاں، اضافی مطالعہ وغیرہ اپنے طور پر پڑھ کر بھی آپ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنی کوششوں سے ان تمام امور کی خواندگی کریں گے اور ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

اُردو صرف ایک مضمون کا نام نہیں ہے۔اس کا ہماری تہذیبی زندگی سے گہرا رشتہ ہے۔صحیح نظریۂ حیات کی تدریجی تشکیل اور سرمایۂ فکر میں اضافے کے لیے زبان کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔اس کے علاوہ ادب کا مطالعہ حصولِ مسرت کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔آپ اپنی روزمرہ زندگی میں ہمیشہ مادری زبان اُردو کا استعمال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اسکول میں آپ دیگر مضامین اُردو زبان ہی میں پڑھتے رہے ہیں۔زبان استعمال کرنے کے تعلق سے معیاری اُردو زبان کے استعمال پر زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔آپ کو اُردو مضمون پر جتنا عبور حاصل ہوگا، دوسرے مضامین کو سمجھنا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان و ادب کے مطالعے کا مؤثر ترین ذریعہ نصابی کتابیں ہیں۔اس درسی کتاب کے ذریعے ہمارا مقصد آپ میں خود اعتمادی پیدا کرنا ہے۔اس کتاب میں شامل سرگرمیوں اور اسباق کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ آپ زبان کو بہتر طور پر استعمال کر سکیں۔اسباق کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ آپ مختلف ادبی اصناف اور قدیم و جدید ادبی رجحانات سے روشناس ہوں۔آپ میں صالح معاشرتی نقطۂ نظر پیدا ہو اور آپ کا ادبی ذوق پروان چڑھے۔ان کے ذریعے آپ میں نئے علوم و فنون حاصل کرنے کی لگن پیدا ہو اور آپ کی تفہیم، تخلیق، تخیل اور غور و فکر کی صلاحیت میں اضافہ ہو۔اس مقصد کے حصول کے لیے درسی کتاب میں موجود مشقی سرگرمیوں میں آپ زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔اس کتاب کی آموزش کے دوران آپ کو جو بھی مشکل یا پریشانی محسوس ہو بلا خوف اپنے استاد کے سامنے اس کا اظہار کریں۔اس کتاب میں ایسی کئی سرگرمیاں شامل ہیں جن سے آپ بذاتِ خود علم حاصل کرنے کے قابل بن سکیں گے۔ان سرگرمیوں میں آپ جتنا حصہ لیں گے اتنا ہی زیادہ آپ کے علم میں اضافہ ہوگا۔

Q.R. کوڈ کے ذریعے زبان و ادب سے متعلق مزید اضافی اور کارآمد معلومات آپ کے لیے معاون ثابت ہوگی۔مختلف ویب سائٹ پر جا کر اپنے طور پر بھی معلومات حاصل کرنے کی عادت بنا لیں۔

کتاب کے مواد کے بارے میں آپ کے تاثرات جان کر ہمیں بہت خوشی ہوگی۔سال بھر آپ کی آموزش مسرت بخش رہے، ہم یہی اُمید کرتے ہیں۔

آپ کی عمدہ تعلیم اور بہتر مستقبل کے لیے نیک خواہشات!

(ڈاکٹر سنیل مگر)
ڈائرکٹر
مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک نرمتی و
ابھیاس کرم سنشودھن منڈل، پونہ-۴

پونہ۔
تاریخ: ۲۰ / جون ۲۰۱۹ء
بھارتیہ سَور: ۳۰ / جیشٹھ ۱۹۴۱

ہدایات برائے اساتذہ

گیارھویں جماعت کی درسی کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ پچھلی درسی کتابوں سے قدرے مختلف ہے۔ بچوں کے لیے مفت اور لازمی حق تعلیم کے قانون ۲۰۰۹ء کے مطابق از سرِ نو مرتب شدہ تعلیمی نصاب ۲۰۱۲ء کی روشنی میں تشکیلِ علم کے نظریے کے مطابق نیز خصوصی توجہ کے مستحق طلبہ کی ضروریات کے پیشِ نظر تعلیمی سرگرمیوں کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ سرگرمی نامے (امتحانی پرچے) کے مطابق اس کتاب کی مشقیں تیار کی گئی ہیں۔ لہٰذا تدریس کے دوران درج ذیل اُمور کا لحاظ رکھا جائے تو سیکھنے اور سکھانے کا عمل منفعت بخش ہوگا۔

۱۔ درسی کتاب کی مشمولات : مروّجہ طریقے کے مطابق اس کتاب میں نثر و نظم کا متن دو علیٰحدہ حصوں میں شامل کیا گیا ہے۔ نثر کے حصے میں داستان، افسانہ، انشائیہ، سفر نامہ، ڈراما، زبان اور ادب و ثقافت پر مبنی لسانی متن کی اصناف کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ہر سبق کے شروع میں 'پیش درس' کے تحت ان اصناف کا تعارف بھی شامل ہے تاکہ طلبہ سبق کی متعلقہ صنف سے بخوبی واقف ہو جائیں۔

اُردو نثر کے ابتدائی نمونے داستانی ادب میں ملتے ہیں۔ اس لیے نہال چند لاہوری کی 'گلشنِ عشق' سے ایک سبق 'داستان تاج الملوک کے پہنچنے کی بکاؤلی کی سرزمین میں' لیا گیا ہے جو اُردو نثر کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے۔ 'گلشنِ عشق' اُنیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لکھی گئی تھی اس لیے اس زمانے کے املا، نثری اسلوب اور آج کے نثری اسلوب میں فرق ہے۔ 'گلشنِ عشق' سے ماخوذ اس سبق میں قصداً قدیم املا اور طرز کو جوں کا توں رکھا گیا ہے تاکہ طلبہ قدیم و جدید اُردو نثر کے فرق سے واقف ہو سکیں۔ حصۂ نظم میں وَلیؔ دکنی کی غزل بھی قدیم اُردو کا نمونہ ہے۔ اساتذہ اُردو کے ان قدیم نمونوں کو پڑھاتے وقت اُردو کے تاریخی مدارج کو بھی پیش کریں تاکہ طلبہ از خود سیکھنے کی طرف مائل ہوں اور ہمہ وقت سیکھتے رہنے کا شوق اِن میں پروان چڑھے۔

۲۔ تناؤ کے بغیر اکتساب : کتاب کی نثری اور منظوم مشمولات کے انتخاب کے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ یہ دلچسپ اور زبان کے روزمرہ کے پیشِ نظر گیارھویں جماعت کے طلبہ کی فہم کے عین مطابق ہوں۔ اس سے طلبہ ذہنی تناؤ کے بغیر ان کا اکتساب کر سکیں گے۔ اساتذہ کو دورانِ تدریس جماعت میں ایسا اکتسابی ماحول تیار کرنا ہوگا جس سے طلبہ سبق میں دلچسپی لے کر از خود زبان و ادب کی آموزش کی طرف مائل ہوں اور اپنے طور پر تشکیلِ علم کا تجربہ حاصل کریں۔

۳۔ عالم کاری : آج سائنس کی ترقی اور الیکٹرانک وسائل کی وجہ سے ہماری وسیع دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ دور دراز کے خطّوں کی معلومات چند لمحوں میں ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں دنیا کے ادبی حالات سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے۔ ہماری درسیات اور نصاب کے موجودہ تقاضے کا خیال رکھتے ہوئے گیارھویں کی درسی کتاب میں روسی ڈراما نگار گوگول کے ڈرامے کا اُردو ترجمہ شامل کیا گیا ہے تاکہ طلبہ غیر ملکی ادب سے آگاہ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ اضافی معلومات کے خاکے اور متعلقہ سبق سے مربوط مزید اضافی معلومات طلبہ کو فراہم کی جا سکتی ہے۔ تدریس کا حصہ بنانے کے لیے ان خاکوں پر بھی سرگرمیاں تیار کی جا سکتی ہیں۔

۴۔ سرگرمی اساس اسباق : اس درسی کتاب میں اسباق اور منظومات کا انتخاب کچھ اس طرح عمل میں لایا گیا ہے کہ طلبہ دورانِ تدریس از خود تشکیلِ علم کر سکیں۔ ان اسباق میں سکھانے سے زیادہ سیکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ آپ بحیثیت تسہیل کار صرف تسہیل کاری ہی کرتے رہیں تو طلبہ زبان و ادب کی معتد بہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب کے بعض اسباق انٹرنیٹ اور دیگر الیکٹرانک میڈیا سے بھی جوڑے جا سکتے ہیں جیسے عبدالحلیم شررؔ، وَلیؔ دکنی، ناسخؔ وغیرہ سے متعلق معلومات آپ انٹرنیٹ پر دیکھ سکتے ہیں۔ آپ ایسی ہی معلومات حاصل کرنے کے لیے طلبہ کو آمادہ کریں تاکہ آپ کی تدریس اور طلبہ کی آموزش پُرلطف ہو سکے۔

۵۔ زبان کی صلاحیتوں کے فروغ پر زور: کتاب کے اسباق کے انتخاب میں اس امر کی طرف توجہ دی گئی ہے کہ طلبہ میں زبان کی چاروں صلاحیتوں

کو فروغ حاصل ہو۔ اسباق میں بالخصوص بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت کو اُبھارنے کے لیے خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ توقع ہے کہ آپ ان صلاحیتوں کا استعمال کر کے معیاری زبان بولنے کی مشق کرائیں گے تاکہ طلبہ معاشرے میں معیاری زبان میں گفتگو کریں اور اُردو تہذیب کی نمائندگی کر سکیں۔

۶۔ **معانی و اشارات** : اسباق میں آنے والے مشکل لفظوں، حوالوں اور لفظی ترکیبوں کے معانی کی وضاحتوں پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں الفاظ کے لغوی مفاہیم متن کے پس منظر میں واضح کیے گئے ہیں۔ کہیں لفظوں کا پرانا املا یا تلفظ ہو تو اسے بھی اس حصے میں وضاحت کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ لغوی اور مرادی معانی کی تفہیم متن کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرتی ہے۔ مشقوں میں بھی کچھ سرگرمیاں ایسی ہیں جن میں مشکل لفظوں کے معنی یا ان کے مترادفات پوچھے گئے ہیں۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ معانی و اشارات کے حصے پر توجہ دے کر طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کریں۔ آج کل موبائل پر اُردو کی مختلف لغات آسانی سے دستیاب ہیں اور ان کا استعمال بھی نہایت آسان ہے۔ ان لغات کے ذریعے مترادف اور ہم معنی الفاظ تلاش کرنے کے لیے آپ طلبہ کو اس جانب راغب کر سکتے ہیں۔

۷۔ **مشقی سرگرمیاں** : پچھلے دو سال سے دسویں اور سالِ گزشتہ سے بارھویں جماعت کے امتحانات کے لیے 'سرگرمی نامہ' استعمال کیا جا رہا ہے جو درسی کتاب میں شامل نہیں۔ زیرِ نظر درسی کتاب کی مشقی سرگرمیاں سرگرمی نامے کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ ان میں Question without question mark (سوال بلا سوالیہ نشان) کے نظریے کو اپنایا گیا ہے۔ مشقی سرگرمیوں میں تنوع پیدا کرنے اور انھیں جاذبِ توجہ بنانے کے لیے شِکلی (ویب) خاکے، رواں خاکے، شجری خاکے، جدولی تقسیم اور معروضی جوابات کی تکنیک پر زور دیا گیا ہے۔ مشقی سرگرمیوں میں نئی نئی تکنیکیں متعارف کرائی گئی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی مدد سے یہ مشقی سرگرمیاں طلبہ کی تشکیلِ علم کی صلاحیت میں قابلِ لحاظ اضافہ کرنے میں معاون ثابت ہوں گی اور ان کی وجہ سے قدر پیمائی اور آموزش کے ماحصل میں مزید سہولت ہوگی۔ یہ تمام خاکے 'سرگرمی نامے' کو مدِنظر رکھ کر تیار کیے گئے ہیں۔ کچھ زائد مشقی سرگرمیاں تفہیمِ سبق کے لیے **بطورِ خاص** شامل کی گئی ہیں اور بعض کو مسابقتی امتحانات کے طرز پر تیار کیا گیا ہے۔ استحسانی سرگرمیوں کا مقصد نظم و نثر کی تفہیم کے علاوہ پسندیدگی اور شعر و ادب کے جمالیاتی پہلو سے لطف اندوزی بھی ہے۔

۸۔ **عملی قواعد** : اسباق پر مشتمل اور نصاب میں شامل قواعد کو 'عملی قواعد' یعنی زبان کے روزمرہ استعمال کے پیشِ نظر آسان تر مثالوں اور وضاحتوں کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ قواعدی تفہیم کے لیے اسباق سے مثالیں دی ہوئی ہیں۔ ان کے مفصل تجزیے کے بعد قواعدی اصطلاح کی تعریف متعین کی گئی ہے۔ دوسری مماثل مثالیں ڈھونڈنے یا تیار کرنے کی ہدایات بھی یہاں شامل ہیں۔ آپ ان ہدایات کی روشنی میں قواعد پڑھائیں اور طلبہ کو ایسے مواقع فراہم کریں کہ وہ زبان کے عمومی استعمال میں عملی قواعد کی مثالوں کو پہچان لیں۔ اس تعلق سے پچھلی درسی کتابوں کے متن کی طرف بھی اساتذہ اور طلبہ کو متوجہ کیا گیا ہے۔ پچھلی جماعتوں کی درسی کتابوں میں اجزائے کلام (صَرف) اور نحو میں جملے کی اقسام پر غور کیا گیا تھا۔ اب اس کتاب میں جملے کی نحوی ترکیب اور تحویل و تقلیب کے ساتھ ہی لفظ سازی کے طریقوں پر بھی غور کیا گیا ہے۔ طلبہ اساتذہ کی مدد سے سبق کے جملوں کا نحوی تجزیہ بغور کر سکیں اس کے لیے قواعد کے حصے میں بیشتر مثالیں دی گئی ہیں۔

۹۔ **مثالیں** : مشمولات کی آموزش اور تفہیم میں طلبہ کی آسانی کے لیے کتاب کی مشقی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ مثالیں دی ہوئی ہیں۔ یہ مثالیں سرگرمی کو آسان بنانے اور سبق کے متن کی مکمل توضیح کے لیے نہایت مفید ہیں۔ اساتذہ ان مثالوں کے علاوہ دیگر مثالیں بھی اپنی تدریس کے دوران استعمال کر سکتے ہیں۔ اساتذہ اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ ان تمام سرگرمیوں کی شمولیت سرگرمی نامے میں ضروری نہیں ہے۔

۱۰۔ **وضاحتیں** : کتاب میں متن کی تفہیم کے لیے جگہ جگہ وضاحتیں کی گئی ہیں۔ اضافی معلومات کے خاکوں کے ذریعے متن کے بعض اہم نکات کی وضاحت اور معانی و اشارات کے ذیل میں بعض الفاظ کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسی جگہ زبان کو دیگر مضامین سے مربوط کرنے کے لیے تدریسی متن کے ساتھ علمی معلومات بھی دی گئی ہے۔ تدریس کے وقت آپ اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔ نثر و نظم کے متن میں بعض اہم حوالوں کی وضاحت اور ان کی تفہیم

کے لیے سرگرمیاں زیرِنظر کتاب کی ایک اور خصوصیت ہے۔متن میں آنے والے غیر معروف یا کم معروف تصور، شخص، واقعے وغیرہ کے کسی قدر مفصل تعارف پر مبنی اقتباسات کتاب میں جگہ جگہ شامل ہیں۔ان کا مطالعہ طلبہ کو زائد معلومات فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

۱۱۔ صلاحیتوں کی نشو و نما : درس و تدریس کو طالب علم مرکوز کرنے، اس میں خود آموزی پر زور دینے اور اسے طلبہ کے لیے مسرت بخش بنانے کے مقاصد کے تحت یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ درس و تدریس کے وقت یہ واضح ہونا چاہیے کہ ابتدائی تعلیم کے مختلف مرحلوں میں طلبہ میں کون سی مخصوص صلاحیت پروان چڑھے گی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس درسی کتاب میں زباندانی اور ادبی شعور کو جلا دینے والی متوقع صلاحیتوں کا تعین کیا گیا ہے۔

درسی کتاب میں گیارھویں کے طلبہ کی عمر کے گروہ سے تعلق رکھنے والے اور بچوں کی جذباتی دنیا سے ہم آہنگ نثر اور نظم کے اسباق کو شامل کیا گیا ہے۔ یہاں زباندانی کی صلاحیتوں کے ارتقا کے لیے جدید طرز کی مشقیں اور سرگرمیاں دی گئی ہیں۔مشقوں کے ذریعے طلبہ کی قوتِ مشاہدہ، قوتِ تخیل اور قوتِ عمل پر زور دیا گیا ہے۔عنوان 'عملی قواعد' کے تحت قواعد کے اجزا کو آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ زبان کی افہام و تفہیم، نئے الفاظ برتنا، روزمرہ اور محاوروں کا استعمال کرنا اور زبان و قواعد کے بارے میں آگہی پیدا کرنا، اِن مقاصد میں شامل ہے۔ اس کے تحت درسی کتاب میں مسرت بخش اور آسان زبان میں لکھا ہوا مواد شامل کیا گیا ہے۔ معاشرے کے تئیں ذمے داری، اخلاقی اقدار، قومی یکجہتی اور حب الوطن جیسے جذبات کو پروان چڑھانے کے لیے بھی اس کتاب میں مواد شامل ہے۔مختلف موضوعات پر بات چیت اور ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے طلبہ میں علمی شعور بیدار ہوگا۔طلبہ ازخود مضمون نویسی کریں، اپنے خیالات کا اظہار کریں، اس مقصد کے تحت متنوّع مشقیں اور سرگرمیاں درسی کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔

زیرِنظر درسی کتاب کی تدریس کے دوران اساتذہ اس امر کو ملحوظ رکھیں کہ جماعت میں جو کچھ سکھایا جائے، وہ اسکول سے باہر کی دنیا اور روزمرّہ زندگی کے معاملات سے لازمی طور پر مربوط ہو۔

کتاب کو حتی الامکان معیاری اور بے عیب بنانے کے لیے اس کا مسودہ ریاست مہاراشٹر کے مختلف علاقوں سے مدعو کیے گئے اساتذۂ کرام، ماہرینِ تعلیم اور ماہرینِ زبان کی خدمت میں تبصرے کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ان کے پیش کردہ مشوروں اور تجاویز کی روشنی میں مسودے میں ضروری ترمیم کرکے اسے قطعی شکل دی گئی ہے۔

گیارھویں جماعت کے لیے اُردو کی درسی کتاب 'یووک بھارتی' میں اُردو نثر کے اسباق کے موضوعات میں تنوّع کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ فطرت، سماج، ملک و قوم اور عالمی اِنسانی برادری کے موضوعات ہیں جن میں تاریخ اور ادب کے مختلف نکات کو سمیٹا گیا ہے۔ کتاب کے حصۂ نظم میں اُردو شاعری کی اہم اصناف مثلاً مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ وغیرہ کا تعارف پیش نظر رہا ہے۔نظموں کے موضوعات میں بھی کافی تنوّع ہے جو شاعری کے مختلف ادوار اور فنکارانہ رجحانات کی تصویر پیش کرتا ہے۔

نثر و نظم کے انتخاب کے وقت کوشش کی گئی ہے کہ اُردو زبان کا لسانی، تہذیبی اور ملکی تصور واضح ہوجائے۔کلاسک نثر و نظم کے نمونوں کے ساتھ جدید اور عصری ادبی تصورات پر مشتمل چیزیں جیسے نظامت، پروف ریڈنگ، ترجمہ نگاری، بلاگ اور ریڈیو جاکی طلبہ کے مطالعے کے لیے پیش کی جائیں۔ اُمید ہے کہ زبان، ملک اور معاشرے کو ماضی و حال کے آئینوں میں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے اس کتاب کی مشمولات طلبہ کے لیے ممد و معاون ہوں گی۔ کتاب میں شامل اضافی مطالعہ انشائیہ اور صحافت پر مشتمل ہے۔ان ادبی اصناف کے خد و خال، ان کی خوبیاں اور ادبی اہمیت سے روشناس کرانے کے لیے انھیں اضافی مطالعے میں شامل کیا گیا ہے۔

حالیہ زمانے کی درسی کتابیں جدید مواصلاتی تکنیکوں کے استعمال سے خالی نہیں رہ سکتیں۔ QR کوڈ کے علاوہ کتاب میں شامل متعدد اسباق جن کتابوں سے لیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر نیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔طلبہ اور اساتذہ اِن سے مطلوبہ معلومات حاصل کرکے اپنے علم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔اب تمام اُردو درسی کتابیں بال بھارتی کی ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہیں۔

متوقع صلاحیتیں

سننا

۱۔ ریڈیو اور مختلف نشریاتی وسائل پر ہونے والے مباحثوں، مذاکروں میں پیش کیے جانے والے حقائق کی جانچ کرنا۔
۲۔ عوامی اعلانات کو غور سے سن کر ان کا مطلب سمجھنا اور ان میں دی گئی ہدایات کے مطابق عمل کرنا۔
۳۔ رسمی اور غیر رسمی گفتگو سن کر اپنے خیالات کا اظہار کرنا۔
۴۔ مختلف اصنافِ ادب کو سن کر سمجھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا۔
۵۔ مختلف اصنافِ ادب کی سی ڈی سن کر اقسام کے مطابق ان کی درجہ بندی کرنا۔
۶۔ عوامی بول چال کی زبان، اس کے لب و لہجے اور لفظیات کی خصوصیات کا شعور ہونا۔

لکھنا

۱۔ املا نویسی کے وقت خوشخطی کے اُصولوں کی پوری پابندی کرنا۔
۲۔ سنے یا پڑھے گئے مواد کے مفہوم کے مطابق تیار کیے گئے نوٹس کے نکات کی توسیع کرنا۔
۳۔ دیے گئے موضوع کو اپنے طور پر دوبارہ لکھنا۔
۴۔ ذاتی طور پر لکھتے وقت محاورے، کہاوتیں، تراکیب اور اقوالِ زرین کا بخوبی استعمال کرنا۔
۵۔ دیے گئے موضوع پر آزادانہ طور پر مؤثر مواد تیار کرنا۔
۶۔ کسی واقعے یا حادثے پر مفصل مضمون لکھنا۔
۷۔ پیش آ چکے واقعات، تقریبات اور حادثات کی روداد لکھنا۔
۸۔ تعزیتی اور تہنیتی پیغام لکھنا۔

بولنا

۱۔ نظموں، گیتوں اور اجتماعی گیتوں کو علاماتِ اوقاف کا خیال رکھتے ہوئے پیش کرنا۔
۲۔ کہانی، نظم، ڈرامے وغیرہ کو ان کے لسانی تقاضوں کے مطابق پیش کرنا۔
۳۔ موقع ومحل اور موضوع کی مناسبت سے اپنی رائے کے ذریعے اپنے مقابل کو قائل کرنا۔
۴۔ مختلف سرگرمیوں کی منصوبہ بندی میں حصہ لینا۔
۵۔ مؤثر بات چیت کے لیے آدابِ گفتگو کا خیال رکھنا۔
۶۔ زبان کے مختلف مخاطبوں (استعمال کے طریقوں) کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی کوشش کرنا۔

مطالعہ کی صلاحیت

۱۔ حوالوں کے لیے لغت کا استعمال کرنا۔
۲۔ ہماری زبان اور دیگر عوامی بولیوں میں استعمال ہونے والے محاوروں اور کہاوتوں کی فہرست تیار کرنا اور موضوع و مفہوم کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کرنا۔
۳۔ جدید تکنیک کا استعمال کرکے اُردو اور دیگر زبانوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا۔
۴۔ مختلف اصنافِ ادب کی خصوصیات کی بنا پر درجہ بندی کرنا۔
۵۔ زبان کے فروغ کے لیے Apps استعمال کرنا۔
۶۔ اسباق کے متن کی بین السطور اور فوقِ لسانی تفہیم کی صلاحیت پیدا کرنا۔
۷۔ مطالعہ کیے ہوئے متن کے خیالات کو سمجھ کو انھیں ماحول سے مربوط کرنا۔

پڑھنا

۱۔ درسی اور غیر درسی مواد کو سمجھ کر معنی و مفہوم کا خیال رکھتے ہوئے بلند خوانی کرنا۔
۲۔ آواز کے مناسب اُتار چڑھاؤ کے ساتھ علاماتِ اوقاف کا خیال رکھتے ہوئے بامعنی بلند خوانی کرنا۔
۳۔ دی ہوئی عبارت کے مرکزی خیال، خلاصے اور مفہوم کو سمجھ کر پڑھنا۔
۴۔ مختلف اصنافِ ادب کا بغور مطالعہ کرکے ان سے لطف اندوز ہونا۔
۵۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ویب سائٹس پر دستیاب معلومات کا مطالعہ کرکے اس سے استفادہ کرنا۔
۶۔ عوامی مقامات پر درج ہدایات پڑھ کر ذاتی رائے قائم کرنا۔

قواعد

۱۔ زبان کے صرفی و نحوی اُصولوں سے واقفیت۔
۲۔ زبان کے صحیح استعمال کی اہلیت پیدا کرنا۔
۳۔ شعری محاسن سے آگاہی۔
۴۔ صحت الفاظ کے ساتھ زبان کو برتنے کا شعور۔
۵۔ لفظی اور معنوی صنعتوں کی پہچان۔

فہرست

نمبر شمار	اسباق	اصناف	موضوعات	شاعر/مصنف	صفحہ نمبر
	حصّۂ نثر				
۱۔	داستان تاج الملوک کے پہنچنے کی بکاؤلی کی سرزمین میں	داستان	ابتدائی اُردو کا تعارف	نہال چند لاہوری	۱
۲۔	میری سرگزشت	سوانح	خودنوشت	الطاف حسین حالؔی	۶
۳۔	فردوسِ بریں	ناول	ادبِ عالیہ کا تعارف	عبدالحلیم شرؔر	۱۳
۴۔	اوورکوٹ	افسانہ	ظاہری دِکھاوا	غلام عباس	۲۰
۵۔	اُردو لغت نویسی کی مختصر تاریخ	مضمون	لغت نویسی کا تعارف	عبدالرؤف پاریکھ	۲۶
۶۔	انسپکٹر جنرل	ڈراما	بدعنوانی کا ازالہ	ادارہ	۳۲
۷۔	مولانا محمد علی جوہرؔ	خاکہ	شخصیت نگاری	عبدالماجد دریابادی	۴۲
۸۔	نقاب اور چہرے	رپورتاژ	ادیبوں کی نجی زندگی	سلمیٰ صدیقی	۴۸
۹۔	مکاتیبِ اقبالؔ	خطوط	غیر رسمی خطوط	ڈاکٹر محمد اقبالؔ	۵۴
۱۰۔	زرد پتّوں کی بہار	سفرنامہ	آبائی مقام کی یادیں	رام لعل	۶۰
۱۱۔	پروفیسر گوپی چند نارنگ سے راست گفتگو	انٹرویو	ادیب سے ذاتی مکالمہ	گلزار جاوید	۶۵
☆	قواعد: جملے کی تحویل، استفہامیہ اقراری اور استفہامیہ انکاری، جملوں کا نحوی تجزیہ، طور، لفظ سازی				۷۰
	حصّۂ نظم				
۱۔	حمدیہ رباعیات	حمد	اللہ کی تعریف	مرزا سلامت علی دبیؔر	۷۶
۲۔	نعتِ رسولؐ	نعت	رسول اللہؐ کا اکرام	حفیظؔ جالندھری	۸۰
۳۔	عشقِ حقیقی	مثنوی	عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی	نواب مرزا شوقؔ لکھنوی	۸۳
۴۔	درشانِ حمید الدّولہ	قصیدہ	نواب کی مدح	خواجہ ابراہیم ذوقؔ	۸۶
۵۔	تلوار کا پانی	مرثیہ	عباس کا پانی لینے جانا	آرزوؔ لکھنوی	۹۰
۶۔	ہم زندہ رہیں گے	نظم	مستقبل کے عزائم	فراقؔ گورکھپوری	۹۳
۷۔	آدمیوں کے میلے میں	نظم	فرد اور ذات کی شناخت	خلیل الرحمٰن اعظمی	۹۶
۸۔	بیکراں سمندر	نظم	وقت کا تسلط	زاہدہ زیدی	۹۹
۹۔	قطعات		طنز و مزاح	اکبرؔ الہ آبادی	۱۰۲
۱۰۔	غزلیات		ولؔی دکنی، امام بخش ناسخؔ، ریاضؔ خیرآبادی، نوحؔ ناروی، خورشید احمد جامؔی، باقرؔ مہدی، رؤف خیرؔ		۱۰۶
☆	قواعد: مجازِ مرسل، لف و نشر، تجنیسِ خطی، تجنیسِ زائد/ ناقص، تجنیسِ مذیل، بحر اور تقطیع، بحرِ متقارب، بحرِ ہزج				۱۲۲
	اضافی مطالعہ				
۱۔	اُمید کی خوشی	انشائیہ	اُمید پرستی	سرسیّد احمد خاں	۱۲۸
۲۔	مچھر	انشائیہ	طنز و مزاح	خواجہ حسن نظامی	۱۳۱
۳۔	بے ترتیبی	انشائیہ	ترتیب پسندی کی اہمیت	احمد جمال پاشا	۱۳۴
۴۔	صحافت کسے کہتے ہیں؟	مضمون	صحافت کا تعارف	سیّد اقبال قادری	۱۳۶
۵۔	اُردو کا ضبط شدہ ادب	اداریہ	فراموش کردہ ادب کی افادیت	ظ۔ انصاری	۱۴۱
۶۔	کہانیاں رہیں نہ کردار	کالم	گزشتہ واقعات کی اہمیت	شاہد لطیف	۱۴۴
☆	**اطلاقی تحریر** : نظامت، پروف ریڈنگ، ترجمہ نگاری، بلاگ، ریڈیو جاکی				۱۴۷

حصّۂ نثر

۱ داستان تاج الملوک کے پہنچنے کی بکاؤلی کی سرزمین میں

نہال چند لاہوری

پیش درس

اُردو میں داستان گوئی کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ دکنی میں لکھی گئی ملا وجہی کی 'سب رس' کو اُردو کی پہلی داستان تسلیم کیا گیا ہے۔ داستان میں قصہ در قصہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ عموماً اس کی نثر مقفّیٰ ہوتی ہے۔ اس کا ہیرو دیووں، جنوں، پریوں، جنگلی جانوروں، سمندری عفریتوں اور جادوگروں کا مقابلہ کرتے ہوئے کوہ و بیابان کو طے کرتا ہوا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے۔

انگریزوں نے اپنے ملازمین کو اُردو سکھانے کے لیے ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ وہاں کے پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے ملک بھر سے منتخب ادیبوں کا تقرر کیا جو منشی کہلاتے تھے۔ یہ لوگ درس و تدریس کے ساتھ نصابی کتابیں بھی تیار کرتے تھے۔ میر امن، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، للو لال، نہال چند لاہوری، مرزا علی لطف، بنی نارائن جہاںؔ وغیرہ فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ نہال چند لاہوری نے عزّت اللہ بنگالی کی فارسی تصنیف کا اُردو ترجمہ 'مذہبِ عشق' کے نام سے کیا۔ ہندوستانی لوک کتھاؤں میں یہ قصہ گل بکاؤلی کے نام سے بہت مشہور ہے۔ دیاشنکر نسیمؔ نے اسی قصے کو 'گلزارِ نسیم' کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ نہال چند نے اپنے ترجمے کو اصل سے بالکل قریب رکھتے ہوئے تکلّفات سے بچنے کی کوشش کی ہے اور ترجمے میں سادگی اختیار کر کے قصے کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس کتاب کا سنۂ اشاعت ۱۸۱۳ء ہے۔ اس وقت مترجم کو اس کتاب پر ایک سو پچاس روپے کا انعام ملا تھا۔

'مذہبِ عشق' اُردو کی ابتدائی داستانوں میں نہایت اہم ہے۔ اس میں گل بکاؤلی کا قصہ درج ہے۔ اس کی زبان اگرچہ قدیم ہے لیکن رواں ہے۔ اس میں محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال متن کو دلکش بنا دیتا ہے۔ مصنف نے نثر میں تشبیہات اور استعارات کو بھی برتا ہے جن کی وجہ سے زبان میں شیرینی پیدا ہو گئی ہے۔

اس سبق کے محاوروں کو درسی نکتہ بنا کر زبان کی چاشنی سے متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ سبق میں بیان کی ہوئی کہانی ہمارے ملک کی دیومالائی اور اساطیری روایات سے تعلق رکھتی ہے۔ داستان میں بالعموم دیووں، جادوگروں، شعبدہ بازوں، جنوں اور پریوں جیسے ما فوق الفطرت کرداروں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس داستان میں بھی پہاڑی دیو کا ذکر متحیر کر دینے والا ہے۔

جان پہچان

نہال چند لاہوری کے اجداد کا تعلق دلّی سے تھا۔ وہ دلّی میں پیدا ہوئے لیکن جان گل کرسٹ نے ان کا وطن بارا سوت بتایا ہے۔ دلّی کی تباہی کے بعد نہال چند لاہور چلے گئے اس لیے لاہوری کہلائے۔ ۱۸۰۲ء میں ایک انگریز افسر کی وساطت سے انھوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ملازمت اختیار کی۔ ان کی تاریخِ پیدائش اور وفات کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

راویِ شیریں زباں یہ داستان یوں بیان کرتا ہے کہ تاج الملوک نے ٹھاٹھ قلندرانہ کیا اور چہرے پر راکھ مَل، پھر خدا کا نام لے کر چل نکلا۔

بعد کئی روز کے ایک ایسی وادیِ پرخار میں کہ جس کی انتہا نہ تھی، تاریکی سے ہرگز دن رات میں فرق معلوم نہ ہوتا تھا، سُپیدی اور سیاہی میں ذرّہ بھی امتیاز نہ کیا جاتا تھا، وہاں جا وارِد ہوا اور اپنے دل کو ڈھارس دے کر کہنے لگا کہ اے عزیز! یہ پہلی ہی بحرِ مصیبت کی لہر ہے۔ تجھ کو تو ابھی دریا کا دریا تیرنا ہے۔ ہمت کی کمر چست باندھ اور سَمندر کے مانند آپ کو اس آتش کدے میں ڈال۔ دیکھ تو خدا کیا کرتا ہے۔

یہ سوچ کر آخرش اس صحرا میں چل نکلا۔ جو قدم پڑتا تھا، کانٹا گڑتا تھا، ہر گام پر آہ و نالہ کرتا تھا۔ غرض اس جنگلِ خونخوار میں جو جاہلوں کے دل سے تاریک تر تھا، درندوں کا مسکنِ پُرخطر تھا۔ اگر ایک دم وہاں آفتاب آئے تو اپنا نور کھو جائے۔ ہر طرف اژدہے بھوکے پیاسے، منہ کھولے پڑے تھے گویا خالی گھروں کے دروازے۔ مدت تک شہزادہ داہنے بائیں چاروں طرف دوڑتا پھرا۔ جھاڑیوں کی رگڑ سے بدن چھل گیا۔ ہر ایک عضو سے لہو ٹپکنے لگا۔ پھول سے تلوے اس کے، ببول کے کانٹوں سے چھِد گئے۔

شہزادے نے ایسی مصیبت اور محنت اُٹھا کر بارے اُس جنگل کو طے کیا اور لاکھوں سجدے شکرِ الٰہی کے بجا لاکر آگے بڑھا۔ سامنے سے ایک دیو پہاڑ سا بیٹھا نظر آیا۔ وہ سمجھا، یہ پہاڑ ہے۔ جب نزدیک پہنچا دفعتہً اس ظالم نے اپنے قد کو بلند کیا، ہم سرِ فلک ہوگیا اور مارے خوشی کے بادل سا گرج کر بولا کہ تصدق ہو جاؤں میں رزّاق کے اور قربان ہوں اُس خالق کے کہ جس نے ایسا لقمۂ لطیف مجھ دیوِ کثیف کے واسطے گھر بیٹھے بھیجا۔ یہ کہہ کر شہزادے سے مخاطب ہوکر بولا کہ اس ایامِ جوانی میں کس نے تجھے عروسِ اجل کا مشتاق کیا اور حلاوتِ زندگانی کو تجھ پر شاق کیا جو تو شہرِ حیات کو چھوڑ کر پائے خواہش سے ویرانۂ موت میں آیا؟

شہزادہ اس کی ہیبت سے تھرّایا۔ چہرے کا رنگ پتنگ سا اُڑ گیا۔ منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ کہا، ''اے دیو! تو میرا حال کیا پوچھتا ہے کہ زندگی اس دنیائے فانی کی مجھ پر وبال ہوئی ہے۔ اگر مجھے اپنی جان عزیز ہوتی تو میں ہرگز آپ کو موت کے پنجے میں نہ ڈالتا اور تجھ سے خونخوار کے دام میں گرفتار نہ ہوتا۔ مجھ کو اس زندگی کی صعوبت سے چھڑا اور بلا توقف میرا کام تمام کر کہ مجھ پر اس ساعت کی زیست سو برس کی مشقت کے برابر ہے۔''

دیو کو اس کی دردانگیز باتوں پر رحم آیا۔ حضرت سلیمانؑ کی قسم کھائی اور یہ بات زبان پر لایا کہ اے آدم زاد! میں تجھے ہرگز رنجیدہ خاطر نہ کروں گا بلکہ اپنی پناہ میں رکھ کر جس مطلب کے واسطے نکلا ہے، اس میں کوشش اور مدد کروں گا۔

پس ہر روز دیو شہزادے پر شفقت زیادہ کرتا اور بارہا دلاسا دیا کرتا۔ تاج الملوک بھی میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس سے شیر و شکر کے مانند مل گیا اور چاپلوسی سے اس کو محبت کے شیشے میں اُتارا۔

القصّہ، ایک روز دیو نے مہربان ہوکر کہا کہ ''تیری غذا کیا ہے، میں لاؤں؟''

تاج الملوک نے عرض کی، ''آدمیوں کی غذا شکر، گھی، میدہ، گوشت وغیرہ یہی چیزیں ہیں۔''

یہ سنتے ہی دیو اُٹھ دوڑا اور ایسے قافلے پر پہنچا کہ جس کے لوگ شکر اور گھی اور میدہ اونٹوں پر لادے ہوئے کہیں لیے جاتے تھے۔ وہ لدے لدائے اونٹ اُٹھا کر شہزادے کے آگے لے آیا۔ کہا، ''اپنی خورش لے اور اس میں سے کچھ کھا۔''

تاج الملوک نے اونٹوں پر سے وہ سب اُتار لیا اور انھیں جنگل میں چھوڑ دیا۔ پھر ہر روز کچّی پکّی روٹی پکا کر کھانے لگا۔

اسی طرح چند روز گزرے۔ ایک دن شہزادے نے کئی من میدہ لے کر اس میں گھی شکر ملا کر بڑی بڑی پتھر کی چٹانوں پر ڈال کے ہاتھ پاؤں سے خوب روند کر گوندھا۔ پھر ادھر ادھر سے سوکھی لکڑیاں جمع کر کے روغنی روٹی سینک سانک کر تیار کی اور ایک اونٹ کے کباب بھی خوب نمکین بھونے۔ دیو نے دیکھ کر پوچھا کہ ''آج تو نے کیوں اتنی تکلیف اٹھائی اور کس واسطے فضولی پر کمر باندھی ہے؟''

تاج الملوک نے کہا، ''یہ سب تمھارے لیے ہے تا کہ تم بھی ایک نوالہ اس میں سے کھا کر آدمیوں کے کھانے کی لذت دریافت

کرو۔‘‘

دیو نے ایکبارگی سب کا سب اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ از بس کہ اس طرح کے کھانے کی اس نے کبھی لذت نہ چکھی تھی، مارے خوشی کے اُچھل اُچھل کر کھاتا تھا اور شاباش کہہ کر تعریف کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ’’اے آدم زاد! تو نے مجھے ایسی چیز کھلائی کہ میرے باپ دادا نے بھی کبھی نہ کھائی ہوگی۔ بلکہ آج تک کسی دیو نے ایسے کھانے کی لذت نہ پائی ہوگی۔ اس روٹی کے ٹکڑے کا احسان میں ابد تک مانوں گا اور دل سے تیرا ممنون رہوں گا۔‘‘

شہزادے نے جو اس کی رغبت دیکھی تو ہر روز نئی قسم کی روٹی اور کباب تیار کر کے کھلاتا۔ دیو نہایت خوش ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک روز خود بخود کہنے لگا، ’’اے آدم زاد! تو ہر روز اس لقمۂ لذیذ سے مجھے ایسا خُرسند رکھتا ہے کہ اگر میرے بدن پر ہر روئیں کی جگہ زبان پیدا ہو اور ہر زبان سے شکر تیرے احسان کا ادا کروں تو بھی نہ ہو سکے لیکن اب تک ایسا تیرا کوئی کام میرے ہاتھ سے نہیں نکلا۔ اگر کچھ مطلب ہو تو بیان کر۔‘‘

تاج الملوک نے عرض کی، ’’میں نے سنا ہے، دیووں کا مزاج اکثر جھوٹ کی طرف راغب ہوتا ہے اور اپنی بات پر قائم نہیں رہتے۔ اگر تم حضرت سلیمانؑ کی قسم کھاؤ تو میں اپنا راز تم سے ظاہر کروں۔

تب دیو بولا کہ میں اس بزرگ قسم سے ڈرتا ہوں۔ خدا جانے تو کیا کہے۔ اگر وہ مجھ سے نہ ہو سکے تو مرنا پڑے۔

آخرش چار و ناچار قسم کھائی اور پوچھا، ’’کہو کیا مطلب ہے؟‘‘

تاج الملوک نے کہا، ’’ایک مدت سے مجھ کو ملکِ بکاؤلی کی سیر کا سودا ہوتا ہے، اس سرزمین میں پہنچا دے۔ یہی میری آرزو ہے۔‘‘

یہ بات سنتے ہی اس نے ایک دمِ سرد سینے سے کھینچا اور دو ہتڑ اپنے سر پر مار کر بے ہوش ہو گیا۔

بعد ایک ساعت کے ہوش میں جو آیا، ہائے ہائے کرنے لگا اور ماتم زدوں کی صورت بنا کر بولا، ’’اے آدم زاد! حق تعالیٰ نے تیری اجل کا سر رشتہ میرے ہاتھ میں نہ دیا بلکہ میری حیات کی باگ تیرے ہاتھ میں دے دی۔ سن! بکاؤلی پریوں کے بادشاہ کی بیٹی ہے۔ اٹھارہ ہزار دیو بلکہ اس سے بھی زیادہ اُس کے باپ کے غلام ہیں۔ وہ ہر طرف اُس کے ملک کی پاسبانی کرتے ہیں۔ میں تو ایک طرف، وہاں کے خاص چوکی دار جو اُس ملک سے نزدیک ہیں، انھوں نے بھی اُس شہر کی چار دیواری کو نہ دیکھا ہوگا۔ کسی ذی حیات کی کیا طاقت، بلکہ صرصر بھی ان دیووں کی اجازت کے بغیر جو برس روز کی راہ تک نگہبان ہیں، ممکن نہیں کہ پہنچ سکے۔ اور پریاں بے شمار دن رات نگہبانی میں مشغول ہیں کہ کوئی پرندہ اس سرحد میں پر نہ مارے اور زمین کے نیچے چوہوں کا بادشاہ بے انتہا فوج سے، اور سانپ بچھوؤں کا لشکر زمین پر محافظت کے واسطے مقرر ہے تا کوئی سرنگ لگا کر بھی نہ پہنچے۔ بھلا پھر میں تجھے وہاں کیوں کر پہنچاؤں اور جو نہ پہنچا تو یقین ہے کہ بہ سبب اس قسم کے جان سے جاؤں۔ اب تو' ایک کام کر کہ آج پھر اسی طرح سے کھانا پکا۔ دیکھ کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہو اور میری کوشش کے ہاتھوں کیا بن پڑے۔‘‘

معانی و اشارات

چہرے پر راکھ مَلنا	-	جوگی کی صورت بنانا
انتہا نہ ہونا	-	حد نہ ہونا
سَمَنْدَر	-	ایک خیالی کیڑا جو آگ میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں رہتا ہے۔ آگ سے باہر نکلتے ہی مر جاتا ہے
آخرش	-	آخرکار، انجام کار
ہم سرِ فلک	-	آسمان کے برابر، آسمان کا ہم پلّہ
تصدّق ہونا	-	قربان ہونا
عروسِ اجل	-	موت کی دلہن (مراد موت)
حلاوت	-	مٹھاس
چہرے کا رنگ اُڑنا	-	خوف یا رنج طاری ہونا
منہ پر ہوائیاں چھوٹنا	-	گھبرا جانا، چہرے کا رنگ اُڑ جانا
صعوبت	-	مصیبت، پریشانی، مشکل
شیر و شکر ہونا	-	گھل مل جانا
خورِش	-	کھانا، خوراک
خُرسند (خورسند)	-	خوش، مسرور، شادماں
سودا ہونا	-	جنون ہونا
دمِ سرد کھینچنا	-	ٹھنڈی سانس لینا، صدمہ ہونا
دو ہتّڑ مارنا	-	سر پیٹنا، دونوں ہاتھ سے مارنا
سررشتہ ہاتھ میں نہ دینا	-	مراد اختیار نہ دینا
پرندے کا پر نہ مارنا	-	کسی کا گزر نہ ہونا
برس روز کی راہ	-	ایک سال کی مدت کا راستہ
بن پڑنا	-	ممکن ہونا

مشقی سرگرمیاں

* شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

زیرِ اضافت کی تراکیب

* ذیل کا خاکہ مکمل کیجیے۔

صحرا کی خصوصیات

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ تاج الملوک کے سفر کے پہلے پڑاؤ کی منظر کشی کیجیے۔

۲۔ سبق سے دیو کی خود کلامی کا اقتباس نقل کیجیے۔

۳۔ اقتباس کے حوالے سے 'اے عزیز!' کے مخاطِب اور مخاطَب کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ خونخوار جنگل کو پار کرنے میں تاج الملوک کی مصیبتوں کو تحریر کیجیے۔

۵۔ دیو اور تاج الملوک کے مکالموں کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۶۔ دیو کے حضرت سلیمانؑ کی قسم نہ کھانے کی وجہ پر روشنی ڈالیے۔

۷۔ دیو کو پہلی مرتبہ پیش کی گئی غذا کی تفصیل لکھیے۔

۸۔ آدمیوں کی غذا کھانے کے بعد دیو کا ردِّعمل بیان کیجیے۔

۹۔ سبق سے محاورے تلاش کرکے معنی کے ساتھ لکھیے۔

۱۰۔ سبق سے قدیم الفاظ اور تراکیب کی فہرست تیار کیجیے۔

* ہدایات کے مطابق قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ شہزادے نے ایسی مصیبت اور محنت اُٹھا کر بارے اُس جنگل کو طے کیا۔
(جملے کے زمانے کو 'ماضی استمراری' میں تبدیل کیجیے)

۲۔ اِس روٹی کے ٹکڑے کا احسان مَیں ابد تک مانوں گا۔
(مفہوم کو تبدیل نہ کرتے ہوئے جملے کو منفی جملہ بنائیے)

۳۔ ''مَیں نے سنا ہے۔''
(جملے کو طورِ مجہول میں لکھیے)

۴۔ ایک مدت سے مجھ کو ملکِ بکاؤلی کی سیر کا سودا ہے۔
(جملے سے حروفِ جار اور اضافت الگ کر کے لکھیے)

* ذیل کے جملے کی استحسانی خوبی بیان کیجیے۔

"دفعتہً اس ظالم نے اپنے قد کو بلند کیا، ہم سرِ فلک ہو گیا اور مارے خوشی کے بادل سا گرج کر بولا کہ تصدق ہو جاؤں میں رزّاق کے اور قربان ہوں اس خالق کے کہ جس نے ایسا لقمۂ لطیف مجھ دیو کثیف کے واسطے گھر بیٹھے بھیجا۔"

* درج ذیل کے لیے سبق میں استعمال ہوئے استعارے لکھیے۔

وادیِ پُر خار ←	....	....
صحرا ←	....	....

* سبق کی روشنی میں خاکہ مکمل کیجیے۔

آدمیوں کی غذا

* دیو نے تاج الملوک کو 'بکاؤلی' کے بارے میں جو باتیں بتائیں، نکات کے تحت خالی جگہوں میں مکمل جملے لکھیے۔

بکاؤلی ←	....
غلام ←	....
پریاں ←	....
چوہے ←	....

* صحرا میں پہنچنے پر تاج الملوک کی اپنے آپ سے گفتگو کا خاکہ مکمل کیجیے۔

تاج الملوک کی اپنے آپ سے گفتگو کے مکالمے ←	....
←	....
←	....
←	....

* ذیل کے جملوں سے متضاد الفاظ تلاش کر کے خاکہ مکمل کیجیے۔

۱۔ ایک ایسی وادیِ پرخار میں کہ جس کی انتہا نہ تھی، تاریکی سے ہرگز دن رات میں فرق معلوم نہ ہوتا تھا۔

۲۔ سُپیدی اور سیاہی میں ذرّہ بھی امتیاز نہ کیا جاتا تھا، وہاں جا وارد ہوا۔

۳۔ قربان ہوں اس خالق کے کہ جس نے ایسا لقمۂ لطیف مجھ دیو کثیف کے واسطے گھر بیٹھے بھیجا۔

۴۔ دیو شہزادے سے مخاطب ہو کر بولا کہ اس ایامِ جوانی میں کس نے تجھے عروسِ اجل کا مشتاق کیا اور حلاوت زندگانی کو تجھ پر شاق کیا جو تو شہرِ حیات کو چھوڑ کر پائے خواہش سے ویرانۂ موت میں آیا؟

متضاد الفاظ

* اپنی پڑھی ہوئی کوئی ایسی کہانی مختصراً لکھیے جس میں مافوق الفطرت کرداروں کا ذکر ہو۔

* گزشتہ جماعت کی کسی درسی کتاب سے کوئی داستان کا حصہ پڑھ کر اس پر اپنے الفاظ میں تبصرہ کیجیے۔

نکات : داستان کا نام، مصنف کا نام و تعارف، داستان کا اپنے الفاظ میں تجزیہ و تبصرہ۔

* مختلف داستانوں اور ان کے مصنفوں کے ناموں کی فہرست بنائیے۔

۲

میری سرگزشت

الطاف حسین حالؔی

پیش درس

نثری اصناف میں سوانح ایک اہم صنف ہے۔ اُردو میں اس صنف کی ابتدا الطاف حسین حالؔی نے کی۔ مرزا غالبؔ کی سوانح 'یادگارِ غالب'، سرسیّد کی سوانح 'حیاتِ جاوید' اور سعدؔی شیرازی کی سوانح 'حیاتِ سعدی' ان کی اہم سوانحی تصانیف ہیں۔ حالؔی کے بعد شبلی نے سوانح نگاری کو خوب پروان چڑھایا۔ انھوں نے 'سیرت النبیؐ' کے علاوہ 'المامون، الفاروق، الغزالی' اور 'سوانح مولانا روم' لکھیں۔ اس دوران سوانح عمریوں کے ساتھ ہی خودنوشت لکھنے کی روایت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ خودنوشت میں مصنف اپنی زندگی کے حالات و واقعات بیان کرتا ہے۔ مصنف دیانت دار ہو تو اپنی ذاتی کمزوریوں کا انکشاف بھی نہایت جرأت کے ساتھ کرتا ہے۔

مولانا جعفر تھانیسری کی 'تواریخِ عجیب'، خواجہ حسن نظامی کی 'آپ بیتی'، جوشؔ ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات' کے علاوہ آل احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں'، ندا فاضلی کی 'دیواروں کے بیچ' وغیرہ اُردو کی اہم خودنوشتوں میں شمار ہوتی ہیں۔

حالؔی نے اپنی خودنوشت پہلے فارسی میں لکھی تھی پھر اُردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ یہ نہایت مختصر سی خودنوشت ہے جس کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ اس خودنوشت کی ادبی و لسانی خوبیوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں انھوں نے فارسی تراکیب سے اجتناب برتا ہے۔ یہ خودنوشت حالؔی کے علمی شوق اور حصولِ علم میں پیش آئی دشواریوں کا لیکھا جوکھا ہے۔ حالؔی نے اس میں اپنے ابتدائی زمانے کے حالات نقل کیے ہیں۔ شروع میں انھوں نے قومِ انصار کی، جس کے وہ ایک فرد تھے، سات سو سالہ تاریخ بیان کردی ہے۔ پھر اپنے گھریلو حالات بیان کیے ہیں۔ حصولِ تعلیم میں آنے والی دشواریوں کا ذکر کیا ہے۔ گھریلو ذمے داریوں کو چھوڑ کر پانی پت سے دلّی پہنچنے کے حالات اور دلّی کے مدرسے میں داخلے کی روداد سے لے کر ملازمت کے واقعات بھی اس خودنوشت میں درج ہیں۔ اس کے آخر میں حالؔی نے اُردو ادب کو انگریزوں کے زیرِ اثر جدید طرز میں ڈھالنے کی کوششوں کا ذکر نہایت مؤثر انداز میں کیا ہے۔

جان پہچان

حالی کا اصل نام خواجہ الطاف حسین اور تخلص حالؔی تھا۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم پانی پت اور دلّی میں حاصل کی۔ اپنے علمی ذوق وشوق کی بدولت انھوں نے فارسی اور عربی میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔ حالؔی کے ادبی ذوق کی تربیت شیفتؔہ اور غالبؔ کی صحبتوں میں ہوئی۔ سرسیّد کے رفقا میں حالؔی اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے سرسیّد کے مشن کو پورے طور پر اپنا لیا تھا۔ اپنے طرزِ تحریر میں بھی انھوں نے سرسیّد کی پیروی کی۔

حالؔی کا شمار جدید اُردو شاعری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر اصلاحی نوعیت کی عمدہ نظمیں لکھیں۔ ان میں 'مدو جزرِ اسلام' کو بہت شہرت ملی۔ یہ نظم مسدسِ حالؔی کے نام سے بھی مشہور ہوئی۔ حالؔی نے نظمِ جدید کے ساتھ ساتھ غزل اور مختلف معاشرتی و اخلاقی مسائل پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے دیوان کا مقدمہ اُردو تنقید کی پہلی کتاب سمجھا جاتا ہے جو 'مقدمۂ شعر وشاعری' کے نام سے مشہور ہے۔ حالؔی کا انتقال ۳۱؍ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں ہوا۔

''میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ بہ مطابق ۱۸۳۷ء میں بہ مقام قصبہ پانی پت جو شاہجہاں آباد سے جانبِ شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے، واقع ہوئی۔ اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے، آباد چلی آتی ہے۔ میں باپ کی طرف سے شاخِ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی، جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا۔ میرے والد نے سنِ کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انھوں نے اوّل مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اگر چہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سیّد جعفر علی مرحوم جو مومنؔ دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے، ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہوگئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا۔ انھی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے؛ ان سے صرف ونحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بہ منزلۂ والدین سمجھتا تھا، تأہّل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بہ ظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلّی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے پڑھیں۔ اگر چہ اس وقت قدیم دلّی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں مَیں نے نشوونما پائی تھی، وہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا۔ دلّی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا، وہاں کے مدرّس اور طلبہ، کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس دلّی میں رہنا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزادؔ وغیرہ۔

میں نے دلّی میں شرحِ مسلم، مُلّا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلّی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلّی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بہ طور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہِ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عمل داری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا۔ قریب چار برس کے پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزرے۔

اضافی مطالعہ

شرحِ مسلم : ’صحیح مسلم‘ حدیث شریف کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے جس کی تالیف مسلم بن حجاج نیشاپوریؒ نے کی۔ اسے ’صحاحِ ستہ‘ میں صحیح بخاری کے بعد شمار کیا جاتا ہے۔ صحاحِ ستہ میں حدیث کے یہ مجموعے شامل ہیں : (۱) بخاری (۲) مسلم (۳) ترمذی (۴) نسائی (۵) ابو داوٗد (۶) ابنِ ماجہ۔ یہ تمام کتبِ احادیث دینی مدارس کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں۔ خصوصاً مسلم شریف کو درسِ نظامی میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ تدریس کی آسانی کے لیے محدثین نے ’صحیح مسلم‘ کی شرحیں لکھیں جن میں سے بعض آٹھ آٹھ، دس دس جلدوں پر مشتمل ہیں۔

جس زمانے میں میرا دلّی جانا ہوا تھا، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اُردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے، ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو

ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دِکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ''اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے۔'' مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسنِ اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ مرحوم، رئیسِ دلّی و تعلقہ دار جہانگیر آباد، فتح بلند شہر، سے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بہ طور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے، اس کی بہ نسبت اُن کا مذاقِ شاعری بہ مراتب بلندتر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن خاں مومنؔ کو دِکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالبؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہورہا تھا، تازہ ہوگیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اَب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اُٹھا۔ اسی زمانے میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھی کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالبؔ کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا، وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا، منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعے سے بہ خوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیسؔ کا ذکر ہورہا تھا۔ انھوں نے انیسؔ کے مرثیے کا یہ پہلا مصرعہ پڑھا:

آج شبّیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا، یہی ایک مصرعہ بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا۔

نواب شیفتہؔ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھ کو یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے، ان کی اُردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس تک میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی

اضافی مطالعہ

مُلّاحسن : یہ قاضی محبّ اللہ بہاری کی علم منطق پر لکھی ہوئی مشہور کتاب 'سُلّم' کی شرح ہے۔ اِس شرح کے مصنف مُلّا محمد حسن فرنگی محلّی ہیں جنھیں مُلّا حسن کے نام سے شہرت ملی اور اسی کی مناسبت سے 'سُلّم کی شرح 'مُلّاحسن' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یوں تو 'سُلّم' کی متعدد شرحیں لکھی گئیں لیکن ان میں جو طرزِ معقول اور نکتہ آفرینی مُلّاحسن میں ملتی ہے دوسری شرحیں اس سے خالی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ درسِ نظامی کے نصاب میں آج بھی اس کی اہمیت ہے اور اس پر بہت سارے علما نے حواشی لکھ کر اس کی اہمیت کو دو بالا کردیا۔ ملّا حسن فرنگی محلّی کا انتقال کان پور میں ۱۱۹۹ھ میں ہوا۔

میبذی : یہ منطق کی مشہور کتاب 'ہدایۃ الحکمت' کی شرح ہے جسے قاضی میر حسین عرف کمال الدین نے ۱۳۰۹ء میں قلم بند کیا تھا۔ اس میں ہدایۃ الحکمت کے متن کے منتخب اجزا کی آسان اور سلیس عربی میں شرح کی گئی ہے۔ 'ہدایۃ الحکمت' کی تدریس میں آسانی کے لیے میبذی درسِ نظامی میں شاملِ نصاب ہے۔

لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزآد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرعۂ طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں، ایک 'برسات' پر، دوسری 'اُمید' پر، تیسری 'رحم و انصاف' پر اور چوتھی 'حبِ وطن' پر لکھیں۔

اضافی مطالعہ

کرنل ڈبلیو۔ایم۔آر۔ ہالرائڈ: ایک انگریز افسر جو محکمۂ تعلیمات، پنجاب کے ناظم رہے اور جنھوں نے مختلف ذرائع سے پنجاب میں اُردو کی ترویج کے لیے انتھک کوشش کی۔ ۱۸۶۹ء میں ان کی کتاب 'رسومِ ہند' شائع ہوئی جس کی تحریر میں چند دیگر ہندوستانی اہلِ علم نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ہالرائڈ ناظمِ تعلیمات کی حیثیت سے ہر سال ایک رپورٹ شائع کیا کرتے تھے جس میں سالِ گزشتہ کی اُردو مطبوعات کی تعداد اور تفصیل ہوا کرتی تھی۔ ان رپورٹوں سے پنجاب میں اُردو زبان اور ادبیات کی رفتار پر روشنی پڑتی ہے۔ ہالرائڈ ۱۸۹۰ء میں محکمۂ تعلیمات کی نظامت سے سبکدوش ہوئے۔

اس کے بعد میں لاہور سے دلّی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرّسی پر بدل آیا۔ یہاں آ کر اوّل میں نے ایک آدھ نظم بہ طورِ خود اس طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی، لکھی۔ پھر سر سیّد احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ چنانچہ میں نے اوّل مسدس 'مد و جزرِ اسلام' اور اس کے بعد اور نظمیں جو بار بار شائع ہو چکی ہیں، لکھیں۔ نظم کے سوا نثرِ اُردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔

سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب 'تریاقِ مسموم' ایک نیٹیو کرسچین (جو میرا ہم وطن تھا) کی کتاب کے جواب میں لکھی تھی جس کو اسی زمانے کے لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی (علمِ طبقات الارض) میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اُردو میں ترجمہ کیا۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرایے میں موسوم بہ 'مجالس النساء' لکھی تھی جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بہ مقام دلّی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارسِ نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلّی میں سعدیؔ شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام 'حیاتِ سعدیؔ' ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ پھر شاعری پر ایک مبسوط ایسے (Essay) لکھ کر بہ طور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مرزا غالبؔ مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اُردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا ہے، 'یادگارِ غالبؔ' کے نام سے لکھ کر شائع کی اور اب سر سیّد احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ 'حیاتِ جاوید' جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے، لکھی ہے جو اُمید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو 'تہذیب الاخلاق'، 'علی گڑھ گزٹ' اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم، میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان سے کم ہونے لگا ہے، اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپریس وکٹوریہ

کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۰۵ھ میں جب میں اینگلو عربک اسکول دلّی میں مدرّس تھا، نواب سر آسماں جاہ بہادر مرحوم، مدار المہامِ سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظے کے لیے سر سیّد احمد خاں کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بہ صیغۂ امدادِ مصنّفین ایک وظیفہ، تعدادی ۷۵ روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جبکہ میں سر سیّد مرحوم کے ہمراہ بہ شمول دیگر ممبران ڈپوٹیشن ٹرسٹیانِ محمڈن کالج علی گڑھ، حیدر آباد گیا تھا، اس وظیفے میں ۲۵ روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکۂ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اَب تک مجھ کو ماہ بہ ماہ سرکارِ عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

اضافی مطالعہ

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج: محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سر سیّد نے قائم کیا۔ یہ کالج ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے موقع پر ابتداءً پرائمری اسکول کے طور پر ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو قائم ہوا۔ اس وقت اس کا نام 'مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند' رکھا گیا۔ بعد میں اس نام کو تبدیل کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج رکھ دیا گیا جہاں مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہترین نظم تھا۔ سائنس اور انگریزی کی تعلیم کے اس مرکز نے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لائی۔ سر سیّد چاہتے تھے کہ یہ کالج ترقی کرتے ہوئے یونیورسٹی میں تبدیل ہو جائے۔ اس دور کے متموّل حضرات نے ان کی بہت مدد کی۔ ۱۹۱۸ء میں حیدر آباد دکن کے نواب میر عثمان علی خان نے اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کے لیے پانچ لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ یہ کالج ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا اور آج اسے 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے۔

معانی و اشارات

علاقہ رکھنا – تعلق رکھنا
دماغ مختل ہونا – پاگل پن کا اثر ہونا
سِن کہولت – بڑھاپے کی عمر، ادھیڑ عمر
تاَہُّل – نکاح
جوا – بیل گاڑی میں جو آڑا ڈنڈا بیل کی گردن پر ہوتا ہے، مراد ذمے داری
سپاہِ باغی – ۱۸۵۷ء میں بغاوت کرنے والے ہندوستانی سپاہی
بہ مراتب – مرتبے کے مطابق
طبعی میلان – طبیعت کا جھکاؤ
مکروہات – مکروہ کی جمع، کراہیت پیدا کرنے والی چیزیں
منتہائے کمال – خوبی کی انتہا
عامیانہ – بازاری، گھٹیا

ایما – اشارہ
مصرعۂ طرح – وہ مصرعہ جو بحر، ردیف اور قافیہ بتانے کے لیے نمونے کے طور پر دیا جائے
نیٹیو کرسچین – مقامی عیسائی
موسوم بہ – نام سے
مدارسِ نسواں – لڑکیوں کے مدرسے
ریویو (review) – تبصرہ
مبسوط – بہت لمبا چوڑا، مراد بڑا
لائف – زندگی، سوانح
گریمر – صرف و نحو، قواعد
چنداں – بالکل، اس قدر
ہنوز – اب تک
ایمپریس (empress) – مَلِکہ

مدار المہام ِسرکار عالی نظام { نظامِ دکن کی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے دار

اثنائے سفر - سفر کے دوران

ملاحظہ - دیکھنا، معائنہ

فروکش ہونا - قیام کرنا

صیغۂ امدادِ مصنّفین - مصنفوں کی مدد کا محکمہ

سکۂ حالی - جاری سکہ

مشتق سرگرمیاں

* شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

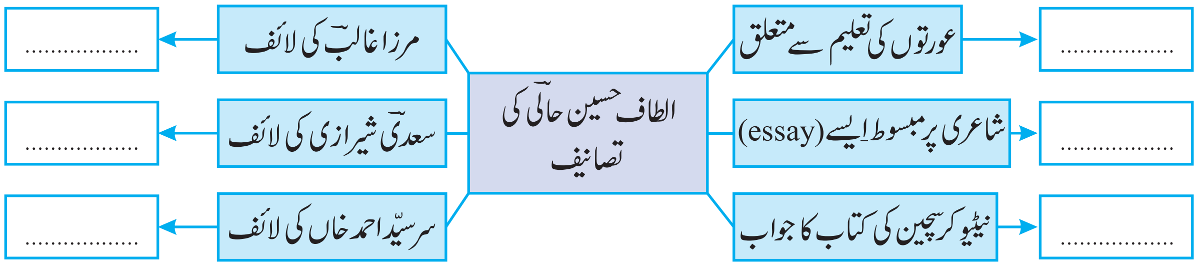

* شجری خاکہ مکمل کیجیے۔

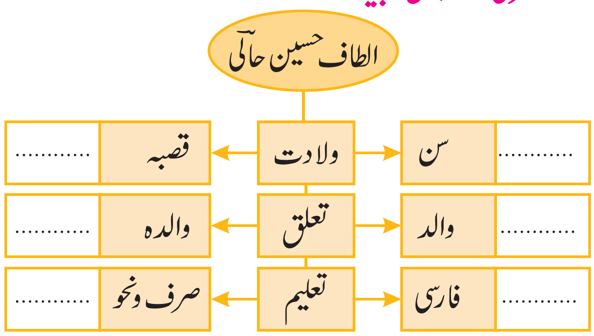

* خاکہ مکمل کیجیے۔

* خاکہ مکمل کیجیے۔

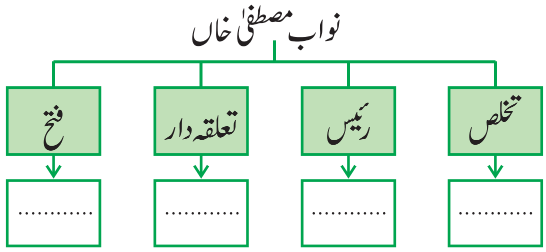

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ الطاف حسین حالؔی کی زندگی کے حالات کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ الطاف حسین حالؔی کی تعلیم میں دلچسپی اور اس بارے میں ان کی کوششوں کو بیان کیجیے۔

۳۔ الطاف حسین حالؔی اور غالبؔ کے تعلقات کے بارے میں معلومات تحریر کیجیے۔

۴۔ نواب شیفتؔہ کی صحبت میں رہنے سے حالؔی کی فکر اور طبیعت میں ہونے والی تبدیلی کو بیان کیجیے۔

۵۔ الطاف حسین حالؔی کی تلاشِ معاش اور ملازمت سے متعلق معلومات لکھیے۔

۶۔ الطاف حسین حالؔی کی کتابوں اور مضامین سے متعلق تفصیلات اپنے جملوں میں لکھیے۔

* ہدایات کے مطابق قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ جب بغاوت کا فتنہ برپا ہوا۔

(جملے کو 'طورِ مجہول' میں تبدیل کیجیے)

۲۔ وہ مبالغے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

(جملے کو لفظ 'متنفر' استعمال کرتے ہوئے دوبارہ لکھیے)

۳۔ فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔

(مفہوم بدلے بغیر منفی جملے میں تبدیل کیجیے)

۴۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے کو منع کیا کرتے تھے۔

(جملے کی قسم بتا کر اس کا نحوی تجزیہ کیجیے)

* ہدایات کے مطابق درج ذیل تحریری مہارت کی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ ''اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے۔'' غالبؔ کے اس بیان سے متعلق اپنی رائے لکھیے۔

۲۔ ''وہ حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔'' اس بیان کی روشنی میں شاعری سے متعلق اپنے خیالات تحریر کیجیے۔

۳۔ الطاف حسین حالیؔ کی تعلیم اور ملازمت سے متعلق رواں خاکہ بنائیے۔

سرگرمی / منصوبہ

۱۔ الطاف حسین حالیؔ کی نظم 'مد و جزرِ اسلام' کے کچھ بند پڑھیے اور نقل کیجیے۔

۲۔ طرحی مشاعرے سے متعلق معلومات لکھیے اور ایک طرحی مصرعہ لے کر مختلف شعرا کے کلام پر مبنی کتابچہ تیار کیجیے۔

۳۔ انٹرنیٹ سے حاصل کرکے الطاف حسین حالیؔ کی کتاب 'مجالس النسا' کا مطالعہ کیجیے اور اس کتاب پر اپنی رائے لکھیے۔

چند انگریزی کہاوتیں اور ان کا اُردو مفہوم

★ All that glitters is not gold.	ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔
★ Tit for tat.	جیسے کو تیسا۔
★ Empty vessel makes much noise.	تھوتھا چنا باجے گھنا۔
★ As you sow, so shall you reap.	جیسا بوؤگے ویسا کاٹوگے۔
★ Necessity is the mother of invention.	ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔
★ Where there is a will there is a way.	جہاں چاہ وہاں راہ۔
★ Might is right.	جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔
★ Out of sight, out of mind.	آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔
★ Money makes the mare go.	پیسا پھینک تماشا دیکھ۔
★ A drowning man will clutch at a straw.	ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

۳ فردوسِ بریں

عبدالحلیم شرؔر

پیش درس

اُردو میں ناول نگاری کی ابتدا اُنیسویں صدی میں ہوئی۔ سرسیّد کے رفقا میں سے ڈپٹی نذیر احمد نے چند ناول لکھے جن میں 'مرأۃ العروس، ابن الوقت، توبۃ النصوح، بنات النّعش' وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یہ تمام ناول ہماری تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی زمانے میں عبدالحلیم شرؔر نے بھی ناول لکھے جو تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ بیسویں صدی سے اُردو میں ناول نگاری کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ پریم چند کا 'گئودان'، مرزا ہادی رسؔوا کا 'امراؤ جان ادؔا'، قرۃ العین حیدر کا 'آگ کا دریا'، عبداللہ حسین کا 'اُداس نسلیں' وغیرہ کامیاب ناولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

'فردوسِ بریں' حسن بن صباح (متوفی ۱۱۲۴ء) کی نیم مذہبی اور نیم فوجی تنظیم کا قصہ ہے۔ یہ تنظیم اس نے اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے لیے ۱۰۹۰ء میں ایران میں قائم کی تھی۔ اس تنظیم کا صدر مقام لبنان کے ایک پہاڑ پر موجود قلعہ الموت کو بنایا گیا تھا۔ حسن بن صباح اس تنظیم کا سربراہ تھا اور شیخ الجبال کے نام سے مشہور تھا۔ اس تنظیم میں اس نے سیکڑوں نوجوانوں کو شامل کیا تھا۔ وہ انھیں اس پہاڑ پر بنائی گئی مصنوعی جنت میں لطف اٹھانے کے لیے چند دن رکھتا پھر واپس روانہ کر دیتا تاکہ اس جنت میں داخل ہونے کے لیے وہ جان پر کھیل جانے کے لیے بھی تیار رہیں۔ یہ نوجوان 'شیخ الجبال' کے ہر حکم کو بلا خوف و خطر مان لیتے۔ حسن بن صباح نے ان نوجوانوں کے ذریعے اسلامی اور عیسائی حکومتوں کے کئی اہم لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

اس سبق میں حسن بن صباح کی اسی جنت کے چند مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ عبدالحلیم شرؔر لکھنؤ کی ادبی فضا میں پروان چڑھے تھے اس لیے زبان کا چٹخارا ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ فردوسِ بریں کی جو منظر کشی انھوں نے اس سبق میں کی ہے، اسے پڑھتے ہوئے حسین و دلکش باغوں کی تصویریں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ جملوں کی بندش اور الفاظ کے در و بست سے پیدا ہونے والا زبان و ادب کا حسن شرؔر کے یہاں ہر سطر میں پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں تراکیبِ لفظی میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ ان کی زبان نہایت صاف اور رواں ہے۔ انھوں نے ناول کے کرداروں کے احساسات و جذبات کو بھی بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

جان پہچان

عبدالحلیم شرؔر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں وہ کلکتہ چلے گئے۔ کلکتے میں انھوں نے مختلف اساتذہ سے عربی، فارسی، منطق، طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں انھوں نے انگریزی سیکھی اور فقہ اور حدیث کا علم بھی حاصل کیا۔ شرؔر کو بچپن ہی سے مضمون نویسی کا شوق تھا۔ ۱۸۸۰ء سے انھوں نے لکھنؤ سے رسالہ 'دلگداز' جاری کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشؔار کے ساتھ شرؔر نے تاریخی اور معاشرتی ناول لکھ کر اُردو میں اس صنف کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا اور اُردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ شرؔر اُردو کے اوّلین ناول نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو ناول کو فکر و فن کی نئی قدروں سے روشناس کرایا۔ ان کے مشہور تاریخی ناولوں میں 'زوالِ بغداد، ایامِ عرب، فردوسِ بریں، منصور و موہنا' اور 'فلورا فلورنڈا' قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں انھوں نے انگلستان کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد ۱۸۹۸ء میں 'دلگداز' کو دوبارہ حیدر آباد سے جاری کیا۔ آزاد نظم اور معریٰ نظم کو ترقی دینے میں بھی شرؔر کا خاص حصہ رہا ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔

حسین کو خبر نہیں تھی کہ یہ غفلت کتنی دیر تک اس پر طاری رہی لیکن مدہوشی تھوڑی کم ہوئی تھی کہ ایک نہایت ہی دلکش اور وجد آور نغمے کی آواز کان میں آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا دل رُبا پری پیکروں کا ایک طائفہ پر لطف باجوں اور مزامیر کے ساتھ مسرت انگیز دھن میں ترانۂ مبارکباد گا رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ حسین نے اس وقت اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ ایک طلاکار اور مرصع کشتی میں سوار ہے اور لڑکوں کی کوشش سے وہ کشتی ایک پتلی مگر بہت ہی دلکش نہر کے کنارے ابھی ابھی آ کے ٹھہری ہے۔ نرم اور نظر فریب سبزے کو شفاف اور پاک وصاف پانی اپنی روانی میں چومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ بعض مقامات پر گنجان اور سایہ دار درخت ہیں جو پیچیدہ اور خم دار زلفوں کی طرح نہر کی گوری مگر نم آلود پیشانی پر دونوں طرف سے جھکے پڑتے ہیں۔ جہاں سے کشتی آ کر کنارے لگی ہے، وہاں ایک کشادہ مرغزار ہے۔ ان خوب صورت ملاحوں کے کہنے کے بہ موجب وہ کشتی سے اُتر کر سبزۂ روئیدہ کی سیر کرنے لگا۔ وہاں جا کر دیکھا تو اور حیرت ہوئی۔ پانی کے پاس ہی سبزے کا ایک پتلا اور برابر حاشیہ چھوڑ کر شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو نہر کے دونوں طرف حدِ نظر تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ اگرچہ پھولوں میں شادابی و خوش رنگی کی وہی شان ہے جو صرف خود رو پھولوں میں نظر آتی ہے مگر اس قدرتی بہار کے ساتھ یہ لطف بھی ہے کہ نہایت ہی لیاقت سے چمن بندی کی گئی ہے۔ چمنوں کی بعض قطاریں تو ایسی ہیں جن میں ایک ہی قسم اور ایک ہی رنگ کے پھول ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی قوم اور ایک ہی وردی کی فوج حدِ نظر تک چلی گئی ہے۔

مختلف نہریں جو آبشاروں کی شان سے اور پانی کی چادریں بن بن کر پہاڑوں سے اُتری ہیں، ان کے پانی نے خواہ پھولوں کی خوشبو سے متاثر ہو کر یا کسی اور وجہ سے گلاب اور کیوڑے کی شان پیدا کر لی ہے۔ یہ نہریں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہم ہی تسنیم و سلسبیل ہیں۔ راستوں اور رَوِشوں کی ترتیب میں یہ معجز نما کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ ہر چمن کے ایک پہلو کو نہر دھوتی ہے تو اس کے دوسرے پہلو کو ایک چھوٹی سی خوشنما سڑک اپنے آغوش میں لیتی ہے۔

حسین نے نہایت حیرت و جوش سے دیکھا کہ ان چمنوں میں جا بجا نہروں کے کنارے سونے چاندی کے تخت بچھے ہیں جن پر ریشمی پھول دار کپڑوں کا فرش ہے۔ لوگ پُر تکلّف گاؤ تکیوں سے پیٹھ لگائے بیٹھے ہیں اور جنت کی بے فکریوں سے لطف اُٹھا رہے ہیں۔ لڑکے کہیں تو سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور سدھائے یا قدرت کے سکھائے ہوئے طیور پھل دار درختوں سے میوے توڑ توڑ کر لاتے ہیں اور ان کے سامنے رکھ کر اُڑ جاتے ہیں۔

یہ عالم دیکھ کر حسین کے دل میں ایک جوش و ولولہ پیدا ہوا۔ اس نے کسی قدر بلند آواز سے کہا، ''بے شک فردوسِ بریں یہی ہے، یہی ہے! یہیں آ کے نیکوکاروں اور ایمان داروں کو اپنے اعمالِ نیک کا صلہ ملتا ہے۔ مگر افسوس، اے زَمَرُّد تو کہاں؟'' یہ جملہ ناتمام ہی تھا کہ پاس کے چمن کے پھولوں کے نیچے سے ایک شیرین و دلکش آواز نے کہا، ''تو ابھی جنت کے چمنوں ہی کو دیکھ رہا ہے۔ ذرا محلوں اور قصروں کو بھی نظر اُٹھا کر دیکھ۔''

حسین نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ اسے نظر آیا کہ یہ عمارتیں باغوں سے بھی زیادہ مسرت انگیز ہیں۔ بعض بالکل سونے کی، بعض مونگے کی اور بعض موتیوں کی نظر آتی ہیں۔ یہ تمام مکانات جو حسبِ حیثیت محل اور قصر کے لفظ سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں، انھی میں کوئی فیروزے کا، کوئی زمرد کا، کوئی یاقوت کا اور کوئی ہیرے کا ہے۔ موتی کے محل جن میں سے ایک خاص حسین کے لیے ہے، ایسے آب دار

رنگ میں رنگے ہوئے ہیں کہ نیچے سے اوپر تک ایک ہی موتی میں ترشے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ حسین ان محلوں کو دیکھ کر ذرا دیر مبہوت کھڑا رہا۔ مگر ہوش آتے ہی اس خاص محل کی طرف بڑھا جس کی نسبت اس نے سنا تھا کہ خاص اس کے لیے ہے اور جس میں زمرد کے ملنے کی اسے اُمید تھی۔ اب اس کے جذباتِ دلی اس جوش وخروش سے زمرد کی طرف متوجہ تھے کہ اس نے نہ کسی چیز کی طرف نظر اُٹھائی نہ کسی سامانِ عشرت کو دیکھا اور سیدھا اس محل کے دروازے پر جا پہنچا۔ زمرد بھی استقبال کے لیے محل سے باہر نکل آئی تھی اور ایک غیر معمولی مگر نہایت دِل رُبا وضع سے کھڑی تھی۔ آنکھیں دو چار ہوئی تھیں کہ بے اختیاری کے جوش میں دونوں کی زبان سے ایک دوسرے کا نام نکلا۔ حسین تو محوِ حیرت تھا ہی، زمرد کے چہرے سے بھی ایک غیر معمولی جوش ومسرت نمایاں تھی۔ حسین فرطِ محبت سے بے اختیار ہو کے رونے لگا۔ اس کی سانس سے رونے کا پتا پا کے زمرد نے کہا،''حسین! یہاں رونا حرام ہے، پس اب آنسو پونچھ ڈالو۔''

حسین: (آنسوؤں کو پونچھ کر) زمرد! یہی فردوسِ بریں ہے؟

زمرد: یہی۔

حسین: تم یہاں چلی آئیں اور مجھے اس درد والم میں چھوڑ دیا۔

زمرد: یہ تو میرے اختیار کی بات نہ تھی۔ مجھے تو ایک اتفاقی شہادت نے یہاں پہنچایا ہے مگر تمھاری زندگی باقی تھی اور ضروری تھا کہ اتنے مدارج ومراحل طے کر کے یہاں آؤ۔ کیا کہوں، کن دشواریوں سے مجھے اتنی اجازت ملی ہے کہ تمھیں اپنے پاس آنے کا راستہ اور طریقہ بتاؤں۔

حسین: میرے تو ایسے اعمال تھے کہ شاید مر کے بھی یہاں نہ پہنچ سکتا، صرف تمھاری محبت تھی جو خضرِ طریقت بن کر لائی۔

زمرد: لیکن اگر تمھارے دل میں طلبِ صادق نہ ہوتی تو میں کیا کر سکتی تھی۔

حسین: مگر میں تو دل میں ٹھان چکا تھا کہ اس قبر کے پاس اور اس چٹان کے سامنے جس پر تمھارا پیارا نام کندہ ہے، پڑے پڑے دم توڑ دوں گا۔

زمرد: خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اب اندر چل کے آرام سے بیٹھو اور دیکھو کہ خداوندِ جَلَّ وعَلا نے تمھارے لیے کیسے کیسے سامانِ راحت اور کیسی کیسی لذتیں فراہم کر رکھی ہیں۔

حسین نے مکان کے فرش اور تمام سامان کو دیکھا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب نوری سامان ہے جو دنیا میں نہ کبھی انسان کے دل میں گزرا نہ ہی کسی کے قیاس وگمان میں آ سکتا ہے۔ زمرد یہاں کی تمام عجوبہ چیزیں اسے دِکھاتی پھرتی تھی۔

حسین کو جنت کے حسن و جمال سے لطف اُٹھاتے پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور یہ ہفتہ اس حالت میں گزرا کہ دلکش اور نشاط انگیز نغموں کی آواز اکثر کانوں میں گونجتی رہتی اور بہت سی حوریں اس کی خدمت کو حاضر رہتیں۔ وہ دونوں ہمیشہ ان فرحت بخش وادیوں اور روح افزا مرغزاروں میں ٹہلتے رہتے۔ زمرد نے اتنے زمانے میں پھر پھر کر اسے یہاں کی تمام نزہت گاہیں اور سب دلچسپ مکانات دِکھا دیے۔ ایک مرتبہ حسین نے کہا،''زمرد! میں تو سنتا تھا کہ جنت میں ہمیشہ صبح کا وقت ہے مگر آ کے دیکھا تو یہاں بھی دنیا ہی کے سے تغیرات موجود ہیں۔''

زمرد : اس امر میں لوگوں کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ جو کہا جاتا ہے کہ ہر وقت صبح ہی رہتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور کسی وقت کا لطف انسان یہاں اُٹھا سکتا ہی نہیں۔ ایسا ہو تو جنت سے ایک بڑا لطف اُٹھ جائے۔ اصل مطلب یہ ہے کہ یہاں ہر وقت کوئی ایسا مقام ضرور مل جائے گا، جہاں انسان جس وقت کا چاہے لطف اُٹھائے۔

حسین : کیونکر؟

زمرد : زبان سے کہنے کی بات نہیں۔ میں چل کر تمھیں آنکھوں سے دِکھائے دیتی ہوں۔ یہ کہہ کر اسے ساتھ لیے ہوئے زمرد قصرِ دری سے باہر نکلی اور کہا، ''دیکھو، یہاں دوپہر کا سماں ہے۔ اب آگے چلو۔'' تھوڑی دیر کے بعد دونوں درختوں سے گھرے ہوئے ایک ایسے سبزہ زار میں پہنچے جہاں آفتاب کی روشنی کو درخت روکے ہوئے تھے۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور مشرقی قلعہ ہائے کوہ سے ہلکی ہلکی روشنی نمودار تھی۔ زمرد یہاں پہنچ کر بولی، ''دیکھو، یہ صبح کا وقت ہے۔''

حسین : بے شک ہے۔

یہاں سے روانہ ہو کے تھوڑی دیر میں دونوں ایک ایسی چھوٹی سی وادی میں پہنچے جو ہر طرف سے پہاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں بھی درختوں نے خفیف سی تاریکی پیدا کر دی تھی اور ذرا فاصلے کے مقامات پر ہلکا دھواں اُٹھتا نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں چراغ جلنے لگے تھے۔ طیور کے چہچہانے کا شور بلند تھا اور مغرب کے قلعے پر آفتاب کے غروب ہونے کی بھی شعاعیں نظر آ رہی تھیں۔ زمرد نے یہاں رُک کے کہا، ''اور یہ شام ہوئی۔''

حسین : اس میں کسے شک ہو سکتا ہے۔

زمرد : دن کا سماں دیکھ چکے اور شام بھی دیکھ لی۔ صرف رات کا وقت باقی ہے۔ چلو، وہ بھی دِکھائے دیتی ہوں۔

یہاں سے واپس آ کر زمرد حسین کو لیے ہوئے ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہوئی جہاں نہایت خوبی سے ایک نشیبی راستہ بنا ہوا تھا۔ اس زمین دوز راستے میں جاتے جاتے دونوں ایک نہایت عالیشان اور پر تکلف حصے میں پہنچے جس میں ہر جگہ کافوری شمعیں روشن تھیں، جھاڑ اور فانوس کثرت سے لٹک رہے تھے اور در و دیوار پر شیشے کے رنگ برنگ ٹکڑوں کو ان شمعوں کی شاخیں کچھ ایسی عجیب و غریب روشنی سے چمکا رہی تھیں کہ نظر خیرہ ہو جاتی تھی۔

یہ سب سامان دیکھ کر دونوں اپنے قصر میں واپس آئے اور باتیں کرنے لگے مگر پہلے سے زمرد اب کسی قدر افسردہ تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گو وہ زبردستی کوشش کر کے چہرے کو بشاش بناتی ہے مگر دل اندر سے بیٹھا جاتا ہے۔ حسین نے اس امر کو حیرت سے دیکھا اور کہا، ''زمرد! اس فردوسِ بریں میں بھی آج تم مجھے ملول نظر آتی ہو۔''

زمرد : نہیں، مگر ہاں گزشتہ مفارقت کسی کسی وقت یاد آ جاتی ہے تو خواہ مخواہ دل بھر آتا ہے۔

حسین : مگر خدا نے وہ مصیبت کاٹ دی اور اب اُمید ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔

زمرد : خدا کرے ایسا ہو مگر حسین مجھے اس کی امید نہیں۔

حسین : (حیرت سے) اُمید نہیں! یہ جنت ہے جس کے لطف سرمدی و ابدی ہیں۔ یہاں نہ کسی دشمن کا اندیشہ ہو سکتا ہے نہ کسی حاسد کا حسد۔ پھر نا اُمیدی و حسرت نصیبی کا کیا سبب؟

زمرد: مگر حسین تم یہاں قبل از وقت آئے ہو اور ابدی و سرمدی لطف اُٹھانے کے لیے وہی لوگ آتے ہیں جو مرنے کے بعد دنیا سے قطع تعلق کر کے آئیں گے۔ تم نے ابھی اس مادّی دنیا کے علائق قطع نہیں کیے اور اس مادّی جسم کو ساتھ لائے ہو جس کو وہیں دنیا میں چھوڑنے کے لیے تمھیں ایک روز اس عالم میں جانا ضرور ہے۔

حسین: افسوس! پھر کب جاؤں گا؟

زمرد: جب حکم ہو جائے مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی جانا پڑے گا اس لیے کہ وہاں کی کئی شدید ضرورتیں تمھیں بلا رہی ہیں۔ حسین یہ سن کر آب دیدہ ہو گیا اور نہایت جوشِ دل سے ایک آہِ سرد بھر کر بولا، ''مگر زمرد! مجھ سے تو اَب نہ جایا جائے گا۔''

یہ سن کر زمرد بھی آب دیدہ ہوگئی اور بولی، ''حسین! یہ امر تمھارے اختیار سے باہر ہے۔ جب وقت آئے گا تمھیں خبر بھی نہ ہوگی اور ایک ادنیٰ غنودگی تمھیں عالم میں پہنچا دے گی۔''

حسین: (روکر) پھر اب تو مجھ سے تمھارے فراق کی مصیبت نہ برداشت کی جائے گی۔ جاتے ہی اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوں گا اور تم سے چھوٹے ایک گھڑی بھی نہ گزری ہوگی کہ پھر تمھارے پاس آ پہنچوں گا۔

زمرد: کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ خودکشی کر لی تو جنت تم پر حرام ہو جائے گی۔ پھر تو قیامت تک بھی ملنے کی اُمید نہیں۔

حسین: (زور سے سینے پر ہاتھ دھر کر) ہائے! مجھ سے کیونکر زندہ رہا جائے گا۔ اب دنیا میں جا کر مَیں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اچھا، اگر یہ نہیں تو تم میرے ساتھ چلو۔

زمرد: یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ حسین! یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے بس میں ہوں۔ اتنا ہی لفظ زبان سے نکلا تھا کہ کانپنے لگی اور اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ مگر جب کوئی نظر نہ آیا تو اطمینان سے آ کر بیٹھ گئی اور بولی، ''حسین! اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمھارے واپس جانے کا وقت آ گیا۔''

حسین: (بے صبری سے چلا کر) کیا! ابھی سے! نہیں، میں ابھی نہ جاؤں گا۔

زمرد: ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جتنی زیادہ بے صبری دِکھاؤ گے اتنی ہی زیادہ خرابی ہوگی۔ اس وقت باتیں کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ غنیمت سمجھو اور جو کچھ کہتی ہوں سنو۔ کوئی آ گیا تو یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا، عمر بھر کفِ افسوس ملو گے۔ ساری دنیا میں بھٹکتے پھرو گے اور مطلب نہ نکلے گا۔

حسین: (اپنے آپ کو سنبھال کر) اچھا، سنتا ہوں۔ تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ تو کام چلے۔

زمرد: یہاں سے جانے کے بعد پہلے تم کوشش کرنا کہ وہی لوگ جن کی مدد سے اس دفعہ یہاں آئے، انھی لوگوں کی اطاعت کر کے انھیں خوش کر کے پھر یہاں آنے کا موقع پاؤ۔ اپنی حاجت روائی کے لیے تم ان کے کسی حکم سے انحراف نہ کرنا لیکن اگر وہ تمھیں یہاں دوبارہ بھیجنے کا وعدہ نہ کریں اور سب طرف سے مایوس ہو جاؤ تو پھر اسی وادی میں آ کر ٹھہر جانا جہاں میری قبر ہے اور جہاں خط بھیج کر میں نے تمھیں یہاں آنے کی تدبیر بتلائی تھی۔

حسین: مگر زمرد، وہ تدبیر اسی وقت نہ بتا دو کہ یہاں سے جاتے ہی اس پر عمل درآمد شروع کر دوں؟

زمرد: افسوس، تم نہیں سمجھ سکتے۔ بس تمھیں وہی کرنا چاہیے جو میں بتاتی ہوں۔ وہ تدبیر اس وقت بتانے کی نہیں۔

حسین: دیکھوں، اب کتنے دنوں ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

زمرد: صبر کرو اور ضبط سے کام لو اور خبردار! ایسی کمزوری اور بزدلی نہ دکھانا۔

حسین: میں اسی سے ڈرتا ہوں، بعض وقت نہ میں اپنے ہوش میں ہوتا ہوں اور نہ نیک و بد سمجھتا ہوں۔ یہ تمھارے لیے ہی تھا کہ میں نے اپنے چچا اور شیخِ وقت امام نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر ڈالا۔

ناگہاں چھے سات حوریں ناز و انداز سے قدم رکھتی ہوئی سامنے آئیں اور محبت کے لہجے میں حسین سے کہنے لگیں، ''اب چل کر باہر کی سیر کیجیے اور ان نورانی تختوں پر جلوہ افروز ہو جیے جو چمنوں کے درمیان ہیں۔ اس وقت کی بہار دیکھنے کے قابل ہے۔ شرابِ طہور کے جاموں میں خاص مزا ہے۔''

اتنی دیر میں اور سب حوریں بھی آ گئیں اور زمرد حسین کو ساتھ لیے قصرِ زمردی کے باہر نکلیں۔ سب کے سب لالہ زار کے درمیان میں طلائی تختوں پر جا کر بیٹھے۔ تخت کے دونوں جانب دو حوض تھے اور بغیر کہے صرف واقعات سے یقین دلایا جاتا تھا کہ ایک حوضِ کوثر ہے اور دوسرا شرابِ طہور کا حوض ہے۔ سامنے چند حوریں بیٹھ کر عجیب دلربا اور وجد میں آنے والی دھن میں گانے لگیں۔ دو چار غلمان سونے کے جام و صراحی لا کر کھڑے ہو گئے اور نغمہ و سرود کے ساتھ دَور بھی چلنے لگا۔ دو چار جاموں نے حسین پر از خودرفتگی کی کیفیت پیدا کر دی اور جب وہ اس عالمِ نور کو بے خودی کی نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، اس لطفِ صحبت کا دل ہی دل میں مزا اُٹھا کر جام کو پی گیا مگر پینے کے بعد معلوم ہوا کہ جیسے زمرد کی آنکھوں سے موتیوں کی طرح آنسو ٹپک رہے تھے۔ بے خودی کے جوش میں وہ دِل رُبا کی دِل دہی کے لیے بڑھنے ہی کو تھا کہ مدہوش ہو کر گر پڑا۔ بس اس کے بعد اسے اپنے پرائے کی خبر نہ تھی۔

معانی و اشارات

وجد آور	-	مستی و بے خودی لانے والا
مزامیر	-	مزمار کی جمع، آلاتِ موسیقی
طلا کار	-	سنہرے نقش و نگار والا
روئیدہ	-	اُگے ہوئے
تسنیم و سلسبیل	-	جنت کی نہریں
آب دار	-	چمک دار
مبہوت	-	ہیبت زدہ، حیرت زدہ
مدارج و مراحل	-	درجہ اور مرحلہ کی جمع
خضرِ طریقت	-	طریقت کی راہ سمجھانے والا مراد صحیح رہنمائی کرنے والا
جل و علا	-	جلال اور اونچے مرتبے والا مراد اللہ تعالیٰ
نزہت گاہ	-	پاکیزہ مقام
قصرِ دری	-	دروازوں والا محل
نظر خیرہ ہونا	-	نگاہ بھر کر نہ دیکھ پانا
سرمدی و ابدی	-	لافانی
علائق	-	علاقہ کی جمع مراد تعلقات
شرابِ طہور	-	پاکیزہ شربت
نغمہ و سرود	-	گیت اور موسیقی
از خودرفتگی	-	بے خودی
دِل دہی کرنا	-	تسلی دینا

مشقی سرگرمیاں

* مدہوشی کم ہونے کے بعد حسین کے احساسات کا رواں خاکہ مکمل کیجیے۔

* سبق میں جنت کے مکانات سے متعلق جن قیمتی پتھروں اور دھاتوں کی تشبیہات استعمال کی گئی ہیں، ان کے نام لکھ کر شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

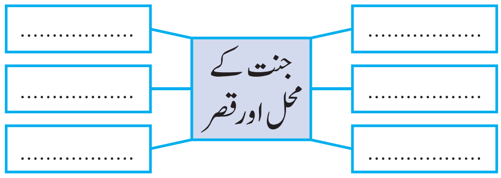

* سبق میں مصنوعی جنت کے اُن مناظر کو بیان کیجیے جہاں انسان دیے گئے وقت کا لطف اُٹھائے۔

(الف) صبح کا وقت ⟵ ....

(ب) دوپہر کا وقت ⟵ ....

(ج) شام کا وقت ⟵ ....

(د) رات کا وقت ⟵ ....

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ سبزۂ روئیدہ کی چمن بندی کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۲۔ فردوسِ بریں کی نہروں اور چشموں کا حال بیان کیجیے۔

۳۔ حسین کے مکمل طور پر ہوش میں آنے کے بعد ایک طرف تیزی سے بڑھنے کی وجہ بیان کیجیے۔

۴۔ ''حسین! یہاں رونا حرام ہے۔'' اس جملے کو سیاق وسباق کے حوالے سے واضح کیجیے۔

۵۔ ''یہاں بھی دنیا ہی کے سے تغیرات موجود ہیں۔'' حسین کے اس تبصرے کے جواب میں زمرد کی وضاحت کو تحریر کیجیے۔

۶۔ حسین کے جنت سے نکالے جانے کی وجہ تحریر کیجیے۔

۷۔ ''پھر تو قیامت تک ملنے کی اُمید نہیں۔'' متن کے حوالے سے اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

۸۔ زمرد نے حسین کو مخصوص لوگوں کی اطاعت کا مشورہ دیا، اس کی وجہ بیان کیجیے۔

۹۔ وہ جملے لکھیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمرد جنت میں ڈری سہمی اور ملول ہے۔

* ہدایات کے مطابق قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ حسین کو خبر نہیں تھی کہ یہ غفلت کتنی دیر تک اس پر طاری رہی۔

(جملے کو مثبت جملے میں اس طرح تبدیل کیجیے کہ مفہوم تبدیل نہ ہو)

۲۔ واوعطف والی تراکیب کی فہرست تیار کیجیے۔

۳۔ صبر کرو اور ضبط سے کام لو۔ (جملے کی قسم کا نام لکھ کر اس کی نحوی تحویل کیجیے)

سرگرمی / منصوبہ

۱۔ ناول 'فردوسِ بریں' حاصل کر کے پڑھیے اور امام نجم الدین نیشاپوری کے تعلق سے تفصیلات تحریر کیجیے۔

۲۔ تاریخی ناولوں اور ان کے مصنفوں کے ناموں کی فہرست بنائیے اور کسی پسندیدہ ناول پر تجزیہ اپنے الفاظ میں کیجیے۔

نکات : ناول کا نام، مصنف، ناشر/ پبلشر، ناول کے کردار، ناول کی منظرنگاری پر آپ کی پسندیدگی کی وجہ تفصیل سے لکھیے۔

۴

اوورکوٹ

غلام عبّاس

پیش درس

ہمارے آس پاس طرح طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان میں غریب بھی ہوتے ہیں اور امیر بھی۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو زندگی کی نعمتوں سے محروم ہیں لیکن دوسرے خوش حال لوگوں کو دیکھ کر حالات سے سمجھوتہ اور صبر کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو انوکھے طریقے اپنا کر زندگی گزارتے ہیں۔ زیرِ نظر افسانے میں ایک ایسا ہی کردار پیش کیا گیا ہے جو اپنی غربت اور محرومیوں کے باوجود خود کو سماج میں آسودہ حال اور بے فکر بنا کر پیش کرتا ہے۔

مصنف نے اس افسانے کے ذریعے اُن لوگوں پر گہرا طنز کیا ہے جو ظاہری شان و شوکت کے دلدادہ ہوتے ہیں اور اپنی حیثیت کو بھول کر امیروں کی نقالی کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے سماج میں انھیں عارضی طور پر عزت تو مل جاتی ہے مگر آخر میں ندامت اور ذلت ہی اُن کے ہاتھ آتی ہے۔ اوورکوٹ فیشن اور ظاہر پرستی کی علامت بن کر اُبھرتا ہے۔

جان پہچان

غلام عباس ۱۷ر نومبر ۱۹۰۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم لاہور کے دیال سنگھ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ وہ محکمۂ تعلیمات سے منسلک تھے۔ پھر ۱۹۴۹ء میں بی بی سی لندن میں وہ پروڈیوسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ انھیں ڈراما نگاری اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ غلام عباس کے افسانوی مجموعوں 'آنندی'، 'جاڑے کی چاندنی' اور 'کن رس' کو اُردو ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے 'گوندنی والا تکیہ' کے نام سے ایک ناول بھی لکھا۔ ان کا دوسرا ناول 'جزیرۂ سخن وراں' ایک فرانسیسی ناول سے ماخوذ ہے۔ وہ بڑے روشن خیال ادیب تھے۔ ان کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر انھیں کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ مختلف مغربی زبانوں میں ان کے افسانوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ۲ر نومبر ۱۹۸۲ء کو غلام عباس کا کراچی میں انتقال ہوا۔

جنوری کی ایک شام ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیئرنگ کراس کا رُخ کر کے خراماں خراماں پٹری پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں، گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔ بادامی رنگ کا گرم اوورکوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ایک ادھ کِھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فیلٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھار کی طرح جسم پر آ کے لگتی تھی مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اور لوگ خود کو گرم کرنے کے لیے تیز قدم اُٹھا رہے تھے مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزا آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کر سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے مگر وہ چھڑی کے اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رُکی مگر اس نے 'نو تھینک یو' کہہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی

اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رُخ نہ کیا اور سیدھا چیئرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات وسکنات میں کسی قدر متانت آ گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا تاکہ گرد جم گئی ہو تو اُتر جائے۔ پاس ہی گھاس کے ایک ٹکڑے پر کچھ انگریز بچے بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ رُک گیا اور بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بینچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

مال روڈ پر موٹروں، تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی، پٹڑی پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ سڑک کی دورویہ دکانوں میں خرید وفروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریحِ طبع کی استطاعت تھی نہ خرید وفروخت کی، وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے زن ومرد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، فنکار، کالجوں کے طلبہ اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابو... زیادہ تر لوگ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوور کوٹ، بیش قیمت اوور کوٹ سے لے کر پرانے اوور کوٹ تک جنھیں نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا اوور کوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا۔ پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ بانہوں کی کریز بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں۔ بٹن، سینگ کے بڑے بڑے، چمکتے ہوئے۔ نوجوان اس کوٹ میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلّی سردی میں ٹھٹھری ہوئی بینچ کے نیچے اس کے قدموں میں آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اُچھل کر بینچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا، ''پؤر لٹل سول۔''

اس کے بعد وہ بینچ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کر کے اس طرف چلا جدھر سنیما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ برآمدے میں بھیڑ نہ تھی۔ صرف چند لوگ تھے جو آنے والی فلموں کی تصویروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں ان تصویروں کو شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک خاص شانِ استغنا کے ساتھ وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی۔ پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد نوجوان بھی سنیما کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اب سات بج چکے تھے اور وہ مال روڈ کی پٹڑی پر پھر پہلے کی طرح مٹر گشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کے آلات کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی۔ وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے ہوئے تھے۔ ایک ہسپانوی گٹار پر، جو ایک کھونٹی سے ٹنگی ہوئی تھی، نوجوان نے ناقدانہ نظر ڈالی اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا، اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا جرمن پیانو رکھا ہوا تھا۔ اس کا کور اُٹھا کے اُنگلیوں سے بعض پردوں کو اس نے ٹٹولا اور پھر کور بند کر دیا۔

پیانو کی آواز سن کر دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔ ''گڈ ایوننگ سر، کوئی خدمت؟''

''نہیں شکریہ۔ ہاں اس مہینے کی گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دیجیے۔''

فہرست لے کر نوجوان نے اوورکوٹ کی جیب میں ڈالی، دکان سے باہر نکل آیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بک اسٹال پڑا۔ نوجوان یہاں بھی رکا۔ کئی تازہ رسالوں کے ورق اُلٹے۔ وہ جہاں سے رسالہ اُٹھاتا، بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا۔ اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک دکان نے جو ایک لمبا سا چغہ پہنے اور سر پر کلاہ رکھے تھا، گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

''ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُتاریے نہیں، یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟''

''چودہ سو تیس روپے ہے۔''

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا جس کا مطلب تھا 'اوہو، اِتنی!'

دکان دار نے کہا، ''آپ پسند کر لیجیے۔ ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں، کر دیں گے۔''

''شکریہ لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔''

'شوق سے دیکھیے۔ آپ ہی کی دکان ہے۔''

وہ تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا، وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹرگشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد اس کو تکان محسوس ہوئی تھی نہ اُکتاہٹ۔ یہاں پٹری پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فصل رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک اُنگلی پر گھمانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی۔ ''اوہ، سوری'' کہہ کر وہ زمین پر جھکا اور چھڑی کو اُٹھا لیا۔

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹرگشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں، ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا۔ وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔

ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے روندتی ہوئی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لیے گاڑی کی رفتار کم کی۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے، شور مچانے لگے کہ ''نمبر دیکھو، نمبر دیکھو'' مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا ایک انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا، رُک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کُچلی گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کر بڑے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ جس وقت وہ اسپتال پہنچا تو اس میں

ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔ اس اسپتال کے شعبۂ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نوعمر نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے اسٹریچر پر ڈال کے آپریشن روم میں لے جایا جا رہا تھا، ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اوورکوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ کسی نے از راہِ دردمندی اس کی سبز فیلٹ ہیٹ اُٹھا کر اس کے سینے پر رکھ دی تھی تاکہ کوئی اُڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا، ''کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔''

گل دبی آواز میں بولی، ''خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ ہفتے کی شام منانے۔ ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟''

''نہیں، بھاگ گیا۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے!''

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنھوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کے سارے حصے کو چھپا رکھا تھا، اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبودار تیل ڈال رکھا تھا، اس کی کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں۔ حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اُتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک گلوبند اس کے گلے سے اُتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں، جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا سرے سے قمیص ہی نہیں تھی۔ اوورکوٹ اُتارا گیا تو نیچے سے ایک بوسیدہ اونی سویٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا پُھلکا پاؤڈر لگا ہوا تھا۔ سویٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اُٹھیں۔ پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی رہی ہوگی، خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں لگی تھیں مگر چونکہ یہ حصے اوورکوٹ کے نیچے رہتے تھے اس لیے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔ اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں، اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ بلاشبہ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا، کپڑے اُتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا ہے۔

اس کے اوورکوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں، وہ یہ تھیں: ایک چھوٹی سی سیاہ کنگھی، ایک رومال، ساڑھے چھے آنے، ایک بجھا ہوا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں نام اور پتے لکھے تھے۔ نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو مٹرگشت کے دوران اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیے تھے اور اس نے انھیں اوورکوٹ کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران کہیں کھوگئی تھی، اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

معانی و اشارات

تراش خراش	زیب و زینت	خفیف	ہلکا / ہلکی
گلوبند	یہاں مراد مفلر	فصل	فاصلہ، دوری
دورویہ	دونوں طرف	منعطف کرنا	متوجہ کرنا
ہر قماش کے	ہر قسم کے، ہر رنگ کے	رمق بھر	تھوڑی سی
پٹری	فٹ پاتھ	جراحی	آپریشن
مٹرگشت	بے مقصد گھومنا	مَسک جانا	کپڑے کا ذرا سا پھٹ جانا
کارندہ	نوکر	جراب	موزہ
چغہ	عبا، جبہ، لبادہ	خجل	شرمندہ، نادم

مشقی سرگرمیاں

* خوش پوش نوجوان کی تراش خراش سے متعلق شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

نوجوان کی تراش خراش
- ....
- ....
- ....
- ....
- ....
- ....

* نوجوان کے اوورکوٹ سے متعلق مناسب الفاظ لکھ کر خاکے کو مکمل کیجیے۔

نوجوان کا اوورکوٹ
- کپڑا ← ....
- سلائی ← ....
- کالر ← ....
- کریز ← ....
- بٹن ← ....

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ مال روڈ کی منظرکشی کیجیے۔

۲۔ نوجوان نے سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھے جو کچھ دیکھا، اسے بیان کیجیے۔

۳۔ نوجوان کے اوورکوٹ کی تفصیل بیان کیجیے۔

۴۔ موسیقی کے آلات کی دکان پر نوجوان کی سرگرمیوں کو اپنے جملوں میں تحریر کیجیے۔

۵۔ آپریشن روم کے منظر کو تفصیل سے لکھیے۔

۶۔ نوجوان کے اوورکوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں، ان کا شبکی خاکہ بنائیے۔

۷۔ نوجوان کی مٹرگشت کو سلسلہ وار لکھیے اور اس کا رواں خاکہ بنائیے۔

۸۔ نوجوان کے کردار کے بارے میں لکھیے۔

۹۔ نوجوان کی موت کے بعد سامنے آنے والی اس کی شخصیت کے پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کیجیے۔

* جملوں میں استعمال کیجیے۔

خراماں خراماں ، لمبی لمبی ، باریک باریک ، تیز تیز ، ہلکے ہلکے ، کھڑے کھڑے

* ہدایات کے مطابق قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ نوجوان کا اپنا اوور کوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا۔
(جملے کی قسم بتا کر نحوی تجزیہ کیجیے)

۲۔ اب اس کے کپڑے اُتارے جارہے تھے۔
(جملے کا 'طور' تبدیل کیجیے)

۳۔ کتنے افسوس کی بات ہے!
(بیانیہ جملے میں تبدیل کیجیے)

۴۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
(خط کشیدہ لفظ کی فعلی شکل استعمال کرتے ہوئے جملہ دوبارہ لکھیے)

سرگرمی/منصوبہ

نویں جماعت کے اضافی مطالعے میں آپ نے جو افسانے پڑھے ہیں ان پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

چند انگریزی کہاوتیں اور ان کا اُردو مفہوم

★ Child is the father of man.	پُوت کے پاؤں پالنے میں۔
★ Bad carpenter blames his tools.	ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔
★ To err is human.	انسان غلطیوں کا پُتلا ہے۔
★ Neither fish nor fowl.	آدھا تیتر آدھا بٹیر۔
★ Out of the frying pan into the fire.	آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔
★ Too many cooks spoil the broth.	دو مُلّاؤں میں مرغی حرام۔
★ Between the devil and the deep sea.	آگے کنواں پیچھے کھائی۔
★ Listen to people, but obey your conscience.	سنو سب کی، کرو اپنی۔
★ No rose without a thorn.	جہاں پھول وہاں کانٹے۔
★ Man is known by the company he keeps.	آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔

۵ اُردو لغت نویسی کی مختصر تاریخ

عبدالرؤف پاریکھ

پیش درس

نئے لفظوں کے معنی جاننے کے لیے ہم لغت سے رجوع کرتے ہیں۔ لغت میں کسی زبان کے الفاظ ابجدی ترتیب میں شامل ہوتے ہیں اور ہر لفظ کے سامنے اس کے معنی یا مترادفات درج کیے جاتے ہیں۔ عربی میں لغت کے معنی لفظ، بات اور ڈکشنری بھی ہیں۔ اُردو میں عام طور پر ڈکشنری کے لیے لغات کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے مگر لغت بھی اس معنی میں بولتے ہیں۔ لغت میں الفاظ کے معنی کے علاوہ دیگر معلومات درج کی جاتی ہے۔

لفظ کی دو قسمیں ہیں (ا) لغتی لفظ اور (۲) قواعدی لفظ۔ لغت میں جو الفاظ درج کیے جاتے ہیں ان کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہوتے ہیں۔ انھیں لغتی الفاظ کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے الفاظ کے معنی طے نہیں ہوتے جنھیں قواعدی الفاظ کہا جاتا ہے۔ لفظ کی طرح معنی کی بھی دو قسمیں ہیں (ا) لغوی معنی اور (۲) مجازی معنی۔ لغوی معنی طے شدہ ہوتے ہیں جبکہ مجازی معنی طے شدہ نہیں ہوتے اور جملے میں اپنے استعمال کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔

لغت کی کئی قسمیں ہیں جیسے یک زبانی لغت، دو زبانی یا کثیر زبانی لغت، بولی لغت، اصطلاحی لغت، محاوراتی اور کہاوتی لغت وغیرہ۔ لغت میں شامل الفاظ کی تعداد کے مطابق اس کے دوسرے نام بھی ہیں جیسے قاموس، فرہنگ، انسائیکلوپیڈیا وغیرہ۔ فرہنگ وہ لغت ہے جس میں کسی خاص علم یا کتاب کے الفاظ ابجدی ترتیب میں رکھ کر ان کے معنی بتائے جاتے ہیں۔ درسی کتاب کے اسباق میں آنے والے نئے الفاظ کی جو فہرست سبق کے بعد یا شروع میں شامل کی جاتی ہے، وہ بھی ایک طرح کی مختصر فرہنگ ہی ہے۔ اسی طرح انسائیکلوپیڈیا ایک بہت طویل لغت ہے جس میں دنیا بھر کی معلومات کو ابجدی ترتیب میں رکھ کر اس معلومات کی تفصیل دی جاتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا اسی قسم کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اُردو میں 'اُردو انسائیکلوپیڈیا' اس کی اہم مثال ہے۔ زبان کے علاوہ مذہب، سائنس، فنون وغیرہ کی تفصیلی معلومات دینے والی انسائیکلوپیڈیا بھی لکھی گئی ہیں۔

جان پہچان

عبدالرؤف پاریکھ ۲۶ راگست ۱۹۵۸ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم.اے اور پی ایچ.ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۷ء تک اُردو لغت بورڈ (کراچی) میں انھوں نے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۲۰۱۷ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ لغت نویسی ان کی خاص دلچسپی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ظرافت نگاری سے بھی ان کو خاصا شغف ہے۔ انھوں نے اخبارات میں کالم نویسی کے فرائض بھی انجام دیے۔ وہ خصوصی طور پر لغت نگاری کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ تقریباً بیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ 'اُردو لغت، اُردو لغت نویسی، اوکسفرڈ اُردو ڈکشنری، عصری ادب میں سماجی رجحانات' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ وہ کامیاب مترجم بھی ہیں۔

بعض اہلِ علم کے خیال میں اُردو لغت نویسی کا پہلا دور وہ تھا جب عربی اور فارسی تصانیف میں اُردو کے الفاظ اپنی اصلی یا کچھ بدلی ہوئی شکل میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ لیکن اُردو لغت نویسی کے یہ ابتدائی نقوش بے قاعدہ ہیں اور انھیں اُردو لغت نویسی کے آغاز کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کچھ باقاعدگی اس وقت نظر آئی جب لگ بھگ چودھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک برصغیر پاک و ہند میں فارسی کی کئی مستند لغات لکھی گئیں۔ یہ لغات مغلیہ دور سے قبل لکھی گئی تھیں اور آج بھی فارسی لغات کے لیے سند کا حکم رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض میں کئی مقامات پر عربی اور فارسی الفاظ کے معنی بیان کرتے ہوئے ان کے اُردو

مترادفات بھی استعمال کیے گئے ہیں تاکہ عام لوگ بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔

اُردو لغت نویسی کا دوسرا مرحلہ وہ مختصر منظوم لغات تھیں جنھیں نصاب نامہ کہتے ہیں۔ یہ لغات طالب علموں کے نصاب کے طور پر تخلیق کی گئی تھیں۔ ان میں فارسی اور عربی الفاظ کے اُردو مترادفات نظم کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے مشہور نصاب نامہ 'خالق باری' ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ 'خالق باری' امیر خسرو کی تصنیف ہے لیکن حافظ محمود شیرانی نے اس سے اختلاف کیا اور اسے جہانگیری دور کے کسی خسرو نامی شخص سے منسوب کیا۔ 'خالق باری' کے تتبع میں کئی نصاب نامے لکھے گئے۔ بیسویں صدی میں ایسے نصاب نامے بھی لکھے گئے جن کا مقصد عربی اور فارسی کے علاوہ اُردو اور انگریزی الفاظ کے مترادفات بتانا بھی تھا۔

اُردو لغت نویسی کے تیسرے مرحلے میں ہمیں ایسی لغات ملتی ہیں جن کو 'اُردو بہ فارسی' لغات کہنا چاہیے کیونکہ ان میں اُردو الفاظ کی وضاحت فارسی مترادفات کے ذریعے کی گئی ہے۔ ایسی ہی ایک لغت عبد الواسع ہانسوی کی 'غرائب اللغات' ہے جسے اُردو کی پہلی لغت کہا جاتا ہے۔ اس کے قدیم ترین دستیاب نسخے کا سالِ کتابت ۴۷-۱۷۴۶ عیسوی ہے۔ اس پر خان آرزؔو نے سخت تنقید کی اور 'نوادر الالفاظ' کے نام سے اس کی تصحیح کی۔ اُردو کی دوسری باقاعدہ لغت 'کمالِ عترتؔ' ہے جو میر محمدی نعمت اللّٰہی عترتؔ اکبر آبادی کی تصنیف ہے۔ اس کا قرینِ قیاس سالِ تصنیف ۷۶-۱۷۷۵ عیسوی ہے۔ لیکن اس کتاب کا خاصا حصہ ہانسوی کی 'غرائب اللغات' سے ماخوذ ہے اور اس میں جو اُردو الفاظ دیے گئے ہیں، ان میں سے کئی پنجابی ہیں۔ 'کمالِ عترتؔ' سے بھی پہلے ایک لغت کا ذکر ملتا ہے جس کا نام 'عجائب اللغات' ہے۔ اس لغت کے انتخاب کا ایک مخطوطہ جو صرف ۴۶ صفحات پر مبنی تھا، مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں تھا۔ اس کے مصنف کا پورا نام معلوم نہیں ہو سکا کیونکہ دیباچے میں وہ خود کو صرف 'اجمیری پلولی' لکھتا ہے اور رضوی صاحب کے مطابق اس نے ہانسوی سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ان لغات میں اور ان سے قبل نصاب ناموں میں بھی چونکہ تشریح کی بجائے مترادفات پر زور تھا، لہٰذا اس کا نقصان یہ ہوا کہ اس کے اثر سے اُردو میں لغت نویسی کو مترادفات کی فہرست سازی سمجھ لیا گیا اور آج بھی اُردو کی کئی لغات میں تشریح کی بجائے مترادفات کے ڈھیر لگا کر سمجھا جاتا ہے کہ لغت نویسی کا حق ادا ہو گیا۔ حالانکہ جدید لغت نویسی میں تشریح کی اتنی اہمیت ہے کہ 'کنسائز اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری' میں زیادہ زور تشریح پر ہے اور اس میں مترادفات بہت کم ہیں۔

'اُردو بہ فارسی لغات' کے اس دور کی ایک اہم لغت 'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' ہے۔ ۹۶ صفحات کی یہ لغت مرزا جان طپشؔ دہلوی نے ۹۳-۱۷۹۲ عیسوی میں تالیف کی تھی، گو اس کی اشاعت کوئی پچاس سال بعد یعنی ۱۸۴۸ء عیسوی میں ہو سکی۔ یہ لغت مختصر ہے لیکن اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں تلفظ کی وضاحت حروف کے اعراب الگ الگ بتا کر کی گئی ہے۔ اس کے بعد جو فارسی لغات ملتی ہیں، ان کے نام یہ ہیں: محمد مہدی واصف کی 'دلیلِ ساطع'، اَوحَد الدین بلگرامی کی 'نفائس اللغات'، میر علی اوسط رشکؔ کی 'نفس اللغۃ' اور محبوب علی رام پوری کی 'منتخب النفائس'۔ اس مؤخر الذکر لغت میں عربی الفاظ پر زیادہ زور ہے۔ اُردو بہ فارسی لغات کا یہ دور خاصے عرصے تک چلا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فارسی سرکاری زبان تھی اور ذہنوں پر بھی چھائی ہوئی تھی۔

اُردو بہ اُردو لغات کی باری بعد میں آئی۔ اس سے پہلے اُردو-انگریزی لغات کا چرچا ہو گیا کیونکہ اب انگریزی اقتدار کا سورج پوری آب و تاب سے طلوع ہو چکا تھا۔ اوپر 'دلیلِ ساطع' کا ذکر آیا ہے۔ یہ لغت کسی انگریزی لغت سے الفاظ لے کر ترتیب دی گئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو بہ انگریزی لغات کی تصنیف بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ یورپی مبلغین اور مستشرقین نے اُردو

قواعد اور اُردو کی دولسانی لغات کی تیاری کا کام بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ چونکہ یورپی اقوام بالخصوص پرتگالیوں نے جنوب مغربی ہند کے ساحلوں پر پہلے توجہ کی تھی اور گوا جیسی آبادیوں پر اپنا تسلط قائم کرلیا تھا، لہٰذا ان علاقوں میں بھی ان کے اثرات اُردو کی لغات (جن میں سے بعض کو الفاظ کی فہرست کہنا چاہیے) میں جھلکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورت (گجرات) میں ۱۶۳۰ء میں ایک ایسی لغت لکھی گئی تھی جس میں اُردو، فارسی، انگریزی اور پرتگالی کے الفاظ شامل تھے اور اس میں اُردو کے الفاظ رومن اور گجراتی رسم الخط میں دیے گئے تھے۔ سورت ہی میں ۱۷۰۴ء میں ایک ایسی لغت بھی لکھی گئی تھی جو چار زبانوں اُردو، فرانسیسی، ہندی اور لاطینی میں تھی۔

اس دَور میں یورپی بالخصوص انگریز لغت نویسوں نے اُردو لغت نویسی کی ترقی میں بے مثال کردار ادا کیا۔ ابتدائی لغات سے قطع نظر اُردو بہ انگریزی لغات میں جان گل کرسٹ کی لغت 'انگلش ہندوستانی ڈکشنری' اہم ہے۔ یہ ۱۷۸۷ء میں کلکتہ سے شائع ہونا شروع ہوئی اور ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوئی۔ بعد کے ایڈیشنوں میں اضافے بھی کیے گئے۔ جان شیکسپیئر کی 'اے ڈکشنری، ہندوستانی اینڈ انگلش' نہایت اہم ہے۔ کیونکہ اس نے بعد کے ادوار میں لکھی گئی اُردو بہ انگریزی لغات کے لیے بنیادی مآخذ کا کام کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے چوتھے ایڈیشن میں جو لندن سے چھپا تھا، اضافوں اور انگریزی بہ اُردو لغت کے شمول نے اسے ایک جامع انگریزی بہ اُردو اور اُردو بہ انگریزی لغت کی شکل دے دی۔ اس کے بعد جو انگریزی بہ اُردو لغات انگریزوں نے لکھیں ان کی بھی ایک طویل فہرست ہے لیکن ان میں اہم یہ ہیں: ڈنکن فاربس کی 'اے ڈکشنری، ہندوستانی اینڈ انگلش'، ایس. ڈبلیو. فیلن کی 'اے نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری' اور جان ٹی. پلیٹس کی 'اُردو، کلاسیکل ہندی اینڈ انگلش ڈکشنری' ۱۸۸۴ء۔ ایس. ڈبلیو. فیلن اپنی لغت کی مکمل اشاعت سے پہلے اسے قسطوں میں چھپواتے رہے۔ ان انگریزوں بالخصوص پلیٹس اور فیلن نے بڑی محنت اور جستجو سے کام لیا اور لغت نویسی کے لیے الفاظ، ان کے معنی اور تلفظ کی جمع آوری کے لیے عملی تحقیق بھی قدرتی ماحول میں یعنی زبان برتنے والوں سے مل کر کی تھی۔ پلیٹس کی لغت پر البتہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے ایسے الفاظ بھی لغت میں لے لیے جو خالصتاً سنسکرت کے ہیں اور اُردو میں کبھی استعمال ہوئے ہیں اور نہ آئندہ کبھی اس کا امکان ہے۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ پلیٹس کی لغت صرف اُردو کی نہیں ہے بلکہ کلاسیکل ہندی کی بھی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ پلیٹس کی لغت کو سند اور جواز بنا کر بعد کے دور میں لکھی جانے والی اُردو لغات میں ایسے الفاظ کا اندھا دھند اندراج صحیح نہیں ہے۔

انگریزوں کی ان لغات سے اُردو کو یقیناً فائدہ ہوا۔ ایک تو اُردو لغت نویسی کی روایت میں یہ لغات اہم سنگِ میل اور بعض صورتوں میں مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں لغت نویسی میں بالعموم شاعری کو سند مانا جاتا تھا اور عام بول چال کی زبان اور روزمرہ کو لغت کے لیے ناموزوں خیال کیا جاتا تھا۔ ایس ڈبلیو فیلن کا ایک بڑا احسان اُردو پر یہ ہے کہ اس نے عورتوں کی زبان، ٹھیٹھ اُردو، دیہات کی بولی اور لوک ادب کی امثال پر بڑا زور دیا جس سے اُردو کے کئی علاقائی محاورے، علاقائی تلفظ اور نسوانی استعمال میں آنے والے الفاظ محفوظ ہوگئے۔ دوسرا رجحان فیلن کے ہاں یہ ہے کہ اس نے اُردو کے دیہاتی گیت، کہاوتیں، بولی ٹھولی اور کہیں کہیں کچھ جملے بھی بطور سند دیے ہیں۔ یہ ایک اہم علمی خزانہ ہے۔ اس سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے لغت نویسی میں فیلن کی مدد کی تھی ان کو قیمتی تجربہ حاصل ہوا اور انھوں نے خود بھی لغات تالیف کیں۔ ایسے لوگوں میں سب سے نمایاں سیّد احمد دہلوی ہیں جنھوں نے 'فرہنگِ آصفیہ' جیسی اہم، مستند اور ضخیم لغت تالیف کی۔

بہرحال، انگریزوں کی وجہ سے اُردولغت نویسی کی طرف بڑے بڑے لوگوں کی توجہ مبذول ہوگئی اور اُردو بہ اُردولغات کا دَور شروع ہوگیا۔ سرسیّد احمد خاں نے بھی اُردو کی ایک مبسوط لغت لکھنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے اس کا ایک نمونہ اُردو زبان کے معروف فرانسیسی عالم گارساں دتاسی کو پیرس بھی بھیجا جس نے اس کام کی بہت حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ اس کا نام 'لغتِ زبانِ اُردو' رکھیے۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں بھی سرسیّد کی اس مجوزہ لغت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن سرسیّد اپنی تعلیمی اور قومی سرگرمیوں میں مصروفیت کے سبب یہ کام نہ کرسکے اور صرف اس کا نمونہ ہی چھپوا سکے۔ اسی زمانے میں عبدالمجید خاں رام پوری نے ایک عظیم الشان لغت لکھی۔ الطاف حسین حالؔی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اُنیس جلدوں میں تھی مگر شائع نہ ہوسکی۔ والیِ رام پور نے اس کا مسودہ شاہی کتب خانے میں داخل کرنے اور اس کی اشاعت کا حکم دیا تھا مگر ان کا انتقال ہوگیا اور یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ مسودے کا کیا حشر ہوا۔

اس دَور کی اہم ترین اور اُردو کی چند بہترین لغات میں سے ایک 'فرہنگِ آصفیہ' پر کام کا آغاز سیّد احمد دہلوی نے ۱۸۶۸ء میں کر دیا تھا۔ اس کی اشاعت پہلے مختصر صورت میں 'مصطلحاتِ اُردو' کے نام سے ہوئی۔ اس کے بعد یہ ۱۸۷۸ء میں 'ارمغانِ دہلی' کے نام سے چھپی۔ پھر انھوں نے اس کی مکمل تدوین کا کام شروع کیا اور 'ہندوستانی اُردولغات' کے نام سے اسے نومبر ۱۸۸۲ء میں بطور رسالہ ماہانہ قسط وار چھاپنا شروع کیا۔ ۱۸۹۲ء میں اس کی تدوین کا کام مکمل ہوا۔ گویا اس کی تکمیل میں تیس سال لگے۔ نظام دکن نے مؤلف سیّد احمد دہلوی کو اس لغت کے لیے انعام بھی دیا۔ نظام کے خطاب اور تخلص 'آصف' کی مناسبت سے اس کا نام 'فرہنگِ آصفیہ' رکھا گیا۔ قسط وار چھپے ہوئے لغت کے رسالوں کو جلد اوّل اور جلد دوم پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ تیسری جلد رسالوں کی بجائے باقاعدہ بڑی تقطیع پر لغت کی صورت میں ۱۸۹۸ء میں چھاپی گئی۔ چوتھی جلد ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس عرصے میں جلالؔ لکھنوی کی دو لغات 'گنجینۂ زبانِ اُردو' اور 'سرمایۂ زبانِ اُردو'، چرنجی لال کی 'مخزنِ محاورات'، مرزا محمد مرتضٰی عرف مچھو بیگ ستم ظریفؔ کی 'بہارِ ہند'، غلام سرور لاہوری کی 'جامع اللغات' اور بعض دوسری اُردو بہ اُردولغات چھپ چکی تھیں مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ سب مل کر بھی 'فرہنگِ آصفیہ' کو نہیں پہنچ سکتیں۔ امیرؔ مینائی کی 'امیر اللغات' کی پہلی جلد ۱۸۹۱ء میں اور دوسری جلد ۱۸۹۳ء میں چھپ چکی تھی اور سیّد احمد دہلوی نے امیرؔ پر سرقے کا الزام بھی لگایا جو سراسر غلط تھا۔ امیرؔ مکمل لغت لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیماری اور پھر وفات کے سبب یہ کام نامکمل رہ گیا۔ ان کی بقیہ زیرِ تالیف جلدوں میں سے صرف تیسری جلد کا مسودہ دستیاب ہوسکا اور یہ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔

اس کے بعد کے دَور میں مولوی نور الحسن نیرؔ کی 'نور اللغات' (چار حصے ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۱ء) اور خواجہ عبدالمجید کی 'جامع اللغات' (۳۲ حصے) بہت اہم ہیں۔ پھر تو اُردو بہ اُردولغات کا تانتا بندھ گیا اور بہت بڑی تعداد میں مختلف ضخامت کی لغات لکھی گئیں، گو ان میں سے بیشتر ایسی تھیں کہ ان کا مقصد محض تجارت تھا اور ان سے لغت نویسی کے باب میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور پچھلے چند برسوں میں بہت بڑی تعداد میں اُردو بہ اُردولغات شائع کی گئی ہیں لیکن پچھلے پچاس برسوں میں منظرِ عام پر آنے والی ان میں دو ہی لغات ایسی ہیں جن کی علمی لحاظ سے بہت اہمیت ہے اور ان میں اُردو زبان کے الفاظ و محاورات بہت بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ یہ دو لغات 'مہذب اللغات' (۱۴ جلدیں) اور 'اُردو لغت تاریخی اُصول پر' (۲۲ جلدیں ۱۹۵۸ء تا ۲۰۱۰ء) ہیں۔ اگرچہ ان میں کچھ خامیاں بھی ہیں لیکن یہ لغات اپنی جگہ بہت اہم اور وقیع ہیں۔

معانی و اشارات

مترادفات – مترادف کی جمع، ہم معنی الفاظ

تتبّع – تقلید، پیروی

مخطوطہ – مصنف کے قلم سے لکھا ہوا کسی کتاب کا مواد، غیر مطبوعہ قلمی تحریر

مبلّغین – مبلغ کی جمع، تبلیغ کرنے والے

مستشرقین – مستشرق کی جمع، یورپ کے وہ عالم جو مشرقی علوم کے ماہر ہوں

وقیع – وقعت والا، اہم

مشقی سرگرمیاں

✲ صرف نام لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

(الف) مختصر منظوم لغات – ....

(ب) اُردو کی پہلی لغت – ....

(ج) اُردو کی باقاعدہ دوسری لغت – ....

(د) اجمیری پلولی کی لغت – ....

✲ شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

فارسی لغات

✲ سیّد احمد دہلوی کی تالیف کردہ مستند لغت کے مختلف ناموں کا شبکی خاکہ تیار کیجیے۔

✲ ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ اُردو لغت نویسی کے پہلے اور دوسرے مرحلے کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

۲۔ اُردو لغت نویسی کے تیسرے مرحلے کی لغات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

۳۔ ’شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان‘ کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۴۔ ۱۸۱۷ء سے ۱۸۸۴ء تک کی اُردو انگریزی لغت نویسی پر نوٹ لکھیے۔

۵۔ جان ٹی پلیٹس اور ایس. ڈبلیو. فیلن کا اُردو لغت نویسی پر احسان بیان کیجیے۔

۶۔ ’نصاب نامہ‘ کی تعریف بیان کیجیے۔

۷۔ ۱۹۲۴ء سے لے کر ۲۰۱۰ء تک لغت نویسی میں پیش رفت کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۸۔ ’فرہنگِ آصفیہ‘ پر کام کے آغاز سے اختتام تک کے مراحل تحریر کیجیے۔

✲ ہدایات کے مطابق قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ اُردو لغت نویسی کے یہ ابتدائی نقوش بے قاعدہ ہیں۔
(جملے کا نحوی تجزیہ کیجیے)

۲۔ یہ لغت مختصر ہے۔
(مفہوم تبدیل کیے بغیر منفی جملہ بنائیے)

۳۔ نظام کے تخلص ’آصف‘ کی مناسبت سے اس کا نام ’فرہنگِ آصفیہ‘ رکھا گیا۔
(جملے کا ’طور‘ تبدیل کیجیے)

۴۔ کیا امیرؔ مینائی کی وفات کے سبب یہ کام نامکمل نہیں رہ گیا؟
(اس جملے کو استفہامیہ اقراری جملے میں تبدیل کیجیے)

سرگرمی/منصوبہ

۱۔ اضافی مطالعے کے اسباق سے کسی ایک سبق میں شامل نئے الفاظ کی فرہنگ ابجدی ترتیب میں تیار کیجیے۔

۲۔ اس کتاب کے حصۂ نظم میں شامل شعرا کے ناموں کو ابجدی ترتیب میں لکھیے۔

اضافی معلومات

قادر نامہ : مرزا غالبؔ نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور انھیں زبان سکھانے کے لیے 'قادر نامہ' کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ دراصل یہ ایک نصاب نامہ ہے جس کے ہر شعر میں غالبؔ نے عام استعمال کے فارسی اور عربی الفاظ کے ہندی یا اُردو مترادفات بیان کیے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو سکے۔ رام پور کے شاہی کتب خانے میں اس مثنوی کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے جو ۱۸۶۴ء میں یعنی غالبؔ کے انتقال سے پانچ سال قبل مجلس پریس، دہلی سے شائع ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اس مثنوی کو غلام رسول مہرؔ نے اپنے مرتب کردہ 'دیوانِ غالبؔ' میں تیسرے ضمیمے کے طور پر شامل کیا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی یہ مثنوی بڑوں کے لیے بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

'قادر' (اللہ) اور 'یزداں' ہے (خدا) ہے 'نبی' (مرسل)، پیمبر (رہنما)
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں (امام) وہ 'رسول اللہ' کا (قائم مقام)
ہے 'صحابیٔ' (دوست) ، 'خالص' (ناب) ہے جمع اس کی یاد رکھ 'اصحاب' ہے
'بندگی' کا ہاں (عبادت) نام ہے نیک بختی کا (سعادت) نام ہے
'لیل' یعنی (رات) 'دن' اور روز (یوم) 'کھولنا' (افطار) ہے اور 'روزہ' (صوم)

مولوی سیّد احمد دہلوی : (۱۸۴۶ء تا ۱۹۱۸ء) اُردو لغت 'فرہنگِ آصفیہ' کے مؤلف ہیں۔ معمولی تعلیم کے باوجود انھیں تصنیف و تالیف کا شوق جوانی سے تھا۔ انھوں نے بچوں کے لیے انشا کی کتابیں 'تقویت الصّبیان' اور 'کنز الفوائد' لکھی جن پر سرکار سے انعام ملا۔ اِس سے بھی زیادہ انعام انھوں نے 'وقائع درونیہ' پر حاصل کیا۔ ڈاکٹر فیلن نے انگریزی ہندوستانی لغت کی تیاری میں انھیں اپنا مددگار مقرر کیا۔ ۱۸۸۰ء کے بعد وہ 'گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب' میں مترجم رہے۔ اپنی اُردو لغت کی تیاری کے ساتھ انھوں نے عورتوں کے لیے 'ہادی النساء' اور 'لغات النساء' لکھیں۔ ہندی پہیلیاں اور دوہے 'ریت بکھان' اور 'ناری کتھا' میں جمع کیے۔ 'رسوم اعلیٰ ہندوانِ دہلی' میں ہندوؤں کے رسم و رواج لکھے۔ مسلمانوں کے رسوم و رواج پر ان کی تصنیف 'رسومِ دہلی' زیادہ مشہور ہوئی۔ زبان اور لغت کے سلسلے میں انھوں نے 'تکمیل الکلام' (اصطلاحاتِ پیشہ وراں)، 'تحقیق الکلام، لغات النساء، اُردو ضرب الامثال، روزمرۂ دہلی' تالیف کی تھیں لیکن ان کی ناموری کا اصل سبب اُردو کی بڑی لغت 'فرہنگِ آصفیہ' ہے جو چار جلدوں میں بڑی تقطیع پر چھپی۔ یہ لغت تقریباً پچاس ہزار الفاظ کی شرح کرتی ہے۔ یہ لغت ۱۸۹۲ء میں لکھی جا چکی تھی مگر اس کی طباعت کئی سال بعد تک ہوتی رہی۔ اس کارنامے پر مؤلف کو سرکارِ آصفیہ، حیدرآباد سے پچاس ہزار روپے انعام اور پچاس روپے ماہانہ وظیفہ دیا گیا تھا۔ مولوی سیّد احمد نے دہلی میں وفات پائی۔

گارساں دتاسی (Garcin de Tassy) : (۱۷۹۴ء تا ۱۸۷۸ء) فرانس کے ایک مشہور مستشرق جنھوں نے متعدد طریقوں سے اُردو زبان اور ادبیات کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ وہ ۱۸۱۷ء میں پیرس کے مدرسۂ اَلسِنۂ شرقیہ میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے پروفیسر دساسی (De Sassy) سے عربی اور فارسی زبانیں سیکھیں اور 'منطق الطّیر' کا فارسی سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ بعد ازاں انھوں نے اُردو سیکھی اور اس میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ اپنے نامور استاد دساسی کی ایما پر ۱۸۲۸ء میں اسی مدرسے میں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور مدتِ دراز تک تعلیم و تدریس کے علاوہ اُردو کتابوں اور دواوین کی اشاعت اور ان کے ترجمے میں مصروف رہے۔ وہ ہر سال اُردو ادبیات کی ترقی اور جدید مطبوعات پر ایک خطبے کی صورت میں تبصرہ کیا کرتے تھے۔ ان کی تالیفات میں سب سے زیادہ مشہور اور مفید 'اُردو ادب کی تاریخ' ہے جو انھوں نے فرانسیسی زبان میں تین جلدوں میں لکھی۔ (طبع دوم، پیرس، ۱۸۷۰ء) منشی کریم الدین کی کتاب 'طبقات الشعرا' اسی تاریخ کی طبع اوّل پر مبنی تھی۔ ان کے اُنیس خطبوں کا اُردو ترجمہ 'خطباتِ گارساں دتاسی' اور 'مقالاتِ گارساں دتاسی' (اوّل و دوم) از ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۹ء کے ناموں سے انجمنِ ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن) کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ دتاسی کی انتھک کوششوں سے نہ صرف فرانس میں ایک مدت تک اُردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں کا چرچا رہا بلکہ ان کی تحریروں سے ہندوستان میں بھی اُردو ادبیات کے مطالعے کو بڑی تحریک ملی۔

٦

انسپکٹر جنرل

ادارہ

پیشِ درس

ڈراما زندگی کی نقالی کا نام ہے۔ زندگی میں ہونے والے واقعات اسٹیج پر پیش کیے جائیں تو یہ ڈراما کہلاتا ہے۔ اُردو میں بہت سی دوسری زبانوں کے ڈرامے بھی ترجمہ کیے گئے ہیں۔ وی.وی. شرواڈکر کا مراٹھی ڈراما 'نٹ سمراٹ' اور موہن راکیش کا ہندی ڈراما 'آدھے ادھورے' اس کی مثالیں ہیں۔

'انسپکٹر جنرل' مشہور روسی ادیب نکولائی گوگول کا ڈراما ہے۔ اسے روسی زبان کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں اس ڈرامے کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس پر کئی زبانوں میں فلمیں بھی بنی ہیں۔ یہ ڈراما دفتر شاہی پر گہرا طنز ہے۔ ایک شاہی افسر بستی کے معائنے کے لیے آنے والا ہے جس کی خبر بستی کے مختلف محکموں کے کارندوں کو ملتی ہے۔ چونکہ تمام محکمے بدعنوانی اور بدانتظامی کا شکار ہیں اس لیے سارے افسران گھبرائے ہوئے ہیں۔ اس گھبراہٹ میں وہ ایک جعل ساز کو انسپکٹر جنرل سمجھ کر اس کی خوب مُدارات کرتے اور اسے نذرانے پیش کرتے ہیں۔

یہ ڈراما طنز و مزاح کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کا ترجمہ نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، پورا ڈراما ہمارے آس پاس ہی واقع ہو رہا ہے اور ڈرامے کے سارے کردار ہمارے جانے پہچانے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت اس کے کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں تاکہ اس میں مقامی رنگ پیدا ہو جائے۔

کردار

میئر | جج | ڈائرکٹر (اسپتالوں کا) | پوسٹ ماسٹر | سپرنٹنڈنٹ (تعلیمات) |
نمبردار۔ فضلو اور ببلو | مرزا تیمور شاہ (جعلی انسپکٹر) | جمّن (تیمور شاہ کا نوکر)

(پردہ اُٹھتا ہے۔ پس منظر موسیقی۔ کمرے میں میئر، جج، سپرنٹنڈنٹ، ڈائرکٹر بیٹھے ہوئے ہیں)

میئر : دوستو! آج یہ ضروری میٹنگ میں نے اس لیے طلب کی ہے کہ ہمارے شہر پر بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔

سب ایک ساتھ : کیا ہوا میئر صاحب؟

میئر : راجدھانی سے ایک انسپکٹر جنرل شہر کے معائنے کے لیے آنے والا ہے۔

جج : (گھبرا کر) انسپکٹر جنرل؟

میئر : جی ہاں، جج صاحب۔ اس کے پاس حکومت کی خفیہ ہدایات ہوں گی۔ وہ سادہ لباس میں رہے گا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ سکے۔

سپرنٹنڈنٹ : آپ کو کیسے اطلاع ملی میئر صاحب؟

میئر : راجدھانی سے میرے ایک دوست نے مجھے خط لکھا ہے۔ ابھی ابھی مجھے وہ خط ملا ہے۔ (ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) سب آ گئے مگر پوسٹ ماسٹر صاحب غائب ہیں۔

جج : صورتِ حال واقعی بڑی نازک ہے۔

میئر : یقیناً۔ میں نے اپنے طور پر کچھ احتیاطی تدبیریں کی ہیں۔ آپ لوگوں کو بھی میرا یہی مشورہ ہے۔ خاص طور پر ڈائرکٹر صاحب!

ڈائرکٹر : جی! میئر صاحب۔

میئر : آپ خیراتی اسپتالوں پر توجہ فرمائیں۔ معائنہ کرنے والے افسران عام طور پر سب سے پہلے اسپتالوں اور خیراتی اداروں کو دیکھا کرتے ہیں۔

ڈائرکٹر : میں آپ کے مشورے پر سر بسر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ (گڑگڑاتے ہوئے) مگر خدا کے لیے اس انسپکٹر جنرل سے جان بخشی کروائیے۔

میئر : آپ کو فوراً تمام مریضوں کے لیے اُجلی چادروں کا انتظام کرنا چاہیے۔

ڈائرکٹر : میئر صاحب! اتنی چادروں کا انتظام ہونا مشکل ہے۔

میئر : مریضوں کی تعداد کم دِکھائیے۔ پوچھیں تو بتانا، یہاں اسپتال میں مریض بہت جلد اچھے ہوکر چلے جاتے ہیں اور خدا کے لیے برآمدے میں سڑے گلے آلو، ٹماٹر، پھل فروٹ کے ڈھیر کو ہٹانے کا بندوبست کر لیجیے۔ اور اسپتال میں چاروں طرف اچھی طرح فنائل کا چھڑکاؤ کیجیے۔ (جج سے مخاطب ہوکر) اور جج صاحب!

جج : جی، میئر صاحب!

میئر : آپ بھی ذرا اپنی عدالت کے کمروں کی طرف دھیان دیں۔ عدالت کے کمرے سے بطخ کے بچے ہٹوا دیجیے۔ آخر عدالت میں بطخوں کا کیا کام؟

جج : جنابِ والا! اہلِ معاملہ کو ان سے کوئی خاص تکلیف نہیں تھی اس لیے وہاں پالے جاتے تھے۔ آج ہی سب کو باورچی خانے بھجوادوں گا۔ جی چاہے تو رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔

میئر : کھانا وانا ہوتا رہے گا۔ عدالت کے احاطے میں میلے کپڑے بھی دھوکر سکھانے کے لیے لٹکائے جاتے ہیں اور وہ آپ کا پیش کار جس کے بدن سے ایسی سڑاند پھوٹتی ہے کہ کمرے میں ٹھہرنا دوبھر ہوجاتا ہے، اسے نہانے کی سخت تاکید کیجیے۔ باقی بدعنوانیاں آپ سمجھیں!

جج : بدعنوانی تو کوئی نہیں حضور! ساری دنیا کو معلوم ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا۔ البتہ کچھ تحفے قبول کرلیتا ہوں۔

میئر : تحفوں کا شمار بھی رشوت ہی میں ہوسکتا ہے۔ اب آپ تحفے لینا بھی بند کردیجیے یا کم سے کم، کم کردیجیے۔

جج : جو حکم سرکار!

میئر : (سپرنٹنڈنٹ سے مخاطب ہوکر) اور ہاں، سپرنٹنڈنٹ صاحب! آپ کو اپنی اسکول کے ماسٹروں پر خاص توجہ کرنی ہوگی۔ کوئی وقت پر نہیں آتا۔ اسکول میں بچے ہلڑ مچاتے رہتے ہیں۔ اور ہاں! آپ کا وہ ایک ٹیچر! بار بار منہ کیوں بناتا ہے؟ لڑکوں کے لیے تو خیر ٹھیک ہے مگر ہر آنے جانے والا سمجھتا ہے کہ وہ اس کو منہ چڑا رہا ہے۔ میرے پاس کئی

شکایتیں آ چکی ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ : کیا بتاؤں میئر صاحب ! میں خود کئی بار اسے منع کر چکا ہوں مگر وہ کہتا ہے، میرا منہ ہی ایسا ہے۔

میئر : اور وہ تاریخ پڑھانے والا ٹیچر، اس کو تو ٹیچر ہونے کی بجائے سرکس کا رِنگ ماسٹر ہونا چاہیے تھا۔ سکندرِ اعظم کا سبق پڑھاتے ہوئے کرسی اُٹھا کر فرش پر دے ماری۔ گلاس اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ یہ کیا تُک ہے؟

سپرنٹنڈنٹ : اسے سمجھایا تو کہنے لگا، میں عملی طور پر درس دیتا ہوں۔

میئر : اور پوسٹ ماسٹر صاحب کہاں ہیں بھائی! ابھی تک ان کا پتا ہی نہیں !

(پوسٹ ماسٹر صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے)

پوسٹ ماسٹر: میئر صاحب ! بندہ حاضر ہے۔ سب لوگ جمع ہیں، کیا بات ہے؟ ابھی راستے میں پوسٹ مین ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی انسپکٹر جنرل آ رہا ہے۔

میئر : جی ہاں! خبر تو یہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں کسی نے میری شکایت حکومت کو نہ لکھ بھیجی ہو۔ آپ ذرا آنے جانے والی ڈاک پر نگاہ رکھیں۔ میرا مطلب ہے ہر ایک خط کو ذرا سا کھول کر...

پوسٹ ماسٹر: (بات کاٹ کر) میں سمجھ گیا۔ آپ اطمینان رکھیے، میئر صاحب ! احتیاط کی تو چھوڑیے، میں تو شوقیہ بھی ہر ایک خط کو کھول کر پڑھ لیتا ہوں۔

(اتنے میں دروازہ دھماکے سے کھلتا ہے۔ نمبردار فضلو آتا ہے۔ اس کے پیچھے ببلو ہے)

فضلو : غضب ہو گیا میئر صاحب ! غضب ہو گیا!

میئر : ابے فضلو ! اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟ کیا کہیں کوئی بم وم پھٹا ہے !

ببلو : (ہانپتے ہوئے) بم ہی سمجھیے میئر صاحب !

میئر : ابے ! آ گئے بھی تو کچھ بول !

(ببلو بولنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ فضلو اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے)

فضلو : میئر صاحب ! بات یہ ہے میئر صاحب کہ میں اور ببلو کھانا کھانے ہوٹل میں گئے تھے۔

ببلو : ٹھہر جا ! میں بتاتا ہوں !

میئر : ارے کم بختو ! خدا کے لیے کچھ منہ سے تو پھوٹو یا یوں ہی دھکم پیل کرتے رہو گے۔

ببلو : بھوک لگی تھی۔ ہم لوگ کچھ کھانے کے لیے جیسے ہی ہوٹل میں پہنچے، ایک خوب صورت نوجوان...

فضلو : (اس کی بات کاٹ کر) اور سادہ کپڑے پہنے ہوئے، گورا چٹا، گھنگھریالے بال اور نوک دار مونچھیں !

ببلو : ہم نے جب منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان سرکاری افسر ہے اور دو ہفتوں سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ نام اس کا مرزا تیمور شاہ ہے۔

فضلو : اور سرکار ! خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر چیز اُدھار مانگتا ہے۔

بلو : میرے اوپر تو سنتے ہی بجلی گر پڑی کہ ہو نہ ہو یہ وہی انسپکٹر جنرل ہے جو بھیس بدل کر آنے والا ہے۔

فضلو : مجھے بھی پورا یقین ہے میئر صاحب! اس کی آنکھیں اتنی تیز ہیں کہ پوچھیے مت! میں مچھلی کھا رہا تھا۔ اس نے گزرتے گزرتے کنکھیوں سے دیکھ لیا کہ میں کیا کھا رہا ہوں۔

میئر : روم نمبر بھی معلوم ہے اس کا؟

بلو : روم نمبر ۵۔ اور دو ہفتے سے وہیں جما ہوا ہے۔

میئر : میرے خدا! اب کیا ہوگا۔ ان ہی دو ہفتوں میں تو قیدیوں کو راشن نہیں ملا! لیمپ پوسٹوں کے بلب غائب ہیں۔ سڑکوں پر کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ میرے مالک! میرے اوپر رحم فرما!... میں سوچتا ہوں (سوچتے ہوئے) ٹہلتا ہوا ہوٹل کی طرف نکل جاؤں۔ میئر کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ پتا لگاؤں کہ کسی آنے جانے والے کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ بلو! کوتوال سے کہو، گاڑی تیار کرے۔

(فیڈ آؤٹ)

پس منظر میں موسیقی

(فیڈ اِن)

دوسرا منظر

(ہوٹل کا کمرہ۔ مرزا تیمور شاہ کھانا کھا رہا ہے۔ میز کے سامنے اس کا نوکر جمن ہاتھ باندھے کھڑا ہے)

تیمور شاہ : یہ کھانا دیا کم بخت ہوٹل والے نے! (پلیٹ سے ایک چھیچھڑا اُٹھا کے دِکھاتے ہوئے) یہ انسانوں کی غذا ہے یا جانوروں کا راتِب۔ چباتے چباتے ڈاڑھوں میں درد ہونے لگا۔ پتھر کنکر بھی کوئی کھا سکتا ہے۔ جاؤ! اس کے منہ پر پھینک آؤ یہ کھانا۔

جمّن : یہ بھی بڑی مشکل سے دیا ہے سرکار! پہلے پچھلا بل ادا کرو تب کھانا ملے گا، ورنہ نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ میں ابھی میئر کے پاس جا کر شکایت کرتا ہوں۔ بیٹا! اس کو جیل کی ہوا نہ کھلائی تو نام نہیں۔

تیمور شاہ : کیسا ذلیل شہر ہے یہ بھی کم بخت! ذرا سی چیز بھی ادھار دینے کے لیے آنا کانی۔ ارے! دے دیں گے پیسے۔ کیا بھاگے جا رہے ہیں؟ چور اُچکے ہیں؟

جمّن : سرکار! آخر کب تک کوئی ادھار دے آپ کو۔ دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ آپ تو ہر ایک کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ جو کچھ تھا، سب ہار چکے ہیں۔ یہ نہ بھولیے! آپ ایک معمولی کلرک ہیں۔ کوئی بادشاہ تو نہیں ہیں! اس طرح اُدھار مانگ مانگ کر کھانے سے کام نہیں چلے گا۔ اب گھر چلیے۔

تیمور شاہ : ابے، تو میرا نوکر ہے یا ہوٹل والے کا! کم بخت مجھے نصیحت کرتا ہے۔ جا، منیجر سے کہہ، تازہ کھانا بھیجے۔

جمّن : حضور! وہ کہتا ہے اور کچھ تیار نہیں۔

تیمور شاہ : جھوٹا! دغا باز! فریبی! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دو آدمی بیٹھے مزے میں مچھلی پلاؤ کھا رہے تھے اور یہ

(پیالے کی طرف اشارہ کرکے) مجھے شوربا دیا ہے یا نمک کا پانی! یہ چڑیوں کے پر اس میں تیر رہے ہیں۔

جمّن : تو لائیے، واپس کر دوں۔

تیمور شاہ : بدتمیز! یہ بھی واپس کر دے گا تو میں کیا کھاؤں گا۔ جا! جا کر منیجر سے کچھ اور بھیجنے کا کہہ۔

(فیڈ آؤٹ)

موسیقی

(فیڈ اِن)

(تیمور شاہ اسی طرح میز پر بیٹھا ہے اور ٹیبل پر رکھی تھالی سے ایک ایک چیز کو اُٹھا کر دیکھتا ہے اور رکھ دیتا ہے)

جمّن : (آتا ہے) سرکار! پلیٹ ہٹا دیجیے۔ میئر صاحب آئے ہیں اور آپ کے بارے میں کچھ پوچھ رہے ہیں۔

(جمن خود پلیٹ ہٹا دیتا ہے)

تیمور شاہ : (گھبرا کر تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے) منیجر کا بچہ! آخر نہیں مانا۔ کم بخت نے میئر سے شکایت کر ہی دی!

(اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے)

تیمور شاہ : کون؟

(دروازہ کھلتا ہے اور میئر اندر آتا ہے)

میئر : آداب عرض۔ ناچیز شہر کا میئر ہے۔ میئر کی حیثیت سے یہ دیکھنا میرا فرض ہے کہ شہر میں آنے جانے والوں کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔

تیمور شاہ : کیا عرض کروں، میئر صاحب! دراصل گھر سے میرا منی آرڈر نہیں آیا ہے۔ جیسے ہی میرا روپیا آئے گا، میں اس کم بخت کا بل ادا کر دوں گا۔ یہ ہوٹل والا بھینس کی چمڑی کی طرح سخت گوشت دیتا ہے اور شوربا مچھلی کا پانی۔ چائے سے مچھلی کی بو آتی ہے۔

میئر : (گھبرا کر) مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، حضور! بازار میں بکنے کے لیے جو گوشت آتا ہے، وہ سب عمدہ اور تندرست جانوروں کا ہوتا ہے۔ پتا نہیں، ہوٹل والا کہاں سے گوشت لاتا ہے۔ میری رائے میں آپ کسی اور جگہ رہنے کا انتظام کر لیجیے۔

تیمور شاہ : میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ آخر میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔ سیدھا وزیراعظم تک فریاد لے کر پہنچوں گا۔

میئر : (دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے) مجھ پر رحم کیجیے حضور! میں بیوی بچوں والا آدمی ہوں۔

تیمور شاہ : (لاپروائی سے) ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!

میئر : مجھے معاف فرمائیے۔ آپ جانتے ہیں، ہمیں حکومت سے گرانٹ کم ملتی ہے۔ میری تنخواہ تو چائے پانی کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔ میں رشوت نہیں لیتا۔ کبھی کبھی گھر کے لیے کوئی چیز یا سوٹ کا کپڑا کوئی دے جاتا ہے۔ میں نے کسی کو کوڑے نہیں لگائے۔ میرے دشمنوں نے یہ خبر اُڑائی ہے۔

تیمور شاہ : میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ (منہ دوسری طرف کرکے) آپ جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں۔

میئر : (جھجکتے ہوئے) حضور! چھوٹا منہ بڑی بات۔ اگر آپ کو روپے پیسے کی دِقت ہو تو بندہ حاضر ہے!

تیمور شاہ : (لا پروائی سے) شکریہ شکریہ! اگر آپ کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو دو سو روپے کا انتظام کر دیجیے تاکہ اس کم بخت ہوٹل والے کا بل چکا سکوں۔

میئر : لیجیے (پیسے دیتے ہوئے) پورے دو سو روپے ہیں۔ گننے کی ضرورت نہیں۔

تیمور شاہ : شکریہ۔ جاگیر پہنچتے ہی آپ کی رقم بھجوا دوں گا۔

میئر : کوئی بات نہیں۔ مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ ویسے اگر گستاخی نہ ہو تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس علاقے کے جاگیردار ہیں؟

تیمور شاہ : چندن واڑی کے علاقے میں میری جاگیر ہے۔ میں قصبوں میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے شہر پسند ہیں۔

میئر : آپ نے بجا فرمایا۔ شہروں کی رونقیں الگ ہی ہوتی ہیں۔ ویسے آپ یہاں آرام سے تو ہیں نا؟

تیمور شاہ : آرام! اس کمرے کو دیکھتے ہیں۔ مویشیوں کا باڑا معلوم ہوتا ہے۔ مچھر اور کھٹمل کتوں کی طرح کاٹتے بھنبھوڑتے ہیں۔ دم گھٹتا ہے میرا یہاں! ایک ہی کھڑکی ہے۔ مچھروں کے ڈر سے وہ بھی بند رکھتا ہوں۔

میئر : افوہ! ایسے معزز مہمان کو اتنی مصیبتوں کا سامنا! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟

تیمور شاہ : ٹھیک ہے۔ ضرورت پڑنے پر یاد کر لوں گا۔

میئر : اچھا...اب مجھے اجازت دیجیے۔

(میئر جاتا ہے اور جمن اندر آتا ہے)

جمّن : سرکار! بستی کے کچھ معزز لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔

تیمور شاہ : کون ہے یار! اچھا...ایک ایک کرکے بھیجو۔

(جمن جاتا ہے اور جج اندر آتا ہے)

جج : (دروازے میں کھڑے ہو کر ادب سے) حضور! میں باریابی کی اجازت چاہتا ہوں۔ ضلع عدالت کا جج ہوں۔

تیمور شاہ : آئیے، آئیے! آپ یہاں کے جج ہیں؟

جج : جی، جی! پچھلے تین برس سے مجھے اس عظیم عہدے کا مستحق سمجھا گیا ہے۔

تیمور شاہ : آپ کی مٹھی میں کیا ہے؟

جج : (گھبرا کر) جی، جی، کچھ بھی نہیں ... یہ کچھ حقیر سا نذرانہ ...!

تیمور شاہ : یہ تو نوٹ ہیں۔ بالکل کڑک نوٹ!

جج : بس وہ...

تیمور شاہ : ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ ہم نذرانہ وزرانہ نہیں لیتے۔ یہ روپے ہمیں آپ قرض کے طور پر دے دیں۔

جج : آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔ میں ہمیشہ اپنے سے بڑے افسروں کی خدمت کرنا فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے اجازت دیجیے۔

(جج جاتا ہے اور پوسٹ ماسٹر اندر آتا ہے)

پوسٹ ماسٹر: (سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے) حضور! میں اندر آ سکتا ہوں؟ میں ضلع کا پوسٹ ماسٹر ہوں۔

تیمور شاہ : آیئے، آیئے! مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔

پوسٹ ماسٹر: (گھبرا کر) جی جی، سرکار! حکم دیجیے۔

تیمور شاہ : ارے بھائی! ہماری جاگیر سے ہمیں منی آرڈر بھیجا گیا ہے۔ پندرہ دن ہوگئے، اب تک نہیں ملا۔ آخر ایک منی آرڈر آنے میں پندرہ دن کی دیری کیوں؟

پوسٹ ماسٹر: حضور! اب کیا بتاؤں؟ منی آرڈر آتے ہی پہلی فرصت میں آپ تک پہنچا دیا جائے گا۔ اگر اس وقت آپ کو کچھ دِقت ہو تو حکم کیجیے۔ خدمت کے لیے حاضر ہوں۔

تیمور شاہ : ایک تین سو روپے دے دیجیے۔ جاگیر واپس جاتے ہی لوٹا دوں گا۔

(پوسٹ ماسٹر پیسے دیتا ہے اور اُلٹے قدموں لوٹ جاتا ہے۔ تیمور شاہ نوٹوں کو ہوا میں اپنے چہرے کی طرف پنکھے کی طرح لہراتے ہوئے مسکراتا ہے۔ اتنے میں ڈائرکٹر اندر آتا ہے۔ تیمور جھٹ سے نوٹیں پیچھے چھپا لیتا ہے)

تیمور شاہ : آپ کی تعریف؟

ڈائرکٹر : جی، میں یہاں کے سرکاری اسپتالوں کا ڈائرکٹر ہوں۔ میں اپنے فرض کی انجام دہی میں ذرا کوتاہی نہیں برتتا۔ یہ پوسٹ ماسٹر البتہ مفت کی تنخواہ کھاتا ہے۔ ہفتوں ڈاک پڑی سڑتی رہتی ہے۔ جج کا بھی یہی حال ہے۔ اسے کتے اور بطخیں پالنے کا شوق ہے۔ قوم کی بھلائی کے واسطے یہ ضروری ہے کہ یہ باتیں آپ کے علم میں لائی جائیں۔

تیمور شاہ : ضرور، ضرور! مگر اس وقت نہیں۔ ہمیں جب فرصت ملے گی تو ہم بولیں گے۔ ہم اس وقت ایک مخمصے میں پھنسے ہیں۔

ڈائرکٹر : اگر بندے کو اس قابل سمجھیں تو بتائیں کیا بات ہے؟

تیمور شاہ : ارے بھائی! منی آرڈر نہیں آیا ابھی تک ہمارا۔ کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ کسی سے مانگتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔

ڈائرکٹر : کمال کرتے ہیں سرکار (پیسے دیتا ہے) یہ لیجیے چار سو روپے ہیں۔ فی الحال اپنی ضرورت پوری کیجیے۔ آگے بھی بندہ کام آتا رہے گا۔ مجھے اجازت دیجیے۔ (چلا جاتا ہے)

تیمور شاہ : (روپے چومتے ہوئے جمّن کو آواز دیتا ہے) جمّن!

جمّن : جی سرکار!

تیمور شاہ : (ٹہلتے ہوئے کچھ سوچتا ہے پھر بولتا ہے) جمن! یہاں سرکاری افسران نے ضرور کچھ نہ کچھ گول مال کر رکھا ہے اور شاید یہ لوگ مجھے حکومت کا کوئی بڑا افسر سمجھتے ہیں۔ (ہنستا ہے) کیسے اوّل درجے کے احمق ہیں!

جمّن : سرکار! اب یہاں سے جلدی بھاگنے کی تیاری کیجیے۔ اگر بھید کھل گیا تو مصیبت آ جائے گی۔

تیمور شاہ : ٹھیک ہے! تو اپنا سامان باندھنا شروع کر، میں تب تک اپنے دوست کو ایک خط لکھوں۔ یہاں کا احوال سن کر وہ بہت مزے لے گا۔

تیسرا منظر

(پہلے منظر والا کمرہ۔ تمام لوگ اسی طرح بیٹھے ہیں۔ اتنے میں پوسٹ ماسٹر گھبرایا ہوا آتا ہے)

پوسٹ ماسٹر: غضب ہو گیا دوستو! غضب ہو گیا! جس کو ہم انسپکٹر جنرل سمجھ رہے تھے، وہ تو ایک بہروپیا تھا۔

سب : کیا؟ انسپکٹر جنرل نہیں تھا؟

پوسٹ ماسٹر: جی ہاں! بالکل نہیں تھا۔ مجھے ابھی ایک خط سے پتا چلا ہے۔

میئر : کیا بکتے ہو؟ کس کا خط؟ کیسا خط؟

پوسٹ ماسٹر: ارے خود اس بہروپیے کا خط۔ اس نے اپنے دوست کو لکھا تھا، میں نے اس خط کو روک لیا کہ ذرا دیکھوں اس افسر نے ہماری کیا شکایتیں کی ہیں، میں نے خط کھول لیا۔

میئر : تم نے اتنے بڑے آدمی کا خط کھولنے کی ہمت کیسے کی؟ میں تمھیں گرفتار کروا دوں گا۔

پوسٹ ماسٹر: ذرا خط تو سن لیجیے۔ بعد میں جو کرنا ہے، کیجیے۔

سب ایک ساتھ: سناؤ، سناؤ۔ خط پڑھو۔

پوسٹ ماسٹر: (کھنکار کر خط پڑھتا ہے) میرے دوست کالو خان ابن لالو خان، میں تمھیں اپنے دلچسپ سفر کا حال لکھ رہا ہوں۔ میں سب کچھ ہار گیا تھا مگر یہاں شہر والوں نے میری شکل وصورت اور حلیے سے مجھے کوئی سرکاری افسر سمجھ لیا۔ سبھی نے مجھے خوب نذرانے پیش کیے۔ چاندی برس رہی ہے چاندی! عجیب لوگ ہیں یار! میئر تو اوّل درجے کا احمق ہے۔

میئر : جھوٹ! خط میں وہ یہ نہیں لکھ سکتا۔

پوسٹ ماسٹر: صاف لکھا تو ہے اوّل درجے کا احمق!

میئر : اب بار بار اسی بات کو دہرانے سے کیا فائدہ؟

پوسٹ ماسٹر: (خط زیرِ لب پڑھتا ہے۔ بلند آواز سے) یہاں میرے بارے میں گستاخی کی ہے۔

میئر : زور سے پڑھیے۔ زور سے پڑھیے۔

ڈائرکٹر : (اس کے ہاتھ سے خط لے کر) لائیے، میں پڑھتا ہوں (پڑھنا شروع کرتا ہے) پوسٹ ماسٹر عین مین ہمارے دفتر کے چنو چوکیدار سے ملتا جلتا ہے۔ شکل بالکل گھوگو جیسی (ڈائرکٹر رُک جاتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ: (اس سے خط لیتے ہوئے) لائیے، میں پڑھتا ہوں۔ (پڑھتا ہے) ڈائرکٹر اسپتال بالکل چُغد ہے۔ (اُنگلی سے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس کی بالائی عمارت بالکل خالی ہے۔ (سب ہنستے ہیں)

ڈائرکٹر : (اس سے خط لیتے ہوئے) یہ کیا مذاق ہے؟ لاؤ، میں پڑھتا ہوں۔ (پڑھتا ہے) سپرنٹنڈنٹ تعلیمات ایسا معطر انسان کہ بدن سے پیاز کی خوشبو آتی ہے اور جج ...

جج : (اس کے ہاتھ سے خط لے کر) اور جج پر لے سرے کا بدمعاش اور چار سو بیس ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ لوگ بے وقوفی کی حد تک سیدھے سادے ہیں۔ تم ان کرداروں کو اپنی کہانی میں شامل کرنا۔ تمھارا... مرزا تیمور شاہ۔

میئر : بدمعاش! چور! دھوکے باز کہیں کا! ارے کوئی ہے، اس بدمعاش کو پکڑ لاؤ۔ میں اسے جان سے مار دوں گا۔

پوسٹ ماسٹر: اسے پکڑنا تو اب مشکل ہے۔ وہ تو تیز رفتار گاڑی میں کب کا فرار ہو چکا۔

میئر : افوہ! مجھے تو غارت کر گیا، کم بخت!

پوسٹ ماسٹر: میرے تو تین سو روپے ڈوب گئے۔

میئر : مگر یہ بتاؤ، سب سے پہلے ہمیں کس نے اطلاع دی اس کے بارے میں؟ کہاں ہیں ببلو اور فضلو؟

فضلو : (ایک کونے سے بولتے ہوئے) میں نے نہیں سر! ببلو نے اطلاع دی تھی۔

ببلو : جی نہیں میئر صاحب۔ فضلو نے بتایا تھا آپ کو۔

میئر : بکواس بند کرو۔

(اتنے میں دروازہ کھلتا ہے۔ دروازے میں بندوق بردار ایک سپاہی کھڑا ہے۔ سب حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہیں)

سپاہی : (رعب دار آواز میں) مرکزی حکومت سے بھیجے ہوئے سرکاری انسپکٹر جنرل تشریف لے آئے ہیں اور ہوٹل میں ٹھہرے ہیں اور آپ سب کو انھوں نے فوراً طلب کیا ہے۔

(سب حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

معانی و اشارات

پیش کار	-	محرّر، منشی
بدعنوانی	-	بد دیانتی، ہیرا پھیری، رشوت خوری
سر بسر	-	سراسر، پوری طرح
عین مین	-	ہو بہو
گھونگو	-	بے وقوف
مخمصہ	-	اُلجھن

مشقی سرگرمیاں

* مناسب جملوں سے خاکہ مکمل کیجیے۔

میئر کے مشورے
- ....
- ....
- ....
- ....

* فضلو اور ببلو کے مکالموں کی روشنی میں شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

تیمور شاہ کا حلیہ

* تیمور شاہ نے اپنے دوست کالو خان ابن لالو خان کو جو خط لکھا اس میں ان عہدیداروں کو جس طرح یاد کیا ہے، وہ جملے لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

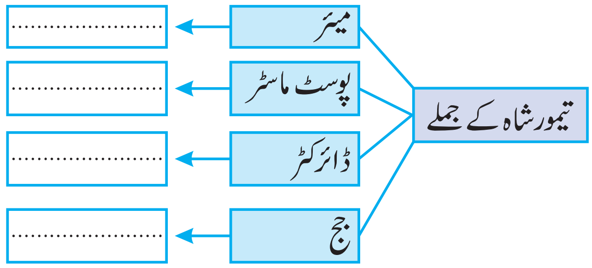

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ انسپکٹر جنرل سے میئر کے خوف زدہ ہونے کی وجہ لکھیے۔

۲۔ جج کی لاپروائی کو بیان کیجیے۔

۳۔ پوسٹ ماسٹر کے مکالمے کی روشنی میں پوسٹ ماسٹر کے کردار کو واضح کیجیے۔

۴۔ مرزا تیمور شاہ کی شخصیت پر نوٹ لکھیے۔

۵۔ ڈرامے کا مرکزی خیال واضح کیجیے۔

۶۔ ڈرامے کے پس منظر میں ’بڑی آفت‘ کو واضح کیجیے۔

۷۔ خیراتی اسپتال کے ڈائرکٹر کو میئر نے جو مشورے دیے، انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۸۔ جج کے کمرے کی لفظی تصویر کشی کیجیے۔

۹۔ ”میں رشوت نہیں لیتا۔ البتہ کچھ تحفے قبول کر لیتا ہوں۔“ یہ جملہ کہنے والے کے حوالے سے اس پر اپنی رائے لکھیے۔

۱۰۔ اسکول کے ماسٹروں سے متعلق میئر کے بیان پر اتفاق یا اختلاف میں اپنا مشاہدہ قلم بند کیجیے۔

۱۱۔ اُن جملوں کو نقل کیجیے جن سے پتا چلتا ہے کہ میئر بھی بدعنوان ہے۔

۱۲۔ ڈرامے کے مختلف کرداروں پر تیمور شاہ کے تبصروں کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۱۳۔ تیمور شاہ کے پاس جمع رقم اور دینے والوں کے نام لکھیے۔

۱۴۔ ذیل کے کرداروں پر مختصر نوٹ قلم بند کیجیے۔

(i) میئر (ii) تیمور شاہ

(iii) ڈائرکٹر (iv) پوسٹ ماسٹر

۱۵۔ ڈرامے کے سب سے زیادہ بدعنوان کردار پر روشنی ڈالیے اور اپنے انتخاب کا ثبوت تحریر کیجیے۔

۱۶۔ ڈرامے کے تینوں منظر کے اہم نکات قلم بند کیجیے۔

* ڈراما ’انسپکٹر جنرل‘ کے بارے میں اپنی ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

* سرکاری محکموں کے افسران کی لاپروائی اور غیر ذمہ داری پر اپنی رائے لکھیے۔

* ’سو کام نکلتے ہیں خوشامد سے جہاں میں‘ اس عنوان پر مضمون قلم بند کیجیے۔

* رات وات/کتاب وتاب - ان مثالوں میں دوسرا لفظ بے معنی ہے لیکن یہ پہلے بامعنی لفظ کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ ہماری زبان میں ایسے لفظوں کا بہت استعمال ہوتا ہے۔ ان مثالوں کو ’تابع مہمل‘ کہتے ہیں۔ ایسی مزید مثالیں بنائیے۔

اضافی معلومات

نکولائی گوگول : روسی زبان کے مشہور ادیب نکولائی گوگول ۳۱؍ مارچ ۱۸۰۹ء کو روس میں پیدا ہوئے۔ جب وہ پندرہ برس کے تھے، ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ گوگول نے اپنی ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی میں ڈرامے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ ۱۸۲۸ء میں تعلیم ختم کر کے وہ سینٹ پیٹرس برگ چلے آئے اور ایک شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں قدم جمانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہانیاں اور ڈرامے تحریر کیے۔ گوگول کی ان تخلیقات میں اُبھرنے والا طنز منفرد اور بے مثال تھا۔ ۱۸۳۴ء میں انھوں نے تاریخ کے ایک پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور روم جیسے ملکوں کا سفر کیا اور مختلف زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا۔ ۴؍ مارچ ۱۸۵۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔

گوگول روسی زبان کے ایک عظیم ادیب اور ڈراما نگار کی حیثیت سے عالمی پیمانے پر مشہور ہیں۔ انھوں نے سماجی ناہمواریوں اور ظلم و استحصال کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کا ڈراما ’انسپکٹر جنرل‘ اس کی بہترین مثال ہے۔ گوگول نے اپنی تخلیقات میں حقیقت پسندی اور سماجی تنقید کے ساتھ طنزیہ پیرایہ اختیار کیا۔ اسی طرزِ تحریر اور طرزِ فکر کو مختلف زبانوں میں عالمی پیمانے پر اپنایا گیا۔ اوورکوٹ، ڈائری آف اے میڈ مین اور دَ گورنمنٹ انسپکٹر ان کی مشہور تخلیقات ہیں۔

۷ مولانا محمد علی جوہر

مولانا عبدالماجد دریابادی

پیشِ درس

خاکہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں کسی شخص کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسے مرقع یا قلمی تصویر بھی کہتے ہیں۔ لفظ 'خاکہ' انگریزی لفظ sketch کا ترجمہ ہے۔ خاکے میں جس شخص کی تصویر کشی کی جاتی ہے، اس کے خیالات و افکار، سیرت و کردار اور عادات و اطوار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ خاکے کا مقصد کسی شخص کی ظاہری اور باطنی خصوصیات کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ اس کی انفرادیت نمایاں ہوجائے۔ خاکہ نگاری، سوانح نگاری سے مختلف ہے۔ اس میں سوانح حیات کی طرح تمام حالات و واقعات بیان کرنا ضروری نہیں۔

خاکہ نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ جس شخص کا خاکہ لکھ رہا ہے، اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ مردم شناسی، ہمدردی اور انسانی نفسیات کا علم خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے۔ حقیقی شخصیات کے علاوہ خیالی شخصیات بھی خاکے کا موضوع ہوسکتی ہیں۔ ادبی خاکوں میں طنز و مزاح، لطفِ زبان اور انشا پردازی کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔

اُردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش تذکروں میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' میں اس کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ خاکہ نگاری کو بیسویں صدی میں زیادہ فروغ ملا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، رشید احمد صدیقی، محمد طفیل، سعادت حسن منٹو، مجتبیٰ حسین وغیرہ نے اس فن کی روایت کو پروان چڑھایا۔

جان پہچان

عبدالماجد دریابادی ۱۸۹۲ء میں دریاباد (ضلع بارہ بنکی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے انھیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے لکھنؤ کے کیننگ کالج سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ ان کی خاص دلچسپی فلسفہ اور نفسیات میں تھی۔ ان کا بڑا کام قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ 'تفسیرِ ماجدی، تمدنِ اسلام، محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق، مکتوباتِ ماجدی' اور 'انشائے ماجد' وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

عبدالماجد دریابادی ایک نامور صحافی بھی تھے۔ 'سچ، صدق' اور 'صدقِ جدید' کے نام سے انھوں نے مختلف اوقات میں تین اخبارات جاری کیے۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کی نثر میں علمیت کے ساتھ ساتھ شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ اپنے منفرد اندازِ تحریر کی وجہ سے عبدالماجد دریابادی کا شمار اُردو کے صاحبِ طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔

نومبر کا مہینہ اور شروع کی تاریخیں ۱۹۲۶ء۔ ایک خوش گوار شام کو لکھنؤ میل کان پور سے چھوٹنے کے قریب ہے کہ دو شخص ندوہ کے سالانہ اجلاس سے بھاگم بھاگ موٹر پر اسٹیشن پہنچتے ہیں اور جھٹ ٹکٹ لے لیا، اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹرز کی مدد سے پھینک پھانک ایک درجے میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز بمبئی کے پہلے ہی سے بیٹھے چلے آتے ہیں۔ دونوں نو وارد کھدر پوش عبا پوش۔ ایک وجیہہ خوش قطع، دوسرا کریہہ بدقوارہ، دونوں ڈاڑھی دار۔ ان نو واردوں کو دیکھ کر انگریز کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں کہ یہ سمجھے ہوں کہ بلاٹکٹ گھس آئے ہیں۔ خوش قطع نو وارد اسی برتھ پر بیٹھ گیا جس پر صاحب بہادر جمے ہوئے تھے۔ دوسرے نے مقابل کی نشست اختیار کی۔ گاڑی چلی۔ گنگا کا پل بات کرتے کرتے میں آگیا۔ صاحب بہادر نے دونوں کی طرف دیکھ کر چھیڑ کی۔ مسکراہٹ سے ہنسے اور منہ بنا کر بولے: ''This is mother Ganges'' (یہی گنگا مائی ہے) طنز اور زور لفظ mother پر تھا۔ پاس کے

کھدر پوش نے معاً چائے کی پیالی منہ سے ہٹا انگریزی زبان اور انگریز کے لہجے میں کہا، ''یہ مائی اور موسی اور خالہ کیا معنی؟ اچھا آپ یہ رشتہ لیتے ہیں۔ میں تو جانتا تھا کہ دریا بس دریا ہے۔'' صاحب یہ تڑاق سے جواب پا کر سناٹے میں آ گئے۔ یہ برجستہ جواب دینے والا تھا محمد علی اور اس کا ساتھی یا 'تابع مہمل' آپ کا یہ خادم۔ صاحب کو یہ گمان نہ تھا۔ یہ چہرے پر ڈاڑھی اور سر پر پٹھے رکھے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ بھی انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائیکہ انگریزی میں جواب دے سکے اور دیا بھی شستہ اور برجستہ! چپ سادھ کر رہ گئے۔ اس کے بعد ادھر سے منہ پھیر گفتگو اپنے پرانے رفیقِ سفر سے شروع کی۔ ولایت سے کرکٹ کی مشہور و معروف ٹیم 'ایم سی سی' نئی نئی ہندوستان آئی تھی۔ موضوعِ گفتگو میں ٹیم تھی اور اس کے کھیل اور مختلف میچ، محمد علی تھوڑی دیر تو چپ ہنستے رہے، اس کے بعد نہ رہا گیا۔ بولے، دخل در معقولات معاف۔ کھلاڑیوں پر آپ جو رائے زنی کر رہے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ فلاں کھلاڑی میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی۔ اور لگے اس کی تفصیل بیان کرنے اور صاحب تھے کہ بھونچکے بنے ایک ملّا نما انسان کی زبان سے یہ ماہرانہ معلومات سن رہے تھے۔ محمد علی اب نفسِ کرکٹ پر آ گئے اور لگے انگلستانی کرکٹ کی تاریخ بیان کرنے۔ لندن میں اور آکسفورڈ میں فلاں سنہ میں بولنگ کے یہ طریقے رائج تھے، گیند کی پچ یوں پڑتی تھی، بیٹنگ یوں کی جاتی تھی، فلاں زمانے میں یہ تبدیلیاں ہوئیں، ہندوستان اور انگلستان دونوں کی زمینوں میں یہ فرق ہے، وغیرہ وغیرہ۔ بولنے والا اب گفتگو نہیں کر رہا تھا گویا کرکٹ پر انسائیکلوپیڈیا کا آرٹیکل سنا رہا تھا۔ آخر میں صاحب بولے، ''آپ کو کرکٹ کے متعلق بڑی معلومات ہیں۔'' محمد علی نے کہا، ''مجھی کو نہیں بلکہ ہر علی گڑھی کو ایسی ہی معلومات ہوتی ہیں۔'' وہ بولا، ''کیا آپ علی گڑھ میں کپتان رہ چکے ہیں؟'' یہ بولے، ''میں نہیں تھا، big brother تھے۔'' شوکت صاحب کے لیے یہ big brother کی تلمیح محمد علی ہی نے اپنے کانگریس کے خطبۂ صدارت کے وقت سے چلا دی تھی۔ وہ انگریز اس پر بے ساختہ بولا، "You talk like Mohammed Ali." ''یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں۔

یہ بولے: "I am Ali." زبان کیسی، میں خود ہی محمد علی ہوں۔'' صاحب بہادر کی حیرت اب دیکھنے کے قابل تھی، آنکھیں پھاڑ کر بولے: "Really one of the two Ali Brothers." ''یعنی وہی محمد علی جو علی برادران ہیں؟ انھوں نے چمک کر جواب دیا، "Yes, the younger and the more sharp-tongued of the two." ''جی ہاں، انھی میں سے چھوٹا اور زیادہ تیز زبان بھائی۔'' صاحب کو اپنی حیرت کے رفع کرنے میں اب کی دیر سیکنڈوں کی نہیں منٹوں کی لگی۔ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ بار بار پہلو بدل رہے تھے اور نظر محمد علی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھی۔ محمد علی نے اب ہنسنا اور لطف لینا شروع کیا۔ بولے، ''اتنا گھبرائیے نہیں۔ کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ علی برادران جس انگریز کو دیکھ پاتے ہیں اس پر جست کر بیٹھتے ہیں۔ دیکھ لیجیے، میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں۔ حملے کا خیال ہی دل میں نہ لائیے۔'' ایک مشہور انگریزی روزنامہ اس وقت علی برادران کا شدید مخالف تھا۔ صاحب نے اس کا تازہ پرچہ آگے بڑھایا۔ محمد علی نے پرچے کو چھوا تک نہیں، البتہ اس کے ایڈیٹر پر خوب خوب فقرے کسے۔ داستان خاصی طویل ہوگئی اور ایک ہی قصے کو کہاں تک سنے جائیے گا۔

ایک بار محمد علی انگلستان میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ وقت کل پانچ منٹ کا ملا۔ انھوں نے تمہید یوں اُٹھائی کہ میں چھے ہزار میل کے فاصلے سے تیس کروڑ آبادی کی نمائندگی کرنے آیا ہوں۔ اب آپ خود حساب لگائیے کہ ایک ایک منٹ نہیں ایک ایک سیکنڈ بلکہ ہر سیکنڈ کی کسر میں مجھے کتنی ترجمانی کا وقت ملتا ہے۔ حاضرین لوٹ گئے اور آوازیں آنے لگیں کہ آپ کہے جائیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

مولانا پانچ منٹ کی جگہ پورے بیس منٹ تک بولے۔

ایک اور منظر اسی سفر میں لندن میں کسی جگہ مولانا تقریر میں بیان یہ کررہے تھے کہ برلن اور سمرنا تو چاہے حضور چھوڑ ہی دیں۔ قسطنطنیہ کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جس سے ہماری تمام قدیم ملّی روایات وابستہ ہیں۔ جلسہ مخالفین سے بھرا ہوا تھا۔ انھی میں سے ایک تاریخ کے فاضل نے کھٹ سے سوال کردیا کہ یہ تو بتائیے کہ قسطنطنیہ کب سے آپ کے قبضے میں ہے؟ کوئی معمولی مقرر ہوتا تو گھبرا جاتا۔ مولانا نے اپنے سلسلۂ کلام میں ذرا فرق آنے دیے بغیر جواب دیا، ''سنہ تو یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے قبضے میں ہندوستان ہے اس سے تگنی مدت سے ہمارے قبضے میں قسطنطنیہ ہے۔'' جلسے میں قہقہہ پڑا اور فاضلِ تاریخ مدھم پڑ گئے۔ محمد علی کی قوتِ حافظہ بلا کی تھی اور ذہانت اور برجستگی تو کہنا چاہیے، ان پر ختم تھی۔ سارے لطائف وظرائف کوئی لکھنے پر آئے تو کتاب کیا معنی، دفتر کا دفتر تیار ہوجائے اور سب لکھ بھی کون سکتا ہے، کس کو سب یادرہ سکتے تھے۔ مناسبتِ لفظی کے بادشاہ تھے۔ بات میں بات پیدا کردینا انھی کا حصہ تھا۔ ذیابیطس میں مدت سے مبتلا تھے۔ ۱۹۲۸ء میں یہ حال سن سنا، مہاراجا اَلوَر کو کچھ رحم سا آ گیا، ہزار ہا روپے دیے۔ علاج کے لیے یورپ بھجوایا۔ اس سے قبل اَلوَر مدعو کیے گئے۔ مہاراجا انگریزی کے تو ادیب تھے ہی، فارسی کے بھی شاعر تھے اور وحشیؔ تخلص کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت اپنا دیوان پیش کیا اور اس پر اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی:

''To my Moulana from his Wehshi.'' اپنے مولانا کی خدمت میں ان کے وحشی کا ہدیہ۔ مولانا نے اپنا تصنیف کیا ہوا جامعہ کا نصابِ تعلیم نکالا تو اس پر یہ عبارت لکھ کر پیش کردیا:

''From a bogus Maulana to a real Maharaja.'' یعنی ''ایک نام کے مولانا کی طرف سے کام کے مہاراجا کی خدمت میں ہدیہ۔'' حدِ ذہانت یہ تھی کہ غصّے کی حالت میں بھی فقرہ چست کرنے سے نہ چوٗکتے۔

خلافت کمیٹی کے جلسوں میں گرما گرم نوک جھونک کے وقت بارہا یہ منظر دیکھنے میں آتا۔ ایک بار کیا ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس دلّی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہورہا تھا۔ محمد علی بیمار ومعذور لیٹے ہوئے تھے۔ مخالف صف میں ایک اور مشہور لیڈر ایک روزنامے کے مالک، مع اپنے صاحبزادے کے، اور اسی روزنامے کے ایڈیٹر بھی تشریف فرما تھے۔ بحث نے طول کھینچا اور یہ تینوں صاحب ناخوش اور جلسے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد علی برجستہ پکار اُٹھے، ''غضب ہوگیا۔ باپ، بیٹے، روح القدس تینوں خفا ہوگئے۔'' ذہانت کے لیے بڑا میدان شعروشاعری کا تھا۔ محمد علی خود بھی شاعر تھے اور شاعری کی دنیا میں نام تھا جوہرؔ۔ سب سے بڑے بھائی کا تخلص تھا گوہرؔ۔ فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت بے تخلص رہے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تخلص تجویز کرتا ہوں، اسی وزن اور قافیے میں 'شوہر'۔ شیفتہؔ کی مشہور غزل؛ 'نادانیوں میں ہم، پشیمانیوں میں ہم' پر غزل کہنے بیٹھے تو مطلع فرماتے ہیں:

کیوں شہر چھوڑ ، جائیں گے دہقانیوں میں ہم
مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

خود بیجاپور جیل میں قید تھے۔ لحیم شحیم بڑے بھائی راج کوٹ جیل میں پڑے پڑے دبلے ہوگئے تھے۔ ان کی زبان سے ادا کیا ہے:

شوکتؔ یہ کہتے ہیں ، وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ابھی گو جوان ہی تھے کہ علی گڑھ کالج میں طالب علموں نے زبردست اسٹرائیک کی۔عین اسی زمانے میں سرسیّد کی برسی کا دن آیا اور اسی دن اولڈ بوائز نے بھی اپنا سالانہ جلسہ منانا طے کیا۔محمد علی آتے ہیں اور ایک منظوم عریضہ سرسیّد کی روح کی خدمت میں اپنے ہی جیسے بڑھے لڑکوں کو سنا کر پیش کرتے ہیں۔

لڑکا کوئی نہ تھا۔لڑکیاں چار تھیں۔ایک سے ایک بڑھ کر چہیتی اور لاڈلی۔۱۹۲۳ء میں ابھی جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی آمنہ بی، جوان شادی شدہ دق میں مبتلا ہوئیں اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔مجبور و مقید چاہنے والے باپ پر کیا گزری ہوگی جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا،خود اپنی نازوں کی پالی نورِنظر کے لیے کیسا کیسا بلبلایا ہوگا،تلملایا ہوگا، پھڑ پھڑایا ہوگا۔کچھ زور نہ چلا تو عالمِ خیال ہی میں بیٹی سے کہنے لگے :

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں

تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

ایک نہیں ، دو جوان پہاڑ سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اُٹھایا،قبر میں سلایا۔دل ان ذاتی صدموں کی تاب کہاں لاتا۔قومی صدمے ان سے بڑھ چڑھ کر۔ جیے اس کے بعد چھے سات سال۔محمد علی کو قوم و ملت کے پیشوا، ملک کے سردار کی حیثیت سے لاکھوں نے جانا،کروڑوں نے پہچانا۔ان سب سے زیادہ خوش نصیب وہ تھے جنھوں نے محمد علی کو قریب سے بہ حیثیت دوست کے،عزیز کے، انسان کے دیکھا۔کیا بیان کیا جائے،کیسی نعمت انھیں ہاتھ آ گئی تھی۔ایک صداقتِ مجسم، ایک پیکرِ اخلاص، جرأت، دیانت، ہمت، بے خوفی کا مجسمہ۔ پاس والے جتنے قریب سے دیکھتے گئے،حضرت جوہؔر کے جواہر اور زیادہ کھلتے گئے،نکھرتے گئے۔مشہور تمام تر ایک بے باک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تھے لیکن ان کے لغت میں ڈپلومیسی کا لفظ ہی نہ تھا۔ظاہر باطن یکساں۔جو خیال جس کے متعلق دماغ میں آ گیا، زبان سے ادا ہو کر رہا۔جو بات دل میں آئی منہ پر آئے بغیر نہ رہی۔کہتے ہیں کہ اہلِ سیاست وہ ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔محمد علی اس معنی میں اہلِ سیاست قطعاً نہ تھے۔ایک بار نہ تھے، ہزار بار نہ تھے۔محبت کے پتلے تھے، مہر واُلفت کے بندے تھے، بیوی بچوں کے عاشقِ زار، دوستوں، رفیقوں، ساتھیوں پر سو جان سے نثار اور دور کا واسطہ رکھنے والوں کے مونس وغم گسار۔کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے۔میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔مسلمانوں کے اور عالمِ اسلامی کے ساتھ شیفتگی کی یہ کیفیت کہ افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے اور اس کی چبھن یہاں ہندوستان میں محمد علی محسوس کریں۔''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' یہ مصرعہ بارہا سننے میں آیا تھا اور دل ہمیشہ اسے نری شاعری سمجھا۔محمد علی کی زندگی نے سمجھا دیا کہ شاعری کبھی حقیقتِ مجسم بن جاتی ہے۔لوگوں کو مہمان بنانے، کھانا کھلانے، خاطریں کرنے کے حریص تھے۔زندگی کا ثبوت بہت سے زندوں سے بڑھ کر دیتے رہے لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ نہ پنپنا تھا نہ پنپے۔ہنستے ہیں، بولتے ہیں، گرجتے ہیں لیکن اندر ہی اندر جلتے گئے، پھکتے گئے، پھکتے گئے۔مذہب کے دیوانے تھے۔پروردگار سے ایسا عشق کم دیکھنے میں آیا ہے۔قرآن پڑھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔جب اس مضمون کی آیتیں پڑھتے کہ منافقوں کو دیکھو کہ بجائے اللہ کے یہ اللہ کے بندوں سے ڈرتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

۴ اور ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کی درمیانی شب میں مشیتِ الٰہی نے مسلمانوں سے یہ نعمت واپس طلب کر لی۔شاید اس لیے کہ محمد علی

کے اہلِ وطن، اہلِ ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ جان لندن میں جان آفریں کے سپرد کی۔ آخری آرام گاہ کے لیے جگہ کہاں ملی! سرزمینِ مقدس میں، قبلۂ اوّل کے قریب جامعِ عمرؓ سے متصل۔

ماتم و شیون کی صدائیں ہندوستان بھر میں اور سارے عالمِ اسلامی میں اس زور شور سے اُٹھیں اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

''ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے'' انھی کا مصرعہ ہے اور یہ بھی تو خود ہی فرما گئے تھے:

ہے رشک ایک خَلق کو جوہؔر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

معانی و اشارات

عبا پوش	-	جبہ پہنے ہوئے
وجیہہ	-	خوش وضع، خوب صورت
کریہہ	-	بدشکل
بدقوارہ	-	بدصورت
پٹھے (پٹے)	-	مرد کے سر کے دونوں طرف کے بال
چہ جائیکہ	-	مراد یہ تو ممکن ہی نہیں
شستہ	-	صاف ستھرا
برجستہ	-	بے ساختہ
ولایت	-	بیرون ملک
دخل در معقولات	-	معقول باتوں میں دخل
رائے زنی	-	کسی امر کے بارے میں اظہارِ رائے
سیکنڈ کی کسر	-	ایک لمحے سے بھی کم عرصہ
کسر	-	ٹوٹا ہوا حصہ
لطائف و ظرائف	-	مزے دار باتیں
ڈپلومیسی (diplomacy)	-	سیاسی چال بازی، شاطری
شیوَن	-	رونا، فریاد کرنا

مشقی سرگرمیاں

* ریل میں بھاگم بھاگ داخل ہونے والے افراد کے حلیے کا شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

افراد کا حلیہ

	افراد کا حلیہ	

* محمد علی جوہؔر کی صفات کا رواں خاکہ مکمل کیجیے۔

صفات

↓ ....
↓ ....
↓ ....
↓ ....
↓ ....
↓ ....

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ ریل کے سفر میں محمد علی جوہؔر کی برجستگی کے واقعے کو اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۲۔ محمد علی جوہؔر کی کرکٹ سے متعلق معلومات کو تفصیل سے لکھیے۔

۳۔ ''جی ہاں! انھی میں سے چھوٹا اور زیادہ تیز زبان بھائی۔'' محمد علی جوہؔر کے اس جملے سے متعلق واقعہ تحریر کیجیے۔

۴۔ ''مولانا محمد علی جوہؔر مناسبتِ لفظی کے بادشاہ تھے۔'' متن کے حوالے سے اس جملے سے متعلق معلومات لکھیے۔

۵۔ تحریکِ آزادی میں مولانا محمد علی جوہؔر کے کردار کو واضح کیجیے۔

۶۔ مولانا محمد علی جوہؔر کے انتقال و تدفین کے بارے میں لکھیے۔

۷۔ ریل کے سفر کی روشنی میں انگریزوں کے نسلی امتیاز پر اپنے ردِّعمل کا اظہار کیجیے۔

۸۔ مہاراجا الوَر اور محمد علی جوہؔر کی انگریزی عبارتوں پر اپنے تاثرات تحریر کیجیے۔

۹۔ 'تحریکِ آزادی اور خلافت تحریک' اس عنوان پر پچیس تا تیس سطروں کا مضمون لکھیے۔

سرگرمی/منصوبہ

* اپنی پسندیدہ شخصیت کا خاکہ لکھیے۔
* رشید احمد صدیقی کی کتاب 'گنج ہائے گراں مایہ' سے محمد علی جوہؔر پر لکھا خاکہ حاصل کر کے پڑھیے۔
* علی برادران اور خلافت تحریک سے متعلق معلوماتی منصوبہ تیار کیجیے۔
* جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے ساتھ ریل میں پیش آنے والا نسلی امتیاز کا واقعہ بیان کیجیے۔

محمد علی جوہؔر کے چند اشعار

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

☆

ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں

☆

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

☆

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یوں جوہؔر اس دیس کی برساتیں

☆

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ زمانے سے خفا میرے لیے ہے

☆

ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ سودائی ہے
اب مرا ہوش میں آنا تری رسوائی ہے

☆

شکوہ صیاد کا بے جا ہے قفس میں بلبل
یاں تجھے آپ ترا طرزِ فغاں لایا ہے

☆

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

☆

۸ نقاب اور چہرے

سلمیٰ صدّیقی

پیش درس

'رپورتاژ' غیر رسمی، غیر صحافیانہ اور بے تکلف اسلوب میں لکھی گئی کسی واقعے یا تقریب کی روداد ہے جس میں بیانیہ اور انشا پردازی کو بیک وقت بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اس میں تخیل کی کارفرمائی، مکالموں کے فطری انداز اور انشائیے کی غیر متفکرانہ آزادی سے خوب کام لیا جاتا ہے۔ محمود ہاشمی کی تحریر 'کشمیر اُداس ہے' رپورتاژ کی عمدہ مثال ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے: ''رپورتاژ افسانے، سفرنامے اور روداد کی ملی جلی سی ایک چیز ہے لیکن ان سب سے زیادہ مزیدار اور دلکش۔'' ترقی پسند ادیبوں میں سب سے پہلے سجاد ظہیر نے 'یادیں' کے عنوان سے اپنے تاثرات لکھے تھے۔ اس میں حقیقت افسانے سے زیادہ دلکش ہوگئی ہے۔ جب کرشن چندر نے اپنا مشہور رپورتاژ 'پودے' لکھا، اس صنف کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ کرشن چندر کا دوسرا رپورتاژ بھی بہت مقبول ہوا جس کا عنوان ہے 'جب صبح ہوتی ہے۔' ابراہیم جلیس کا رپورتاژ 'شہر' بمبئی کی زندگی کا مرقع ہے لیکن 'دو ملک ایک کہانی' ان کا زیادہ مؤثر رپورتاژ ہے۔ فکر تونسوی کا 'چھٹا دریا' اور تاجور سامری کا 'جب بندھن ٹوٹے' فسادات پر لکھے گئے کامیاب رپورتاژ ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک، قرۃ العین حیدر، ممتاز حسین، خواجہ احمد عباس، عاتق شاہ وغیرہ نے بھی اپنے سفرنامے اسی رنگ میں لکھے ہیں۔

جان پہچان

سلمیٰ صدیقی ۱۸؍جون ۱۹۳۱ء کو بنارس میں پیدا ہوئیں۔ وہ اُردو کے نامور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی بیٹی تھیں۔ ان کا گھریلو ماحول علمی و ادبی تھا۔ انھیں بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ امتیازی نمبرات سے ایم۔اے کرنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بہ حیثیت لیکچرار اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ وہ ۱۹۶۲ء میں ممبئی آگئیں اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ سلمیٰ صدیقی نے عورتوں کے مسائل سے متعلق اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں افسانے لکھے اور انھوں نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی تحریر کیے۔ انھیں رپورتاژ نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'مٹی کا چراغ' اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'سکندر نامہ' شائع ہوا ہے۔ ۱۳؍فروری ۲۰۱۷ء کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔

ہمارے یہاں اُس شام بمبئی کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک محفل منعقد ہونے والی تھی۔ ادیبوں اور شاعروں سے ادبی مجلسوں اور مشاعروں میں ملاقات کیجیے تو مزا نہیں آتا جو لطف ان کو گھریلو ماحول اور بے تکلف محفل میں دیکھ کے آتا ہے۔ دراصل زندگی کے ہر شعبے میں افراد کے چہروں پر جو ایک ملمع یا ایک نقاب ہوتا ہے وہ گھریلو محفلوں میں ایسے انجانے طریقے سے آہستہ آہستہ اُتر جاتا ہے کہ انسان کے چہرے کے صحیح خدوخال دیکھنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔

دھیرے دھیرے سورج ڈھلنے لگا، آہستہ آہستہ ہوا میں خنکی رچنے لگی اور ہولے ہولے شام اپنے قدم بڑھانے لگی۔ میں نے بیٹھنے کے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ کھانے کی میز کا جائزہ لیا۔ پھولوں کی ڈنڈیاں ایک بار پھر گلدانوں میں سنواریں، کرسیوں پر نظر نہ آنے والے گرد و غبار کو ایک بار پھر صاف کردیا اور خود بڑے آئینے میں اپنا بھرپور جائزہ لیا۔ چہرے پر ایک بڑی پرخلوص مسکراہٹ پیدا کی اور بیٹھنے کے کمرے میں سامنے کی کرسی پر ایک خاص زاویے سے بیٹھ کر باہر سڑک کی جانب دیکھنے لگی یعنی مہمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگی لیکن مہمان صرف مہمان ہی تو نہ تھے جو وقت پر آجاتے۔ وہ ادیب بھی تو تھے جو اگر وقت پر آجاتے تو ان کے ادب پر حرف

نہ آ جاتا؟ اچانک ایک نہایت لمبی چوڑی امپالا پھاٹک پر آ کر رُکی اور میں مہمان کے استقبال کے لیے جلدی سے پھاٹک کی طرف بھاگی۔ میرا خیال غلط نکلا۔ وہ کسی فلمی ستارے کی گاڑی تھی اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ دَم لینے کو اُس نے میرے گھر کے سامنے کی سڑک کا انتخاب کیا اور یوں کچھ دیر کو میرے گھر کے سامنے بھی ننگے بھوکے بچوں اور نوجوان خوش لباس لڑکیوں لڑکوں کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ امپالا روانہ ہوگئی۔ مجمع چھٹ گیا اور میں پھر ادیبوں کے انتظار میں ٹہلنے لگی۔ چائے کا پانی نئی شاعری کی طرح اُبل اُبل کر اور تجریدی کہانی کی طرح پیچ و تاب کھا کر کسی خشک تنقیدی مضمون کی طرح ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں بار بار کچن میں جاتی تھی۔ اُس بلّی کا خوف مجھے کھائے جا رہا تھا جو اکثر اپنے اور میرے پرانے مراسم کی بنا پر بار بار بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے کھانے کی چیزوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھی۔

ساڑھے چھے بجے کے قریب جب میں چوتھی بار کچن میں گئی تو بیٹھنے کے کمرے سے اچانک کئی آوازیں آنے لگیں۔ سب لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے اور ہلکی ہلکی ہنسی بھی گونج رہی تھی۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا، سامنے ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی تھے، ساتھ پشپا بھارتی بھی نظر آئیں۔ اسی وقت مجروحؔ سلطان پوری اور بیگم فردوس مجروح آگئیں جنھیں سردارؔ جعفری ہمیشہ فردوس برروئے زمین کہتے ہیں۔ مجروحؔ صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ سردارؔ جعفری بے حد شفاف کُرتے پاجامے اور جیکٹ میں ملبوس اندر آ گئے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ان کے ہاتھ بار بار اپنے بالوں کی طرف غیر ارادی طور پر بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے آتے ہی مجمع پر ایک نظر ڈالی اور کھانے کی میز کے پاس آ کے مجھ سے مخاطب ہوئے، ''بھئی سلمٰی ...کہاں ہے وہ نامعقول شخص جس کا نام کرشن چندر ہے؟''

میں اِدھر اُدھر دیکھ کے نامعقول شخص کو ڈھونڈنے لگی کہ کرشن جی اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ اُس وقت انھوں نے سفید ململ کا کرتا اور بڑی مہری کا کلف لگا کھڑکھڑاتا ہوا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ دونوں کپڑے کچھ پھولے پھولے اور پھیلے پھیلے اور ڈھیلے ڈھیلے سے نظر آ رہے تھے۔ پہلی نظر میں کرشن جی کو ان کپڑوں میں دیکھ کر بے اختیار شادی بیاہ کے اس بڑے دعوت نامے کی یاد آ گئی جو خود تو بہت لحیم شحیم ہوتا ہے لیکن اس کے اندر کا مضمون بہت مختصر ہوتا ہے۔

ساحرؔ لدھیانوی آئے تو ساڑھے سات بج چکے تھے۔ جب میں نے ان کو چائے پیش کی تو انھوں نے بڑے اخلاق سے جواب دیا کہ وہ اس وقت چائے نہیں پیتے۔ یہ کہہ کر وہ کرشن جی کے لکھنے کے کمرے میں جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد جب میں عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے استقبال کے لیے باہر گئی اور وہاں سے واپس ہوئی تو مجھے یہ دیکھ کے بہت حیرت ہوئی کہ بیٹھنے کے کمرے میں صرف خواتین رہ گئی ہیں۔ باقی لوگ آہستہ آہستہ کرشن جی کے کمرے میں جا رہے تھے۔

عصمت چغتائی کمرے میں داخل ہوئیں اور ایک بڑی اچٹتی سی نظر اِدھر اُدھر ڈال کے دیوان پر کچھ بیٹھنے اور کچھ لیٹنے کے انداز میں بیٹھ رہیں۔ عصمت آپا کا کسی محفل میں خود سے پہنچ جانا تقریباً ناممکن ہے۔ انھیں بلایئے تو بار بار اُن کی یاددہانی کراتے رہیے۔ ان کو گھر سے لانے اور گھر تک پہنچانے کا بندوبست کیجیے۔ اُن کی اس ادا پہ بہت حیرت ہوتی ہے۔ جو خاتون اپنی کہانیوں میں اور اپنے خیالوں میں اس قدر روشن خیال ہو، وہ آنے جانے اور گھومنے پھرنے کے سلسلے میں اس قدر قدامت پسند ہو، عجیب بات ہے!

میں نے قرۃ العین حیدر کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ خاموش سی دیوان کے کونے میں ریڈیو گرام کا سہارا لیے بیٹھی تھیں۔ عصمت چغتائی جس طرح کی باتیں اپنے ادب میں کرتی ہیں، ویسی ہی اپنی گفتگو میں بھی کرتی ہیں مگر عینی اپنے رکھ رکھاؤ، مجلسی گفتگو اور

آدابِ محفل میں عصمت سے بالکل مختلف ہیں۔ اپنے ادب میں وہ جتنی ماڈرن ہیں، زندگی میں اتنی ہی قدامت پرست۔ وہ ادیبوں کی محفل میں کم نظر آتی ہیں۔ عینی بڑی محفلوں میں کُھلتیں۔ قریبی دوستوں کی چھوٹی چھوٹی محفلوں میں کوئی بحث شروع ہوجائے، پھر دیکھیے عینی کی گل افشانیِ گفتار۔ وہ ایک دم بدل جاتی ہیں۔ کرسی سے دیوان پہ آجائیں گی، دیوان سے اُتر کر نیچے قالین پر آجائیں گی اور مغربی ادب کی جدید ترین تحریکوں پر جدید ترین خیالات کا اظہار انتہائی وضاحت اور صاف گوئی سے فرمائیں گی۔

باہر ایک ٹیکسی آکر رُکی اور خواجہ احمد عباس نمودار ہوئے۔ وہ حسبِ معمول بے حد جلدی میں تھے۔ ایک نظر کرشن چندر کے کمرے میں ڈالی۔ میں ہنس دی تو خود بھی ہنس دیے۔ پھر بولے، ''لائیے، چائے لائیے!'' میں نے چائے کی پیالی ان کی طرف بڑھائی تو بولے، ''بھئی، بس چائے چلے گی۔ مٹھائی وٹھائی مت لائیے گا۔'' عباس صاحب خوشیوں میں کم شرکت کرتے ہیں۔ وہ تندرست دوستوں کے یہاں کم جاتے ہیں اور کھاتے پیتے ساتھیوں کی پروا کم کرتے ہیں لیکن خدانخواستہ ان کو پتا چل جائے کہ اُن کا کوئی دوست، ساتھی یا شناسا پریشان ہے، اُداس ہے، مقروض ہے، بیمار ہے تو پھر عباس صاحب اپنا ہر ضروری کام چھوڑ کر اس انسان کی تیمارداری میں لگ جائیں گے۔

عباس صاحب کو کس چیز کی تلاش ہے، یہ میں آج تک نہ سمجھ سکی مگر اتنا یقین ضرور ہے کہ انھیں کسی کی تلاش ہے ورنہ وہ یوں ہر وقت اپنے آپ کو مصروف نہ رکھیں۔ ادب سے فلم میں، فلم سے جرنلزم میں، جرنلزم سے سیاست میں، سیاست سے سماج سدھار میں، سماج سدھار سے بچوں کی تعلیم میں، وہ ہر وقت کسی نہ کسی مسئلے میں اپنے کو اُلجھائے رکھتے ہیں۔ یوں ہر ادیب کے پاس چند مسئلے ہوتے ہیں مگر عباس صاحب کے پاس سب سے زیادہ مسئلے ہیں۔ وہ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں۔ صبح نو بجے گھر سے نکلتے ہیں، رات کو بارہ بجے واپس لوٹتے ہیں۔ ٹیکسی میں پڑھتے ہیں۔ ہوائی جہاز میں لکھتے ہیں۔ ریستوران میں سوتے ہیں اور رات کو جاگتے ہیں۔ آج بمبئی میں ہیں، کل دلّی میں، پرسوں ماسکو میں دیکھے گئے تو اگلے دن لندن میں ہیں۔ جی چاہتا ہے اُن سے پوچھوں:

منزل ہے کہاں تیری ، اے لالۂ صحرائی

مگر اُن کے پاس تو شاید یہ مصرعہ سننے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ سگریٹ وہ نہیں پیتے، پان وہ نہیں کھاتے، شراب وہ نہیں پیتے، کسی دوست کی برائی وہ نہیں کرتے۔ شاید اسی لیے ان کا دل کسی محفل میں نہیں لگتا اور وہ چند منٹ ٹھہر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں، کسی تیسری جگہ جانے کے لیے!

کرشن جی کمرے سے ہانپتے ہوئے باہر نکلے ہیں اور امرتی اور بالوشاہی کی پلیٹ اُٹھا کے بھارتی جی کے پاس چلے گئے ہیں۔ مجروحؔ صاحب کچھ اشعار گنگناتے ہوئے باہر نکلے ہیں اور اِدھر اُدھر اپنی بیگم فردوس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ فردوس پاندان کھولے بیٹھی ہیں۔ مجروحؔ صاحب ایک لمحے کو ان کے پاس رُکے پھر واپس کمرے میں چلے گئے۔ میں جتنے ادیبوں سے اب تک ملی ہوں، مجروحؔ ان میں سب سے زیادہ 'انسان' ہیں یعنی نہ وہ فرشتہ بننے کا دعویٰ کرتے ہیں نہ شیطان بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی محبت، نفرت، غصہ، ہمدردی سب اسی زمین سے متعلق ہیں جس پہ ہم رہتے ہیں۔ وہ شاعر ہونے کے باوجود عام زندگی میں کبھی کوئی مبہم، غیر یقینی، ماورائی یا اِلہامی بات نہیں کہتے۔ عام زندگی میں بہت پریکٹیکل آدمی ہیں جو صرف شعر کی دنیا میں نہیں، اپنے بال بچوں میں بھی رہنا اسی قدر پسند کرتا ہے۔ خواہ وہ خاموش بیٹھے شعر کی فکر میں انتہائی محو ہوں لیکن اگر ان کا بچہ عندلیب گیند یا پتنگ کی فرمائش ان سے کردے گا

تو وہ سب کچھ بھول بھال کے سب سے پہلے اپنے بچے کا مطالبہ پورا کریں گے۔ انھیں غصہ آ جائے گا تو جوالامکھی کی طرح سارا غبار اُگل دیں گے اور محبت اور ہمدردی کا جذبہ اُمڈے گا تو سارے بدخواہوں کو ایک ہلّے میں معاف کر دیں گے۔

راجندر سنگھ بیدی میز کے قریب آئے ہیں۔ وہ شامی کباب کھاتے ہوئے کہہ رہے ہیں، ''بھئی، کباب بہت اچھے بنے ہیں!''

بیدی صاحب اپنی کہانیوں میں جس قدر سنجیدہ رہتے ہیں، دوستوں کی محفل میں اسی قدر خوش مذاق نظر آتے ہیں۔ بہت عمدہ فقرے کہتے ہیں اور جب ان کی طبیعت موزوں ہو تو کوئی بھی ان کے فقرے کی بے ضرر چبھن سے محفوظ نہیں رہتا۔ بیدی صاحب کو اُن کے اصل موڈ میں دیکھنا ہو تو انھیں ایسی محفل میں دیکھنا چاہیے جہاں ان کے سر پہ ان کے بال بچوں کا سایہ نہ ہو۔ عام طور سے بچے اپنے والدین کے سامنے جتنے مؤدّب اور سنجیدہ رہتے ہیں، بیدی صاحب اسی قدر مہذّب اپنے بال بچوں کے سامنے نظر آتے ہیں۔

ابھی ساحرؔ لدھیانوی کمرے سے نکلے تھے۔ میٹھا، محزوں، دھیما دھیما لہجہ، عشق اور رومان کی نازک ترین واردات، اگر انقلاب کا ذکر ہے تو اس قدر مدھم، دل گرفتہ لہجے میں کہ کسی سیاسی نظریے کا اظہار نہیں ہو رہا ہے، کسی پری چہرہ محبوب کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ ہیں ساحرؔ اپنی نظموں میں! جب تک ان سے نہ ملو، یہی سوچنا پڑتا ہے کہ زندگی میں بھی ساحرؔ ایسے ہی ہوں گے مگر مل کر کسی طرح گمان نہیں ہوتا کہ یہ وہی ساحرؔ ہیں۔ بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ دو ساحرؔ ہیں: ایک وہ جو دلکش نظمیں کہتا ہے، دوسرا وہ جو تلخ، حقیقت افروز بلکہ قنوطیت آمیز گفتگو کرتا ہے۔ یہ دوسرا ساحرؔ مجھے پہلے ساحرؔ کا نقاب معلوم ہوتا ہے اور کبھی پہلا ساحرؔ دوسرے ساحرؔ کا پردہ پوش۔ اس پر اب مجھے حیرت نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ ادیب اپنی شخصیت کے اندر اور کتنی ہی شخصیتیں چُھپائے رکھتے ہیں۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوئی گیارہ پر آنے والی تھی۔ کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ میں نے کرشن جی کو آواز دی تاکہ ادبی ٹاپک کے بعد کوئی دوسرا ٹاپک جلیبی یا امرتی کے بارے میں نہ چھڑ جائے اور جب ادیب اور شاعر کھانے کی میز کی طرف بڑھنے لگے تو میں سوچنے لگی کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بمبئی کے یہ بڑے ادیب جب آپس میں ملتے ہوں گے تو ایک بہت ہی بلند سطح پر انتہائی دانش مندی کی گفتگو کرتے ہوں گے اور دنیا جہان کے مسئلے سلجھاتے ہوں گے۔ جب تک میں ان لوگوں سے نہیں ملی تھی، میں بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔

بڑے ادیبوں کی محفل میں معیارِ گفتگو سطحی، معمولی بلکہ کبھی کبھی نہایت عامیانہ ہوتا ہے۔ ان سے بڑھ کر دانشوری کی باتیں تو وہ کرتے ہیں جو نکّڑ کے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں اس لیے ادیب کی ظاہری گفتگو، رہن سہن، طبیعت اور مزاج سے آپ اس کے ادب کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ادیب کی زندگی کا جو سب سے اہم پہلو ہے، وہ اسے سو پردوں میں چھپا کر رکھتا ہے۔ آپ اسے صرف کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔

معانی و اشارات

ملمع	پالش	گل افشانیِ گفتار	باتوں سے پھول جھڑنا، مراد اچھی گفتگو کرنا
حرف آنا	اعتراض کیا جانا	جرنلزم	صحافت، اخبار نویسی
تجریدی کہانی	آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والی کہانی	ماورائی	حقیقت سے پرے، ناقابلِ فہم
مراسم	تعلقات	دل گرفتہ	غمگین
لحیم شحیم	موٹا تازہ	محزون	غمگین
قدامت پرست	پرانے رواجوں کو ماننے والا		

مشقی سرگرمیاں

٭ مہمانوں کے متعلق شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

استقبال کی تیاریاں

٭ مصنفہ کے گھر منعقد ہونے والی محفل میں شریک ہونے والوں کے ناموں کا شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

محفل کے اہم شرکا

....

٭ سبق میں مذکور چیزوں سے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

کھانے پینے کی چیزیں

٭ شعرا و ادبا کی آمد کی ترتیب سے رواں خاکہ مکمل کیجیے۔

آمد

....

....

....

....

٭ خواجہ احمد عباس کی مصروفیات کا رواں خاکہ مکمل کیجیے۔

خواجہ احمد عباس

ادب سے ....

فلم سے ....

جرنلزم سے ....

سیاست سے ....

سماج سدھار سے ....

ہر وقت کسی نہ کسی مسئلے میں اپنے کو اُلجھائے رکھتے ہیں۔

٭ مصنفہ کے گھر منعقد ہونے والی محفل کے آغاز اور اختتام کے وقت کو ظاہر کرنے والے جملے لکھیے۔

ادبی محفل کے ....

وقت کا اظہار یہ ....

٭ ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ مصنفہ کے مطابق نجی محفلوں اور ادبی مجلسوں کا فرق تحریر کیجیے۔

۲۔ سبق میں شاعروں اور ادیبوں کی ایک خاص عادت پر طنز کیا گیا ہے۔ اُس طنزیہ جملے کو نقل کیجیے۔

۳۔ چائے کے پانی کے لیے استعمال کی گئی تشبیہات واضح کیجیے۔

۴۔ مصنفہ کے بار بار کچن میں جانے کی وجہ تحریر کیجیے۔
۵۔ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے مزاج کا فرق قلم بند کیجیے۔
۶۔ خواجہ احمد عباس کی شخصیت پر نوٹ لکھیے۔
۷۔ سبق کے حوالے سے مصرع 'منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی' کی وضاحت کیجیے۔
۸۔ مجروحؔ سلطان پوری کی خوبیاں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
۹۔ ''بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ دو ساحرؔ ہیں۔'' وضاحت کیجیے۔
۱۰۔ کرشن چندر کو دیکھ کر مصنفہ کو یاد آنے والی چیز اور اس کی یاد آنے کی وجہ لکھیے۔

* **ہدایات کے مطابق قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔**

۱۔ 'کباب بہت اچھے بنے ہیں!'
(استفہامیہ میں تبدیل کیجیے)
۲۔ 'دوسرا وہ جو تلخ، حقیقت افروز بلکہ قنوطیت آمیز گفتگو کرتا ہے۔'
(جملے کا نحوی تجزیہ کیجیے)
۳۔ ادیبوں اور شاعروں سے ادبی مجلسوں اور مشاعروں میں ملاقات کیجیے تو مزا نہیں آتا۔
(مثبت جملے میں اس طرح تبدیل کیجیے کہ مفہوم نہ بدلے)

* **ہدایات کے مطابق سرگرمیاں مکمل کیجیے۔**

۱۔ ''دراصل زندگی کے ہر شعبے میں افراد کے چہروں پر جو ایک ملمع یا ایک نقاب ہوتا ہے، وہ ایسی گھریلو محفلوں میں ایسے انجانے طریقے سے آہستہ آہستہ اُتر جاتا ہے کہ انسان کے چہرے کے صحیح خد و خال دیکھنے کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔''
اس بیان کی روشنی میں ادیبوں، شاعروں کی زندگی کے دو رُخی رویے پر اپنی رائے دیجیے۔
۲۔ ''ادیب کی زندگی کا جو سب سے اہم پہلو ہے، وہ اسے سو پردوں میں چھپا کر رکھتا ہے۔ آپ اسے صرف کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔'' اس پر اپنی ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

سرگرمی/منصوبہ

مختلف ادیبوں نے رپورتاژ لکھے ہیں۔ ان میں سے کوئی دو رپورتاژ حاصل کر کے پڑھیے اور اپنے تاثرات قلم بند کیجیے۔

۹ مکاتیبِ اقبالؔ

شیخ محمد اقبالؔ

پیش درس

انسان بنیادی طور پر اجتماعیت پسند ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ربط وتعلق بنائے رکھنے کا عادی ہے۔ اپنے مقام سے دور رہنے والے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی خیریت دریافت کرنے اور ان کے حالات جاننے کے لیے اس نے پیغام رسانی کا سلسلہ شروع کیا جو مختلف مراحل سے ہوتے ہوئے خط وکتابت اور آج برقی مراسلت تک پہنچا ہے۔

خطوط انسانوں کے درمیان رابطے کا ایک اہم وسیلہ ہیں۔ موجودہ زمانے میں ترسیل وابلاغ کی ترقی نے ایس ایم ایس، ای میل، ویڈیو کانفرنسنگ اور موبائل فون جیسے وسائل فراہم کر کے لوگوں کو خطوط نگاری سے بے نیاز کر دیا ہے۔ مکتوب نگاری کا چلن اب عام نہیں رہا تاہم دفتری خطوط اور دستاویزات کا رواج اب بھی ہے۔

ادب میں خطوط نگاری کا ظہور دیگر اصناف کی طرح نہیں ہوا بلکہ ضرورت کے تحت لکھے گئے خطوط، زبان کی خوبیوں اور ادبی محاسن کے سبب ادب کا حصہ بن گئے۔ یہ وہ تحریریں ہیں جو ادیبوں، شاعروں اور اہم شخصیات نے قلم بند کی تھیں، اس خیال کے بغیر کہ وہ کوئی تخلیقی کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ عصری افکار اور معاشرتی تبدیلیوں کے مطالعے کے لیے بھی خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اُردو میں مرزا غالبؔ، شبلؔی نعمانی، علامہ اقبالؔ، مولانا ابو الکلام آزادؔ، مہدی افادی، پطرس بخاری، فیض احمد فیضؔ وغیرہ کے خطوط مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار فنکاروں کے خطوط منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

ادبی خطوط سے ہمیں مکتوب نگار کے خیالات و احساسات کے علاوہ اس عہد کے حالات اور معاصر ادیبوں، شاعروں اور اہلِ علم کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہے۔ زبان و بیان اور انشا پردازی کے نمونے ان خطوط میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں زندگی اور ادب وفن کے متعدد مسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔ ادب کی بیشتر اصناف میں اظہارِ ذات کے مقصد سے تخلیق کے بہترین نمونے وجود میں آئے ہیں۔ یہی خوبیاں ادبی خطوط میں بھی پائی جاتی ہیں۔

جان پہچان

شیخ محمد اقبالؔ ۹؍نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اصلاً کشمیری تھا۔ انھوں نے شمس العلما مولوی سیّد میر حسن کے زیرِ سایہ تعلیم وتربیت کے ابتدائی مراحل طے کیے۔ لاہور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصے کے لیے وہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ولایت گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفے کی ڈگری لی۔ جرمنی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی اور لندن میں بیرسٹری پاس کر کے بھارت لوٹ آئے اور وکالت کرنے لگے۔ انھیں 'سر' کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

اقبالؔ کو شاعری کے ذریعے بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی شاعری میں اسلامی افکار کے رنگ گہرے نظر آتے ہیں۔ اُردو کے علاوہ اقبالؔ نے فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ 'بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم' ان کی اُردو شاعری کے اور 'پیامِ مشرق، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، جاوید نامہ' اور 'زبورِ عجم' ان کی فارسی شاعری کے مجموعے ہیں۔ ان کی نثری تصانیف بھی کم اہمیت کی حامل نہیں۔ ان کی پہلی باقاعدہ نثری تصنیف 'علم الاقتصاد' ہے۔ 'فلسفۂ عجم' اقبالؔ کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کے انگریزی خطبات کا مجموعہ 'Reconstruction of Religious Thoughts in Islam' کے نام سے منظرِ عام پر آیا جس کا اُردو ترجمہ 'تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کے خطبات، مقالات اور مکاتیب کے بھی متعدد مجموعے ہیں۔ ان کے مکاتیب کا کلیات چار جلدوں میں شائع ہوا۔ ۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبالؔ نے لاہور میں وفات پائی۔

اکبرالہ آبادی کے نام

لاہور

۶/ اکتوبر ۱۹۱۱ء

مخدوم و مکرم قبلہ سیّد صاحب، السلام علیکم!

کل ظفر علی خاں صاحب سے سنا تھا کہ جناب کو چوٹ آ گئی۔ اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور میں عریضہ خدمتِ عالی میں لکھنے کو تھا کہ جناب کا محبت نامہ ملا۔ دست بہ دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اِس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے تاکہ ہندوستان کے مسلمان اُس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔

میں آپ کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اِس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔

لارڈ بیکن کہتے ہیں، ''جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔'' سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ ماہ میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور انھی میں طبعِ سلیم میرے لیے شکنجے کا کام دے گئی۔

ناتمام نظم کے اشعار آپ نے پسند فرمائے۔ مجھے یہ سن کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں۔ 'غُرّۂ شوال' پر چند اشعار لکھے تھے۔ 'زمیندار' اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوئے۔ اُن کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے ہیں کہ ترکی و اٹلی کی جنگ نے اُس کی تصدیق کر دی ہے۔ اگر 'زمیندار' اخبار آپ تک نہ پہنچا ہو تو تحریر فرمائیے، بھجوا دوں گا۔

خواجہ حسن نظامی واپس تشریف لے آئے۔ مجھے بھی اُن سے محبت ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسول ؐ نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے، دیکھیے کب جوان ہوتی ہے۔ شیخ عبدالقادر لائل پور میں سرکاری وکیل ہو گئے۔ اب وہ لاہور سے وہاں چلے گئے۔ کچھ دن ہوئے، یہاں آئے تھے مگر ان سے نہ مل سکا۔ آپ دعا کریں۔

خیریتِ مزاج سے مطلع کیجیے۔ مجھے اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا آپ کو صحتِ کامل مرحمت فرمائے۔

دعا گو

محمد اقبال، بیرسٹر

لاہور

اکبر الٰہ آبادی کے نام

سیالکوٹ

۱۳/ اگست ۱۹۱۸ء

مخدومی، السلام علیکم!

والا نامہ لاہور سے ہوتا ہوا ملا۔

الحمدللہ کہ جناب کا مزاج بخیر ہے۔ واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہِ شفقت ایک طرف۔ اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے، اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کی بجائے اُن کی گرمیِ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔

پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگے، ''معلوم نہیں، بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے۔'' اِس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ قریباً بے ہوش ہو گئے اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی۔ یہ خاموش لیکچر ہیں جو پیرانِ مشرق ہی سے مل سکتے ہیں۔ یورپ کی درس گاہوں میں ان کا نشان نہیں۔ اگست کے آخر تک اِن شاءاللہ یہیں قیام رہے گا۔

'تہذیبِ نسواں' یا صحیح معنوں میں تخریبِ نسواں نے اگر کچھ لکھا ہے تو اس کا بہترین جواب خاموشی ہے۔ تردید کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ پرچہ قدیم اسلامی شعار کو بہ نگاہِ حقارت دیکھتا ہے، گو ابھی صاف لکھنے کی جراٗت نہیں کر سکتا۔

میرے بعض احباب مجھ سے ناراض ہیں کہ شملہ جانے کی جگہ سیالکوٹ آ گیا ہوں۔ مگر میں اُن احباب کو معذور جانتا ہوں کہ وہ میری قلبی کیفیات سے آگاہ نہیں ہیں۔ بہرحال جو کچھ علمِ الٰہی میں ہے، ہو جائے گا اور وہی اَنسب و اَولیٰ ہو گا۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ خیریت سے آگاہ کیجیے۔ کل شام سے طبیعت نہایت مشتعل ہے۔ 'وکیل' اخبار لکھتا ہے کہ کسی انگریزی اخبار نے مدینہ منورہ کی بہت توہین کی ہے۔ کمزوروں کے پاس سوائے بددعا کے اور کیا ہے۔ والد مکرم سلامِ شوق عرض کرتے ہیں۔

مخلص

محمد اقبال

حاجی نواب محمد اسمٰعیل خاں رئیسِ دتاولی ضلع علی گڑھ کے نام

عالی جناب نواب صاحب قبلہ، السلام علیکم!

آپ کی کتابیں اور خط کئی دنوں سے میری میز پر رکھا ہے۔ میں بوجہِ علالت جواب نہ لکھ سکا۔ اس تاخیر کے لیے معافی کا خواست گار ہوں۔ 'حالاتِ زمین' یعنی جغرافیہ جو آپ نے مسلمان بچوں اور بچیوں کے لیے تالیف فرمایا ہے، نہایت عمدہ رسالہ ہے اور میری رائے ناقص میں ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرتا ہے۔ میں نے بار بار دیکھا ہے کہ مسلمان مستورات بوجہِ جغرافیہ نہ جاننے کے اخبار اچھی طرح سمجھ نہیں سکتیں۔ آپ کا رسالہ اُن کے لیے از بس مفید ہوگا۔ قطع نظر اس کے کہ اُن کو موجودہ دنیا کے واقعات سمجھنے میں سہولت ہوگی، اِس رسالے کے مطالعے سے اُن کے دائرۂ نظر میں وسعت بھی پیدا ہوگی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جو اسلامیہ اسکول اس وقت موجود ہیں یا جو آئندہ بنائے جائیں، ان میں اس جغرافیہ کی ترویج نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ اپنا بیش قیمت وقت ایسے ایسے رسائل کی تصنیف و تالیف میں صَرف فرماتے ہیں۔ والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال، بیرسٹر ایٹ لا

۱۱/اپریل ۱۹۱۳ء

معانی و اشارات

مخدوم و مکرم	-	قابلِ تعظیم
غُرّہ	-	پہلی تاریخ کا چاند، ہلال
شرفِ نیاز	-	ملاقات کی سعادت
مخدومی	-	میرے قابلِ تعظیم بزرگ (خط میں تخاطب)
والا نامہ	-	کسی بلند مرتبہ شخص کا خط
مستفید ہونا	-	فائدہ اُٹھانا
پیرانِ مشرق	-	مشرقی ملکوں میں رہنے والی بزرگ ہستیاں
طبعِ سلیم	-	صحت مند فکری رجحان
دقیق	-	باریک، مشکل
شعار	-	طریقے
اَنسب و اَولیٰ	-	بڑے مرتبے والا، مراد قابلِ قبول
طبیعت مشتعل ہونا	-	اضطراب ہونا
مستورات	-	مستورہ کی جمع، عورتیں
دائرۂ نظر	-	مراد بصیرت
ترویج	-	رواج دینا

مشقی سرگرمیاں

* اکبرؔالہ آبادی کے نام علامہ کے خط سے ذیل کا شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ لارڈ بیکن کے قول کی علامہ اقبالؔ کے حالات سے مطابقت بیان کیجیے۔

۲۔ اکبرؔالہ آبادی کے لیے علامہ اقبالؔ کی دعا اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۳۔ باپ کی شفقت پر اکبرؔالہ آبادی کے قول کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ اقبالؔ کے پہاڑ پر نہ جانے کی وجہ تحریر کیجیے۔

۵۔ خاموش لیکچر اور پیرانِ مشرق سے علامہ اقبالؔ کی مراد واضح کیجیے۔

۶۔ خطوط کی مدد سے علامہ اقبالؔ کی شخصی صفات قلم بند کیجیے۔

۷۔ رسالہ 'حالاتِ زمین' کے متعلق علامہ اقبالؔ کی رائے بیان کیجیے۔

* خط سے 'رسالۂ تہذیبِ نسواں' سے متعلق اقبالؔ کے خیالات کی وضاحت کیجیے۔
* رسالہ 'حالاتِ زمین' کی افادیت بیان کیجیے۔
* اقبالؔ نے اکبرؔالہ آبادی سے جن الفاظ میں عقیدت کا اظہار کیا ہے، اسے تحریر کیجیے۔
* درج ذیل جملے کی وضاحت کیجیے۔

''مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیے کب جوان ہوتی ہے۔''

* 'وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو۔'

(اس جملے کا نحوی تجزیہ کیجیے)

* ہدایت کے مطابق قواعدی سرگرمی مکمل کیجیے۔

۱۔ اس راہ میں مشکلات بے حد ہیں۔

(معنی کی تبدیلی کے بغیر منفی جملہ بنائیے)

۲۔ کمزوروں کے پاس سوائے بددعا کے اور کیا ہے۔

(خبریہ جملے میں تبدیل کیجیے)

۳۔ ایسا سوال بنائیے جس کا جواب درج ذیل جملہ ہو۔

'میں بوجہِ علالت جواب نہ لکھ سکا۔'

اضافی معلومات

نواب محمد اسمٰعیل خاں دتاولی: حاجی محمد اسمٰعیل خاں علی گڑھ کے ایک قدیم قصبے دتاولی کے رئیس اور سرسیّد کے نہایت عزیز دوست اور رفیق تھے۔ ان کے والد فیض احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا اور دو سال قیدِ فرنگ میں رہے۔ رہائی کے بعد عرب کو ہجرت کر گئے۔ وہاں ۱۸۷۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں سرسیّد کی تحریک سے وابستہ رہے۔ سرسیّد احمد خاں کا انتقال ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو انھی کے گھر میں ہوا تھا۔ وہ محمڈن اینگلو کالج کی مجلسِ منتظمہ کے وائس پریزیڈنٹ بھی رہے۔ ۱۹۱۲ء میں ان کو نوّاب کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۴ء میں انھوں نے یورپ کی سیر کی تھی اور ترکی میں بھی ایک عرصے تک قیام کیا تھا۔ انھوں نے جولائی ۱۸۹۸ء میں وحید الدین سلیمؔ کے ساتھ رسالہ 'معارف' علی گڑھ سے نکالا۔ وہ مختلف موضوعات پر آٹھ نو کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا حالی کو 'حیاتِ جاوید' کا بہت سا مواد انھوں نے فراہم کیا تھا۔ پنجاب اور حیدرآباد وغیرہ کے سفر میں وہ سرسیّد کے رفیق بھی رہے تھے۔ آخر عمر میں آگرہ منتقل ہو گئے تھے اور یہاں ایک پریس بھی قائم کر لیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

اضافی معلومات

فرانسس بیکن (Francis Bacon) (۱۵۶۱ء تا ۱۶۲۶ء) : فرانسس بیکن ۲۲ر جنوری ۱۵۶۱ء کو لندن میں پیدا ہوئے۔ ۱۵۷۳ء میں انھوں نے ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا۔ ۱۵۸۲ء میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ابتدائی ناکامیوں کے بعد ۱۶۰۷ء میں وہ سالیسٹر جنرل اور ۱۶۱۳ء میں اٹارنی جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۶۲۰ء میں انھیں 'لارڈ' کا خطاب ملا اور ان کا شمار بادشاہ جیمس اوّل کے مقربین میں ہونے لگا۔ عروج و ترقی کی وجہ سے ان کے بہت سے حاسد پیدا ہو گئے۔ آخر کار بیکن نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ انھوں نے زندگی کے آخری ایام تصنیف و تالیف میں گزارے۔ ان کی پہلی تصنیف 'Advancement of Learning' ۱۶۰۵ء میں شائع ہوئی۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف 'Novum Organum' منطق کا نیا تجربہ سمجھی جاتی ہے۔ ان کا میدان فلسفہ اور سائنس تھا۔ گو سائنس داں کی حیثیت سے ان کا درجہ بلند نہیں ہے۔ ان کی لافانی شہرت کا دار و مدار ان کے انشائیوں پر ہے جو ذاتی تجربات اور گہرے غور و فکر کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان کے اقوالِ زریں انگریزی ادب میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلقانی جنگیں (Balkan Wars) (۱۹۱۲-۱۳ء) : یورپی ترکیہ پر قبضے کے لیے دو مختصر جنگیں۔ پہلی جنگ ۱۹۱۲ء میں سرویا، بلغاریہ، یونان اور مانٹی نیگرو نے ترکوں کو قسطنطنیہ کے سوا تمام یورپی مقبوضات سے نکال دیا۔ بڑی طاقتوں کے ۱۹۱۳ء کے علاقائی تصفیے سے سرویا کو مایوسی ہوئی کیونکہ وہ آزاد البانیہ کے قیام کے باعث بحیرۂ ایڈریاٹک سے کٹ گیا تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ بلغاریہ مقدونیہ کے بڑے حصے کو اس کے حوالے کر دے۔ یوں دوسری جنگِ بلقان چھڑ گئی۔ رومانیہ، یونان اور ترکیہ نے بلغاریہ کے خلاف سرویا کا ساتھ دیا۔ بلغاریہ کو شکست ہوئی اور معاہدۂ بخارسٹ ۱۹۱۳ء کی رو سے حملہ آوروں کو اس کے مختلف علاقے مل گئے۔ بلقانی جنگوں نے جذبۂ قومیت کو اُبھارا اور پہلی عالمی جنگ کے اسباب پیدا کیے۔

تہذیبِ نسواں : ''تہذیبِ نسواں' خواتین کا مشہور ہفت روزہ اخبار تھا جسے امتیاز علی تاج کے والد شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی نے ۱۸۹۸ء میں لاہور سے جاری کیا تھا۔ اس اخبار کی مدیرہ ان کی اہلیہ محمدی بیگم تھیں۔ ''تہذیبِ نسواں' کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو منظر عام پر آیا۔ اس اخبار کا نام 'تہذیب الاخلاق' سے مشابہ سر سیّد احمد خان نے تجویز کیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں محمدی بیگم کے انتقال کے بعد مولوی ممتاز کی صاحبزادی وحیدہ بیگم نے اس اخبار کی ادارت سنبھالی۔ وحیدہ بیگم ۱۹۱۷ء میں اللہ کو پیاری ہو گئیں تو کچھ عرصے کے لیے مولوی ممتاز کی بڑی بہو آصف جہاں اس کی مدیرہ رہیں۔ اس کے بعد مولوی ممتاز کے صاحبزادے اور اُردو کے نام ور ادیب امتیاز علی تاج نے اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ انھیں دیگر علم دوست خواتین کے ساتھ اپنی اہلیہ مشہور مصنفہ حجاب امتیاز علی کا تعاون بھی حاصل رہا۔ امتیاز علی تاج اس اخبار کے آخری مدیر تھے۔ اس اخبار کے صفحات شروع میں آٹھ اور پھر بارہ ہوئے، اس کے بعد سولہ اور آخر میں چوبیس ہو گئے۔

''تہذیبِ نسواں' کے اجرا کے بعد وہ بہت جلد ہندوستان کے متوسط طبقے کے اُردو داں مسلم گھرانوں میں پہنچنے لگا اور اس کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشین خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا۔

ظفر علی خاں (۱۸۷۰ء تا ۱۹۵۶ء) : ظفر علی خاں ۱۸۷۰ء میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک وزیر آباد اور پٹیالہ میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۲ء میں ایف اے پاس کیا اور اپنے والد کے پاس چلے گئے جو سری نگر میں محکمۂ ڈاک و تار میں ملازم تھے۔ وہیں ظفر علی خاں کو بھی ملازمت مل گئی۔ وہاں ایک افسر سے اختلاف ہوا تو انھوں نے اس کی ہجو لکھی اور نوکری چھوڑ کر علی گڑھ آ گئے۔ یہاں سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور متعدد جگہوں پر ملازمت کی مگر ہر جگہ سے علیحدہ ہو گئے۔

اس کے بعد ظفر علی خاں حیدر آباد کے دارالترجمہ میں گئے تو انگریزوں نے نظام پر دباؤ ڈال کر انھیں وہاں سے بھی نکلوا دیا۔ آخر وہ اخبار 'زمیندار' سے وابستہ ہو گئے جو وزیر آباد سے ان کے والد نکالتے تھے۔ ظفر علی خاں اس اخبار کو لاہور لائے اور انگریزوں کے خلاف جدوجہدِ آزادی میں شامل ہو گئے۔ بارہا اخبار کی ضمانتیں ضبط ہوئیں، گرفتار ہوئے مگر ملکی آزادی کے لیے جی جان سے کوشش کرتے رہے۔ اُردو نظم میں ان کا مخصوص رنگ ہے۔ بدیہہ گوئی اور طنز نگاری میں وہ ممتاز ہیں۔ انھوں نے ہجو بھی خوب اور برجستہ لکھی۔ قومی اور وطنی موضوعات پر ان کی درجنوں نظمیں موجود ہیں۔ 'بہارستان، نگارستان، چمنستان' وغیرہ ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۵۶ء کو وزیر آباد میں ان کا انتقال ہوا۔

۱۰ زرد پتّوں کی بہار

رام لعل

پیش درس

سفرنامہ اُردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ ہر سفر ایک خاص تجربہ ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص میں اس تجربے کو بیان کرنے کی صلاحیت ہوتو ایک دلچسپ سفرنامہ لکھا جاسکتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب مسافر سفر سے واپس آتے تو اپنے تجربات کی روداد دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے۔ اُردو نثر کی ترقی کے ساتھ ہمارے ادبی سرمائے میں کئی صنفوں کا اضافہ ہوا۔ سوانح نگاری، خودنوشت، تنقید، انشائیہ اور سفرنامہ، نثر کی نسبتاً جدید ترین اصناف ہیں۔

سفرنامے کے مطالعے سے ہمیں دور دراز کے ملکوں، تہذیبوں اور جغرافیائی حالات سے آگاہی ملتی ہے۔ بہت سے انوکھے کرداروں سے بھی اس سفر میں ملاقات ہوجاتی ہے۔ سفرنامہ ہمارے لیے دنیا کے مختلف علاقوں سے تعارف کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہماری عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہم گھر بیٹھے بڑی بڑی مہمیں سر کر لیتے ہیں اور ایسے علاقوں تک جا پہنچتے ہیں جہاں جانا ہمارے لیے آسان نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے سفرنامے کو سفر کا بدل بھی کہا جاسکتا ہے۔

اُردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش کا 'عجائباتِ فرنگ' ہے۔ یوسف خاں نے ۱۸۳۷ء میں کلکتے سے بحری جہاز سے انگلستان کا سفر کیا تھا۔ ان کا قیام لندن میں تھا جہاں کی آب و ہوا، نئی نئی ایجادات اور باشندوں کا ذکر انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

سر سیّد احمد خاں کے سفرنامے 'مسافرانِ لندن' کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ سر سیّد کے معروف معاصرین میں محمد حسین آزاد کا سفرنامہ 'سیرِ ایران' اور مولانا شبلی نعمانی کا 'سفرنامۂ روم و مصر و شام' بھی اہمیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی کے سفرناموں میں منشی محبوب عالم کے دو سفرنامے 'سفرنامۂ یورپ' اور 'سفرنامۂ بغداد' اور قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ 'نقشِ فرنگ' بہت مقبول ہوئے۔ خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ 'مسافر کی ڈائری'، پروفیسر احتشام حسین کا 'ساحل اور سمندر'، قرۃ العین حیدر کا 'جہانِ دیگر' اور 'شاہراہِ حریر' اور مستنصر حسین تارڑ کے بہت سے سفرناموں کی اپنی اہمیت ہے۔ اُردو میں چند مزاحیہ سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں جن میں ابنِ انشا، شفیق الرحمٰن اور مجتبیٰ حسین کے سفرنامے قابلِ ذکر ہیں۔

مختلف ملکوں میں آمد و رفت وہاں کے باشندوں میں محبت اور یگانگت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ بھارت اور پاکستان میں بہت سے افراد ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں۔ اس وجہ سے ان ملکوں میں لوگوں کا آنا جانا عام ہے۔ دونوں ملکوں کے ادیب اور شاعر بھی ثقافتی و تہذیبی لین دین کے مقصد سے ایک دوسرے کے ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ رام لعل کا سفرنامہ 'زرد پتوں کی بہار' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد ایک شخص جو اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جا بستا ہے، اسے دوبارہ اپنے آبائی وطن کی یاد کس طرح بے چین کرتی ہے اور اسے ایک بار پھر وہاں جانے کا موقع ملتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کا اظہار اس سفرنامے میں بخوبی کیا گیا ہے۔

جان پہچان

رام لعل اُردو کے مقبول افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۱۹۲۳ء میں مغربی پنجاب کے شہر میانوالی میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور وہیں ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ ہندوستان آ گئے اور یہاں بھی ریلوے میں ملازمت کرلی۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رام لعل نے دو سفرنامے 'خواب خواب سفر' اور 'زرد پتوں کی بہار' بھی لکھے۔ پہلا یورپ کے سفر کی روداد ہے اور دوسرے میں پاکستان کے سفر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

رام لعل کا دوسرا سفرنامہ اس اعتبار سے بہت انوکھا ہے کہ یہ سفر مصنف نے نئی دنیا کی دریافت کے لیے نہیں بلکہ اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کیا تھا اس لیے اس سفرنامے میں ماضی اور حال ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ وہ جب کسی جگہ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں یا کسی شخص سے ملتے ہیں تو اس کے حوالے سے انھیں اپنے لاہور کے دنوں کی یاد آنے لگتی ہے۔

رام لعل کو سفرنامہ نگار کی حیثیت سے اپنے مشاہدات اور تجربات کو مناسب الفاظ میں پیش کرنے کا فن آتا ہے۔ ان کی نثر بہت سادہ اور رواں ہے۔

میں جب واہگہ کے راستے ۸؍فروری ۱۹۸۰ء کو ریل کے ذریعے لاہور کی طرف بڑھ رہا تھا تو میرے دل میں کئی طرح کے وسوسے تھے۔ میں وہاں کیوں جارہا ہوں؟ وہاں تو اب میرا کوئی سگا سمبندھی بھی نہیں رہتا۔ پاکستان سرکار نے ۱۹۷۸ء میں ایک بار میری ویزا کی درخواست مسترد کردی تھی۔ اب دوسری بار درخواست دینے پر اچانک منیر احمد شیخ نے جو ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس کونسلر ہیں، مجھے یہ کہہ کر ویزا دلوا دیا کہ موجودہ حکومتِ پاکستان دونوں طرف کے عوام میں محبت اور دوستی کے جذبات کو بڑھانا چاہتی ہے۔ اب میں اپنے قلم کے رشتے داروں سے ہی ملنے کے لیے وہاں جارہا ہوں، جن میں سے بیشتر کی کتابیں مجھے ملتی رہی ہیں۔ جن کے رسالوں میں مَیں چھپتا رہا ہوں اور جن کے خد و خال ان کی تخلیقات سے پہچانتا ہوں۔ ان میں سے کئی ایک نے اکثر مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔

میں میاں والی میں پیدا ہوا تھا۔ نقلِ مکانی مجھے وراثت میں ملی ہے۔ اب میں عارضی طور پر اس جگہ کی طرف لوٹ رہا ہوں جہاں میرے کئی بزرگوں اور عزیزوں نے آخری سانسیں لی تھیں۔ جس مکان میں میری ماں نے جان دی تھی اور جس کی شکل بھی مجھے یاد نہیں ہے۔ کیونکہ تب میں صرف دو اڑھائی سال کا تھا اسی مکان میں اسے پھر سے تلاش کروں گا۔ میں بھی اسی مکان میں پیدا ہوا تھا۔ لاہور میں جوان ہوا تھا اور وہاں سے میں جوان ہوکر آیا تھا۔ اب چھپن برس کی عمر میں وہاں لوٹ رہا ہوں۔ میرے بچپن اور بڑھاپے کے درمیان عمر کا یہ فاصلہ کس قدر طویل ہوگیا تھا، جو اَب ریل کی رفتار کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ سمٹتا جارہا ہے، کم ہوتا جارہا ہے۔ اسی فاصلے کو میں نے بے شمار مرتبہ خوابوں کی مدد سے آناً فاناً لانگھا ہے۔ خوابوں کے سامنے سرحدیں اور فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں اپنے ماضی کے ساتھ اس لیے ابھی تک جڑا رہا ہوں کہ وہ میرے خوابوں میں اپنی اصلی حالت میں ابھی تک موجود ہے۔ میں نے اتنا عرصہ خوابوں کے ساتھ جینا سیکھا ہے۔ میں نے اپنے ماضی کو بھلانے کی کبھی کوشش کی تو یہ اچانک میری کسی نہ کسی کہانی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ ماضی انسان کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ بالکل اجنبی بن جائے۔ کسی دوسری ہی دنیا کا انسان جس کے پاؤں زمین کے ساتھ نہیں لگے ہوں گے۔ ماضی ہماری زمین ہے اور زمین ہی کے ساتھ ہم نے ہمیشہ گہرا رشتہ قائم رکھا ہے۔

میں اچانک ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل کر لاہور کے مضافات میں پھیلے ہوئے کھیتوں، اینٹوں کے بھَٹوں، چھوٹے چھوٹے قصباتی مکانوں اور چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے مناروں کے درمیان پہنچ جاتا ہوں۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں میرے نتھنوں میں جو تازہ ہوا آرہی ہے وہ میری جانی پہچانی سی ہے۔ میں اس کی خوشبو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہ میرے لاہور سے آرہی ہے۔ پنجاب کے اس حصے سے آرہی ہے جسے میں کبھی بھلا نہیں پایا۔ میں ٹرین کی کھڑکی میں سے بڑی خاموشی سے تیزی سے گزرتے ہوئے واچ ٹاوروں اور اونچی اونچی گھاس اور مٹی میں چھُپے ہوئے پل باکسوں کی طرف دیکھتا ہوں۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف ہوا ہے اور دھوپ ہے۔ خوشبو ہے اور کھیتوں میں ہر طرف اُگے ہوئے سنہری گندم کے لہلہاتے ہوئے خوشے ہیں اور ریل کی پٹری کے متوازی دوڑتی ہوئی ایک سڑک ہے جس پر دو جاپانی کاریں آگے پیچھے دوڑ رہی ہیں اور ایک جوہڑ کے سامنے کئی بھینسیں بیٹھی ہوئی ہیں جن کی طرف ذرا فاصلے پر ایک چھکڑے کے پہیے کے ساتھ بندھا ہوا ایک اونٹ فلسفیوں کی سی گمبھیرتا سے ایک ٹک دیکھ رہا ہے اور ایک پیڑ کے نیچے ایک گبرو لیٹے لیٹے بانسری بجا رہا ہے اور ایک مکان کے آنگن کی دیوار پر کوئی دوشیزہ دھوپ میں سوکھتے ہوئے رنگین کھیس کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے دیکھتے اچانک گاڑی کی طرف متوجہ ہوگئی ہے۔

پھر میری نظروں کے سامنے مغل پورہ ورکشاپ کے شیڈوں کے چمکتے ہوئے ٹین اُبھر آتے ہیں۔ یہیں کہیں میں پانچ سال تک بطور اپرنٹس خراد مشین کا کام سیکھتا رہا تھا۔ ریل کا شور اچانک بڑھ گیا ہے۔ اب گاڑی یارڈ میں داخل ہوگئی ہے۔ دونوں طرف مال گاڑیوں کا سلسلہ ہے جس سے نکلتے ہی اچانک مجھے لاہور کا سائن بورڈ دِکھائی دے جاتا ہے اور گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اس ڈبے میں میرا ہم سفر علی عباس حسینی مرحوم کا ایک رشتے دار ہے جسے کراچی جانا ہے۔ وہ اور میں دونوں کتنی دیر سے خاموش ہیں۔

میں پلیٹ فارم پر اُتر جاتا ہوں۔ پلیٹ فارم پر چل کر محسوس کر رہا ہوں، مَیں واقعی زمین پر ہوں۔ یہ خواب نہیں ہے۔ جو خواب تھا وہ اب پورا ہو چکا ہے۔ قلی سامان اُٹھا کر آگے آگے بھاگ رہے ہیں۔ گاڑی کے ہر ڈبے سے سیکڑوں لوگ اُبل سے پڑے ہیں۔ بمبئی، حیدرآباد، مدھیہ پردیش، بہار اور یوپی کے لوگ مرد، عورتیں اور بچّے۔ سفر کی گرد سے اَٹے ہوئے اور پریشان اور حواس باختہ کچھ عورتیں جلدی جلدی اپنے برقعے پہن رہی ہیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں کرکٹ کا بَلّا ہے۔ ایک لڑکی اپنے بیگ میں جلدی جلدی 'فلم فیئر' ٹھونس رہی ہے۔ اسے وہ کسٹم والوں کی نظر سے بچا کر اپنی ہندوستانی فلموں کی شوقین فرینڈز تک لے جانا چاہتی ہے۔

جہاں قلی نے لے جا کر میرا سامان ایک طرف رکھ دیا تھا، وہاں پاسپورٹ چیک کرانے والوں کی بھیڑ دیکھ کر میں گھبرا جاتا ہوں۔ یہاں تو کئی گھنٹے اپنی باری آنے میں لگ جائیں گے۔ کسٹم کے پاکستانی عملے کی طرف میں بڑی خاموشی سے دیکھتا ہوں۔ یہ سب لوگ خوب صورت اور اسمارٹ ہیں۔ سب پنجابی ہی بولتے ہیں۔ قلی بھی پنجابی بولتے ہیں۔ لال لال وردیوں کے نیچے نیشنل ڈریس بھی پہنے ہوئے ہیں۔ یک رنگی شلوار اور قمیص، شکل وصورت سے قلی نہیں لگتے۔ میں خود کو پنجابی بولنے کے لیے آمادہ کر کے ایک آدمی کو روک کر پوچھتا ہوں، ''اِتھے ریسیو کرن آن والے لوگ تاں باہری کھڑے رہندے نیں؟''

بھیڑ میں اچانک میرے سامنے ڈاکٹر احراز نقوی کا چہرہ اُبھر آتا ہے۔ وہ جلدی سے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ اور ویزا لے کر کسٹم والوں کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی گھبراہٹ پر میں مسکرا دیتا ہوں اور پھر میرے سامنے تین اور مسکراتے ہوئے چہرے آجاتے ہیں؛ ڈاکٹر آغا سہیل، طاہر تونسوی اور ابصار عبدالعلی۔ احراز کی طرح آغا سہیل اور ابصار بھی لکھنؤ کے ہیں۔ ان تینوں کو میں ان کے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ ہماری ادبی محفلوں میں ہی جوان ہوئے ہیں اور اب لاہور کی محفلوں میں جگمگا رہے ہیں۔ طاہر تونسوی پچھلے سال ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم پر ریسرچ کرنے کے لیے لکھنؤ آیا تھا اور دو مہینے وہاں رہا تھا۔ ان کے ساتھ بشیر بھی تھے؛ طاہر رضا زیدی کا ڈرائیور۔ وہ سب میرے سامان کا ایک ایک نگ اٹھا کر بھیڑ میں گھستے چلے جاتے ہیں، ایک پوسٹ سے دوسری پوسٹ پر۔ وہ وہاں کسی نہ کسی کو ضرور جانتے ہیں۔ ان سے مجھے بھی متعارف کراتے جاتے ہیں۔ رام لعل کا افسانہ نگار ہونا جیسے کوئی اہم بات ہو! سب لوگ ہاتھ ملا کر مسکراتے ہیں اور مجھے آگے بڑھ جانے کے لیے کہتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکٹ کلکٹر مجھ سے ٹکٹ طلب کرتا ہے۔ امرتسر سے لاہور تک کا اور میں اچانک یاد کر کے بتاتا ہوں، ''ٹکٹ تو میں نے لیا ہی نہیں تھا۔ میں تو ریلوے کا ملازم ہوں، آپ ہی کی طرح۔'' وہ مسکرا کر مجھے جانے دیتے ہیں۔

''اب تم لاہور میں ہو! اپنے لاہور میں!'' آغا سہیل مسکرا رہا ہے۔

''میں نے یہاں سے آخری بار تنخواہ لی تھی ۶ راگست ۱۹۴۷ء کو۔'' میں اسی پلیٹ فارم پر بنے ہوئے کیش آفس کی طرف اشارہ کر کے بتاتا ہوں۔

''اور میں اسی پلیٹ فارم سے کالکا میل سے جالندھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔''

لاہور اسٹیشن کے باہر دو کاریں موجود ہیں۔ ایک تو ابصار عبد العلی کی تھی۔ دوسری طاہر رضا زیدی نے بھجوائی تھی۔ وہیں پر کراچی سے آئے ہوئے راحت سعید اور 'واہ سیمنٹ فیکٹری' کے محمد حسن عسکری بھی موجود تھے۔ ان دونوں سے میرا پہلی بار تعارف ہوا۔ راحت سعید، پی آئی اے میں ٹیکنیکل منیجر ہیں اور اکثر مختلف ملکوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ وہ میری خاطر رُک گئے تھے اور اسی شام کو کراچی جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ ایک شام پہلے اُردو کے منفرد نقاد محمد علی صدیقی کو ایک بہت ضروری کام سے واپس کراچی جانا پڑ گیا تھا لیکن وہ معذرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیغام چھوڑ گئے کہ اب وہ میرا استقبال کراچی ہی میں کریں گے۔

اچانک آغا سہیل نے مجھ سے پوچھا، ''لاہور کو کچھ بدلا ہوا پایا؟''

میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو بلا شبہ ایک ذہین کہانی کار کی آنکھیں تھیں، مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں اور میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ وہ بھی تو لکھنؤ کی گلیوں سے کٹ چکا تھا۔ چند ماہ پہلے آیا تھا تو وہ بھی تو وہاں اپنے کھوئے ہوئے نشان تلاش کرتا پھرتا تھا۔ کہاں بیٹھ کر وہ دوستوں کے ساتھ چائے پیا کرتا تھا۔ یونیورسٹی جانے کے لیے وہ کون کون سی گلیوں سے ہو کر نکلتا تھا۔ تب وہ لکھنؤ آزادی سے پہلے کا تھا اور اپنی ساری روایات اور پورے آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا، ''بہت کچھ تو وہی ہے۔ بہت کچھ نیا نیا سا بھی ہے۔''

آغا سہیل کی رہائش گاہ واقع ایف۔سی کالج میں دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ پہنچیں۔ اُن کے بیٹے محسن سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ باپ سے کچھ زیادہ ہی اونچا اور صحت مند نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سلام کیا، ہاتھ ملایا اور میرا سامان بشیر کی مدد سے اُتروا کر اندر لے گیا۔ ہم سب ایک کھلے کھلے اور خوب صورتی سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ آغا سہیل اندر چائے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔ پھر اس کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ فون کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا، ''آیئے، آپ کو اپنے ایک دیرینہ رفیق سے ملاؤں۔''

اُس طرف احمد ندیم قاسمی تھے۔ جمعہ کی وجہ سے گھر پر تھے۔ ایک مدت کے بعد (۱۹۴۲ء کے بعد) میں نے ان کی آواز سنی، اتنے قریب سے۔ اِس شہر میں مجھے سب سے پرانے جاننے والوں میں ایک وہ تھے، دوسرے میرزا ادیب۔ میرزا ادیب صاحب سے بھی پہلی ملاقات دہلی میں ۱۹۶۱ء میں پہلی ہند و پاک ثقافتی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ قاسمی صاحب نے پوچھا، ''کب آئے؟''

میں نے بتایا، ''بس ابھی آ کر بیٹھا ہوں۔''

''خوش آمدید! سب خیریت ہے نا؟ کب ملو گے؟''

''جی شکریہ! جس وقت آغا سہیل لے کر آئیں گے، حاضر ہو جاؤں گا۔''

''اچھا، کیا پروگرام ہے؟''

''میں آج ہی رات کو ملتان چلا جاؤں گا۔ وہاں کل میرے ایک دوست کی شادی کا ولیمہ ہے۔''

کچھ باتیں اور بھی ہوئیں۔ پھر میں جلدی جلدی گرم پانی سے نہا کر اور کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ سہیل صاحب کی بیگم اور ان کے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت سے پروگرام طے ہونے لگے لیکن کوئی پروگرام نہ بن سکا۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ میں آج رات سے پہلے کہیں نہیں جاؤں گا اور ملتان سے لوٹ کر ہی سب سے ملوں گا۔ سب لوگ چائے پی کر اور رخصت لے کر چلے گئے۔

معانی و اشارات

واہگہ	-	واگھا، پنجاب کا سرحدی مقام
عملہ	-	کسی محکمے کے ملازم، کام کرنے والے کارکن
اپرنٹس (Apprentice)	-	باقاعدہ ملازمت سے قبل تربیت حاصل کرنے والا
خراد مشین	-	لوہے یا لکڑی کو چھیل کر صاف کرنے کی مشین، لیتھ مشین
پل باکس	-	ریل کی پٹریوں کے قریب زمین پر لگے باکس جو ضروری تکنیکی کاموں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔
کھیس	-	چادر، رضائی، گدّے کا خول

مشقی سرگرمیاں

* شجری خاکہ مکمل کیجیے۔

	لاہور کے مضافات میں	

* لاہور پہنچ کر رام لعل جن ادیبوں سے ملے، ان کے ناموں کا شجری خاکہ بنائیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

ا۔ ماضی سے متعلق مصنف کے خیالات بیان کیجیے۔

۲۔ ٹرین کی کھڑکی سے نظر آنے والے مناظر بیان کیجیے۔

۳۔ ٹرین سے اُترنے کے بعد پلیٹ فارم کا منظر بیان کیجیے۔

۴۔ ''خوابوں کے سامنے سرحدیں اور فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔'' اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

۵۔ مصنف اور احمد ندیم قاسمی کی گفتگو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۶۔ ''نقل مکانی مجھے وراثت میں ملی ہے۔'' اس جملے کی روشنی میں مصنف کے ہجرت کے کرب کو اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۷۔ مصنف نے جو پنجابی زبان کا جملہ ادا کیا ہے، اسے نقل کیجیے۔

* آغا سہیل کے سوال ''لاہور کو کچھ بدلا ہوا پایا؟'' کے جواب میں مصنف کے خیالات اپنے لفظوں میں قلم بند کیجیے۔

* ہدایت کے مطابق قواعدی سرگرمی مکمل کیجیے۔

ا۔ نقل مکانی مجھے وراثت میں ملی ہے۔ (اس جملے میں مبتدا اور خبر پہچانیے)

۲۔ بہت کچھ تو وہی ہے۔ (منفی جملے میں تبدیل کیجیے)

۱۱

پروفیسر گوپی چند نارنگ سے راست گفتگو

گلزار جاوید

پیش درس

ادب کی مختلف اصناف میں مصاحبہ بھی شامل ہے جسے انگریزی میں انٹرویو کہتے ہیں۔ مصاحبہ دیگر اصناف سے قدرے مختلف صنف ہے کیونکہ یہ معاشرے کی کسی اہم اور ممتاز شخصیت کا لیا جاتا ہے جس نے اپنے متعلقہ پیشے میں نمایاں خدمات انجام دی ہوں۔ یہ دو لوگوں کے درمیان کسی اہم موضوع پر ہونے والی گفتگو ہوتی ہے یعنی کسی فرد کی ذات کے اندر جو کچھ موجود ہے، اسے سوالات کی مدد سے باہر نکال کر عوام کے سامنے رکھ دینا۔ اس میں ایک شخص سوالات کے ذریعے دوسرے شخص کی زندگی میں جھانکتا ہے اور اس کے تجربات، مشاہدات اور معلومات کو اس کے اندرون سے باہر نکالتا ہے۔ مصاحبے کی مختلف اقسام ہیں جن میں کاروباری مصاحبہ، ملازمت کے لیے مصاحبہ، شخصی مصاحبہ، قدر پیمائی کے لیے مصاحبہ، ترغیبی مصاحبہ، رسمی مصاحبہ، غیر رسمی مصاحبہ وغیرہ شامل ہیں۔

مصاحبہ کرنے سے پہلے مصاحبہ کرنے والا شخص تیاری کرتا ہے۔ وہ متعلقہ شخص کے شعبے سے متعلق پوچھے جانے والے سوالات کی فہرست تیار کرتا ہے۔ سوالات طے کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان کے جوابات کے ذریعے اس شخص اور اس کے کارہائے نمایاں کے بارے میں مفید اور اہم معلومات حاصل ہوں۔ غیر اہم اور غیر ضروری سوالات کو فہرست میں شامل نہیں کیا جاتا۔ سوالات میں ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے جو متنازعہ یا اختلافی نوعیت کی ہو۔ مصاحبے کے دوران غیر متعلق سوال بھی نہیں کیے جانے چاہئیں۔

جان پہچان

گلزار جاوید ۵/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو میرٹھ، یوپی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (اُردو) کا امتحان پاس کیا۔ وہ اُردو کے معروف افسانہ نگار، صحافی اور ماہنامہ 'چہارسُو' (راول پنڈی) کے مدیر ہیں۔ گزشتہ ۲۸/ برسوں سے شائع ہونے والے اس ادبی رسالے میں کئی معروف ادیبوں کے خصوصی گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ گلزار قومی اور بین الاقوامی شہرت یافتہ تقریباً ۲۵۰/ ادیبوں اور فن کاروں سے مصاحبہ کر چکے ہیں۔ 'براہِ راست، گوش بر آواز' اور 'رنگ برنگی باتیں' کے عنوان سے ان کے ذریعے لیے گئے مصاحبے شائع ہو چکے ہیں۔ 'زبانِ ہند، مٹی کے شوالے' اور 'خود ساختہ ناخدا' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ذیل کا مصاحبہ اُردو کے مشہور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ سے ان کی گفتگو پر مشتمل ہے۔

گلزار جاوید : بلوچستان میں آپ کے بزرگوں کے قیام کا پس منظر کیا ہے؟

گوپی چند نارنگ : میں بلوچستان کے دور دراز علاقے 'دُکی' ضلع لورالائی میں ۱۱/ فروری ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوا۔ میری ددھیال اور ننھیال لیّہ ضلع مظفر گڑھ میں تھیں۔ والد صاحب بلوچستان کے Domicile اور Revenue service میں افسر خزانہ تھے۔

گلزار جاوید : کچھ معلومات بچپن اور گرد و پیش کی اگر حافظے میں محفوظ ہو۔

گوپی چند نارنگ : دُکی کے بعد والد صاحب کا تبادلہ موسیٰ خیل میں ہوا اور تعلیم کی بسم اللہ بھی یہیں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ علاقے کی زبان تو بلوچی اور پشتو تھی لیکن اسکول کا آغاز اُردو قاعدے سے ہوا۔ شروع میں مَیں اسکول سے بہت ڈرتا تھا۔ سالانہ امتحان سے بھی میں خوف زدہ تھا۔ چنانچہ جب سبق پڑھنے کو کہا گیا تو میں نے قاعدہ بند کر کے ڈرتے ڈرتے زبانی سنانا شروع کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب استاد نے کہا بس بس، تم

نہ صرف پاس بلکہ اوّل۔ میرے بڑے بھائی میرے ساتھ تھے۔ یہ واقعہ سب کو بتاتے پھرتے۔

گلزار جاوید : اُردو زبان و ادب سے آپ کے بزرگوں کا تعلق کس نوعیت کا تھا؟

گوپی چند نارنگ : میری والدہ اور دادی کی مادری زبان سرائیکی تھی۔ والد صاحب سرائیکی بھی بولتے تھے اور بلوچی و پشتو بھی۔ وہ فارسی اور سنسکرت بھی جانتے تھے اور اُردو بھی بولتے تھے۔ ان کا دفتری انتظامیہ انگریزی میں تھا۔

گلزار جاوید : تقسیمِ ہند کے بعد اُردو زبان سے 'تعصب اور بیگانگی کی فضا میں' آپ کس جذبے کے تحت اُردو زبان سے اپنا تعلق برقرار رکھ سکے؟

گوپی چند نارنگ : بے شک تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان میں اُردو کے حوالے سے بیگانگی کو راہ ملی۔ ملکوں کا بٹوارا اگر برحق تھا تو زبانوں کا بٹوارا اتنا ہی غلط اور ناحق تھا۔ انٹرمیڈیٹ مَیں نے اجمیر بورڈ سے کیا، بی۔اے پنجاب یونیورسٹی سے۔ پھر ۱۹۵۲ء میں جب میں لیبر انسپکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا، میں نے دہلی کالج میں ایم.اے اُردو میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم.اے فرسٹ کلاس کرنے کے بعد میں نے پی ایچ.ڈی میں داخلہ لیا۔ وظیفہ بھی مل گیا اور یوں بتدریج اُردو سے میرا رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔

گلزار جاوید : بقول آپ کے، آپ کی تربیت میں زبان اور لفظ و معنی کے اثرات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیا اس خیال کے آئینے میں آپ اپنی تربیت کی تفصیل بیان کرنا پسند کریں گے؟

گوپی چند نارنگ : زبان، لفظ اور معنی میرے لیے اس لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ میں اُردو کا اہلِ زبان نہیں ہوں۔ زبان پر قدرت حاصل کرنے میں اگرچہ مجھے ریاضت کرنا پڑی لیکن زیادہ وقت نہیں لگا۔ میری طبیعت میں ایک جمالیاتی حس مضمر ہے جو کارگر ہے اور بہت سے فیصلے اپنے آپ کرتی ہے۔ اُردو کا جادو مجھ پر شروع سے چلنے لگا تھا۔ بلاخوفِ تردید آج بھی معروضی طور پر ثابت کر سکتا ہوں کہ برصغیر کی زبانیں سب اہم ہوں گی، کوئی کسی سے ہیٹی نہیں لیکن اُردو ہندوستان کی زبانوں کا تاج محل ہے۔

گلزار جاوید : پروفیسر صاحب! اُردو زبان سے عدم دلچسپی کے ہندی معاشرے میں ایک ہندو گھرانے کا اس اجنبی زبان و ادب کو اوڑھنا بچھونا بنانے پر کس طرح کے ردّعمل کا سامنا رہا ہوگا؟

گوپی چند نارنگ : میں دسویں کی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دلّی بھیجا گیا۔ والد صاحب نو برس کے بعد ۱۹۵٦ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد ہندوستان آئے۔ ان کی عظیم شخصیت کا مجھ پر ایک احسان یہ بھی ہے کہ اگرچہ وہ چاہتے تھے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے میں سائنس پڑھوں لیکن انھوں نے کبھی اصرار نہیں کیا۔ اُردو وہ خود لکھتے پڑھتے تھے۔ خط کتابت بھی اُردو میں کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہندو گھرانوں میں اُردو سے مغائرت نہیں تھی۔

گلزار جاوید : آپ لکھی ہوئی تقریر ڈائس پر آ کر پڑھنے کی بجائے فی البدیہہ تقریر بہت عمدہ کرتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ؟

گوپی چند نارنگ : اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں؛ اوّل تو یہ کہ فضلِ ربی ہے کہ قدرت کی طرف سے مجھے یہ ملکہ حاصل ہوا ہے۔ میں بولتے وقت سوچ بھی سکتا ہوں۔ گویا زبان و ذہن دونوں کے بیک وقت کام کرنے سے مجھے کوئی اُلجھن نہیں

ہوتی۔ دوسرے یہ کہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنے سے سوچنے کی آزادی سلب ہوجاتی ہے۔ تقریر تو کیا، بس میں سامعین سے ہم کلام ہونے اور دلوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

گلزار جاوید : آپ کے مزاج کی انقلاب آفرینی کس نظریے، تحریک یا جواز کی دین ہے؟

گوپی چند نارنگ : میں کسی ایک نظریے یا تحریک کا پابند نہیں۔ یہ میرے باطنی تجسّس کے خلاف ہے۔

گلزار جاوید : پروفیسر صاحب! تنقید نگار کے ہاں تخلیقی وصف کتنے فی صد ہونا ضروری ہے؟ مثلاً آپ کی شعری تنقید میں سخن فہمی کا بڑا ذکر ہے۔ نثری تنقید میں کون سی بصیرت درکار ہوا کرتی ہے؟

گوپی چند نارنگ : دراصل تنقید و تخلیق کے خانے اتنے الگ الگ نہیں جتنے سمجھے جاتے ہیں۔ اچھی تنقید تخلیقی احساس کے بغیر ممکن نہیں۔ پہلی منزل صاحبِ ذوق ہونا ہے جس میں طبیعت اور مزاج کو بھی دخل ہوتا ہے نیز مطالعے اور تربیت کو بھی، سخن فہمی کی منزل بعد میں آتی ہے۔ 'ادب فہمی' جتنی شاعری پر تنقید کے لیے ضروری ہے، اتنی نثری ادب پر تنقید کے لیے بھی ضروری ہے۔

گلزار جاوید : آپ کے مطابق بول چال کی زبان میں شاعری نہیں ہوسکتی جبکہ شاعری کی زبان میں بول چال ہوسکتی ہے۔ کیا آج کی شاعری بول چال سے اوپر کی سطح کی شاعری ہے؟

گوپی چند نارنگ : شاعر شاعر میں فرق ہوتا ہے۔ اعلیٰ شاعری میں سادہ نظر آنے والی زبان دراصل سادہ نہیں ہوتی۔ اس میں معنی تہ در تہ ہوتے ہیں۔ شاعری تخلیق کا حق اسی وقت ادا کرسکتی ہے جب عام زبان زندہ رہنے والی زبان بن جائے۔

گلزار جاوید : آپ کے خیال میں گزشتہ صدی میں اُردو ادب کی کون سی صنف نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے؟ نیز غزل، نظم، افسانہ اور تنقید کے چار بڑے نام کون سے ہیں اور آج کل ان شعبوں میں لیڈنگ پوزیشن پر کون ہیں؟

گوپی چند نارنگ : ادب کھیل کا میدان نہیں کہ کس نے سنچری زیادہ بنائی یا کس نے زیادہ وکٹیں لیں۔ ادب ایک جدلیاتی عمل ہے جس کا ارتقائی سفر برابر جاری رہتا ہے۔ میری نظر میں گزشتہ صدی میں فکشن کے چار پانچ بڑے ناموں میں پریم چند، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین ضرور شامل ہوں گے۔ شاعری میں فراقؔ گورکھپوری، ن.م. راشدؔ، میراجی، اختر الایمان اور ناصرؔ کاظمی۔ اسی طرح تنقید میں احتشام حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ۔ باقی بڑے نام میرے معاصرین ہیں۔

گلزار جاوید : کیا آپ بھی اُردو زبان کو مسلمانوں سے منسوب کرتے ہیں؟

گوپی چند نارنگ : زبان کا مذہب نہیں ہوتا، زبان کا سماج ہوتا ہے۔ جو لوگ زبانوں کو ایک مذہب تک محدود کرتے ہیں، وہ زبان کے ساتھ بے انصافی کرتے ہیں۔ زبان ایک جمہوری سماجی عمل ہے۔ جو جس زبان کو بولتا ہے، زبان اس کی ہوجاتی ہے۔ اُردو کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے۔ اُردو کو کئی صدیوں تک ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر سجایا سنوارا ہے۔ اگر کوئی اُردو زبان کو مسلمانوں تک محدود کرنا چاہے تو یہ اس کی آزادی ہے لیکن یہ کوتاہ اندیشی بھی ہے جس سے زبان کا نقصان ہوتا ہے۔ آسمان، خوشبو اور ہوا کی طرح زبان بھی سب کے

لیے ہوتی ہے۔

گلزار جاوید : عالمی ادب پر گہری نظر کی روشنی میں یہ فرمائیے کہ کس زبان کے ادب نے آپ کو زیادہ متاثر کیا یا آپ کے خیال میں کس خطے کا ادب زیادہ تہذیب یافتہ اور بامعنی ہے؟

گوپی چند نارنگ : باوجود اس کے کہ میں نے بہت سی زبانوں کے بہت سے شاہکار پڑھے ہیں لیکن جو جمالیاتی حَظ ولطف اپنے ادب میں ملتا ہے، وہ کسی دوسرے ادب سے حاصل نہیں ہوتا۔ میری جڑوں میں پاکستانی بولیوں کے اثرات ہیں تو لامحالہ میرے تحت الشعور میں بابا فرید، بلھے شاہ، شاہ حسین، وارث شاہ اور اس نوع کی لوک روایتیں ہیں۔ اپنی زبان میں مَیں سب سے زیادہ جمالیاتی حَظ میرؔ اور غالبؔ سے پاتا ہوں۔

گلزار جاوید : پروفیسر صاحب! اُردو کے اُدبا وشعرا کاغذ پر بڑے نظر آنے کے باوجود عملی زندگی میں اس سے مختلف کیوں ہوتے ہیں؟ نیز دیگر زبانوں کے قلم کاروں کی کیفیت کیا ہے؟

گوپی چند نارنگ : شاعر کی عملی زندگی ضروری نہیں سو فی صد وہی ہو جو اس کی تخلیقی زندگی ہے۔ شیکسپیئر ایک عام آدمی کی طرح زندگی جیتا تھا۔ غالبؔ جوا کھیلنے کے عمل میں دو مرتبہ ماخوذ ہوئے یا آئے دن وہ لوگوں سے ادھار مانگتے تھے لیکن ان کی شاعری میں ایک جہانِ معنی آباد نظر آتا ہے یا شیکسپیئر کے ڈراموں میں جو پوری کی پوری تہذیبوں کے کردار ہیں یا میرؔ کے یہاں ایک پوری تاریخ، ایک پورے یُگ کا المیہ ہے! عملی زندگی ایک دن ختم ہو جاتی ہے، شعر زندہ رہتا ہے۔ زماں اور مکاں دونوں پر فتح حاصل کرتا ہے۔ زندگی ہار کے مٹ جاتی ہے، لفظ کا جادو بولتا ہے۔ غالبؔ، شیکسپیئر یا میرؔ کی عملی زندگی کب کی ختم ہو چکی لیکن وہ اپنی شاعری میں آج بھی زندہ ہیں۔ یہ زندگی حقیقی زندگی سے کہیں زیادہ بڑی اور کہیں زیادہ حقیقی ہے۔

گلزار جاوید : آپ کے بعد آپ کے گھر پریوار میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

گوپی چند نارنگ : مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میری بیوی اور دونوں لڑکے اَرون اور ترون اُردو پڑھ سکتے ہیں۔ اب ایک کینیڈا میں ہے، دوسرا نیویارک میں۔ ان کی اولاد در اولاد کی زبانیں مستقبل میں کیا ہوں گی، میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اُردو ایسی زبان ہے کہ اس کے دیوانے کہیں نہ کہیں پیدا ہوتے رہیں گے۔

معانی واشارات

ڈومیسائل	شہری	فی البدیہہ	برجستہ
مضمر	چھپا ہوا	انقلاب آفرینی	فکر وخیال یا سماج میں تبدیلی لانا
بلاخوفِ تردید	رد کیے جانے کے خوف کے بغیر	جدلیاتی	بار بار تبدیل ہونے والا
مغائرت	غیر ہونے کا احساس	تحت الشعور	ایک ذہنی کیفیت

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ گوپی چند نارنگ کی پیدائش، خاندانی پس منظر اور تعلیم کا شبکی خاکہ بنائیے۔
۲۔ تقسیمِ ہند کے بعد نارنگ نے اُردو سے جس طرح اپنا تعلق بنائے رکھا، اسے بیان کیجیے۔
۳۔ ملک کی تقسیم کے بعد اُردو کی حالت پر نارنگ کے خیالات قلم بند کیجیے۔
۴۔ نارنگ کی تربیت میں زبان کی اہمیت واضح کیجیے۔
۵۔ ''اُردو ہندوستان کی زبانوں کا تاج محل ہے۔'' اس بات کی استحسانی وضاحت کیجیے۔
۶۔ نارنگ کے والد کی اُردو دوستی پر روشنی ڈالیے۔
۷۔ اپنے تقریر کرنے کے ہنر سے متعلق نارنگ نے دو وجوہات بیان کی ہیں۔ ان پر روشنی ڈالیے۔
۸۔ نارنگ کے مطابق اچھے تنقید نگار کی خوبیاں بیان کیجیے۔
۹۔ ''اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں۔'' اس بات کی حمایت میں نارنگ کے خیالات لکھ کر اپنی ذاتی رائے بھی لکھیے۔
۱۰۔ ''زبان کا مذہب نہیں ہوتا، زبان کا سماج ہوتا ہے۔'' نارنگ کے اس خیال پر روشنی ڈالیے۔
۱۱۔ نارنگ شاعر کی عملی زندگی میں قول و فعل کے تضاد کو اہمیت نہیں دیتے۔ اس تعلق سے ان کے خیالات کی وضاحت کیجیے۔

سرگرمی / منصوبہ

گوپی چند نارنگ کے حوالے سے فکشن، شاعری اور تنقید کے پانچ اہم ادیبوں کی تصانیف کی فہرست بنائیے۔

اضافی معلومات

بلوچی: پاکستان کے صوبے بلوچستان کی اپنی منفرد تہذیبی شناخت ہے۔ بلوچستان میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں کچھ اہم زبانیں بلوچی، براہوئی اور پشتو ہیں۔ اُردو کے ساتھ ساتھ بلوچی بھی بلوچ قوم کی مادری زبان ہے۔ یہ زبان ہند-یورپی زبانوں کے خاندان کی ایک شاخ ہے۔ بلوچی زبان پاکستانی صوبے بلوچستان، ایرانی بلوچستان، سیستان، کردستان اور خلیج فارس کی ریاستوں میں بولی جاتی ہے۔ بلوچستان میں بلوچی کے دو لہجے ہیں جن میں ایک مغربی یا مکرانی بلوچی ہے۔ یہ براہِ راست پہلوی اور سیتھی زبانوں کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خالص عربی حروف نہیں ہیں جو پہلوی کی خصوصیت ہے۔ بلوچی کا دوسرا لہجہ مشرقی ہے جو خالص بلوچی ہے جس میں پنجابی، سندھی اور پشتو کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

پشتو: یہ زبان ہند-آریائی شاخ سے تعلق رکھتی ہے اور ہند-آریائی کی چھوٹی شاخ ایران سے ماخوذ ہے۔ اس میں دراوڑی گروہ کی بعض صوتی خصوصیات شامل ہیں۔ پشتوائی اصوات آریائی اصوات کا حصہ نہیں رہے ہیں، وہ لازمی دراوڑی زبان سے ماخوذ ہیں۔ چین، ترکستان، یونان، ایران اور عرب ممالک سے آئے قبائل نے پشتو زبان کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ یہ زبان زمانۂ قدیم سے دوسری زبانوں جیسے فارسی اور سنسکرت سے الفاظ لیتی رہی ہے۔ اس میں قدیم یونانی، عربی اور ترکی زبان کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ فارسی ادب میں افغانی جبکہ اُردو اور ہندی ادب میں پٹھانی کے نام سے جانی جاتی ہے۔

نثری قواعد

جملے کی تحویل/تقلیب

ذیل کے جملوں کو پڑھ کر ان کے معنی پر غور کیجیے:

- شام کے گلابی سنہرے رنگ افق پر پھیل گئے تھے۔
- شام ہوگئی تھی۔
- وہ شام کتنی خوب صورت تھی!

ان تین جملوں میں دراصل ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ پہلے جملے میں شام ہونے کے واقعے کو اس کے رنگوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس جملے میں ایسا پر تکلف اظہار کیا جائے، اسے **انشائیہ جملہ** کہتے ہیں۔

دوسرا جملہ شام ہونے کی خبر دے رہا ہے، اسے **خبریہ جملہ** کہتے ہیں اور تیسرے جملے میں شام کی خوب صورتی پر اپنے تاثر کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایسے جملے کو **فجائیہ جملہ** کہتے ہیں۔ یہاں بات یا واقعہ ایک ہے (شام ہونا) مگر اسے تین طرح سے کہا گیا ہے اور تینوں جملوں کے معنی 'ایک جیسے' سمجھ میں آرہے ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ ہم ایک ہی خیال کو معنی بدلے بغیر مختلف طرح سے ادا کر سکتے ہیں۔

اب ان جملوں کو پڑھ کر ان کے معنی پر غور کیجیے۔

ا) ابھی کچھ رات باقی تھی۔

۲) ابھی دن نہیں نکلا تھا۔

۳) میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔

۴) مجھے آپ کی کسی بات سے انکار نہیں ہے۔

پہلے اور تیسرے جملے سے مثبت خیال ظاہر ہو رہا ہے۔ ایسے جملوں کو **مثبت جملے** کہتے ہیں۔ دوسرے اور چوتھے جملے میں لفظ 'نہیں' آیا ہے جس کی وجہ سے یہ جملے **منفی جملے** کہلاتے ہیں۔ لیکن انھیں پڑھنے سے معلوم ہو رہا ہے کہ پہلے اور دوسرے دونوں جملوں میں بات ایک ہی کہی گئی ہے۔

مختلف لفظوں میں ادا کیے گئے دو یا زیادہ جملے جب معنی اور مفہوم میں ایک ہوں تو ان کی تبدیلی کو **تحویل** یا **تقلیب** کہتے ہیں۔ اس اُصول کے تحت کسی بھی جملے کو معنی بدلے بغیر دوسرے جملے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ یہ عمل **جملے کی تحویل** یا **جملے کی تقلیب** کہلاتا ہے۔

مشقی سرگرمیاں

* **ہدایات کے مطابق ذیل کے جملوں کی تحویل اس طرح کیجیے کہ ان کے مفہوم میں فرق نہ آئے۔**

ا۔ پھول سے تلوے اس کے، ببول کے کانٹوں سے چھد گئے۔ (استفہامیہ جملے میں تحویل کیجیے)

۲۔ یہی ایک مصرعہ بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا۔ (فجائیہ جملے میں تحویل کیجیے)

۳۔ ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ (مثبت جملے میں تحویل کیجیے)

۴۔ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ (مثبت جملے میں تحویل کیجیے)

۵۔ یہ عمارتیں باغوں سے بھی زیادہ مسرت انگیز ہیں۔ (منفی جملے میں تحویل کیجیے)

۶۔ ان کی نثری تصانیف کم اہمیت کی حامل نہیں۔ (مثبت جملے میں تحویل کیجیے)

استفہامیہ اقراری اور استفہامیہ انکاری جملے

ذیل کے سوالات پڑھ کر ان کے معنی پر غور کیجیے:

- کیا ہمیں بزرگوں کی خدمت نہیں کرنی چاہیے؟
- کیا برا وقت گزر نہیں جاتا؟
- 'جیسی کرنی ویسی بھرنی' کیا یہ بات تم نہیں جانتے؟

اوپر کے تینوں سوالات منفی سوالات ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کے جواب ہمیشہ مثبت ہوتے ہیں۔ ایسے سوالیہ جملوں کو **استفہامیہ اقراری** کہا جاتا ہے یعنی وہ سوال جس کا جواب اقرار/ اثبات میں ہو۔ پہلے سوال کا جواب ہوگا: خدمت کرنی چاہیے، دوسرے کا جواب ہوگا؛ گزر جاتا ہے۔ تیسرے کا جواب ہوگا: جانتا ہوں۔

اب اِن سوالوں کو پڑھ کر ان کے معنی پر غور کیجیے:

- کیا محتاجوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے؟
- کیا دن رات ہمیشہ برابر ہوتے ہیں؟
- تم سمجھتے ہو کہ میں مجبور ہوں؟

تینوں سوالات مثبت ہیں مگر ان کے جوابات ہمیشہ منفی ہوتے ہیں۔ ایسے سوالیہ جملوں کو **استفہامیہ انکاری** کہا جاتا ہے یعنی وہ سوال جس کا جواب منفی/ انکاری ہو۔ پہلے سوال کا جواب: ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرے سوال کا جواب: برابر نہیں ہوتے اور تیسرے سوال کا جواب: میں مجبور نہیں ہوں۔

مشقی سرگرمیاں

٭ ذیل کے جملوں کے استفہام کو اقرار یا انکار میں تبدیل کیجیے۔

۱۔ اگر تمھارے دل میں طلب صادق نہ ہوتی تو میں کیا کر سکتی تھی؟

۲۔ پھر نا اُمیدی اور حسرت نصیبی کا کیا سبب؟

۳۔ ہائے، مجھ سے زندہ کیوں کر رہا جائے گا؟

۴۔ کیا یہی فردوسِ بریں نہیں ہے؟

اضافی معلومات

سرائیکی: ملتان کی قدیم بولی 'آسوکی' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ زمانے کے تغیرات کے ساتھ آسوکی میں بھی تبدیلی ہوتی گئی جو آسرکی اور سراواکی کے بعد سرائیکی ہوئی اور اسی نام سے مروّج ہوئی۔ سرائیکی ادب بھی دیگر ادبی سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ کرتا ہے۔ اس ادب میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی شاعری موجود ہے۔ سچل سرمست، بیدل سندھی، لطف علی، خواجہ غلام فرید، غلام رسول ڈاڈا، ممتاز حیدر ڈاہر، شاکر مہروی وغیرہ سرائیکی زبان کے معروف محقق، لغت نگار اور دانشور ہیں۔

جملوں کا نحوی تجزیہ

مفرد جملہ:

رات بھر	خوب بارش ہوئی
مبتدا	خبر

مرکب جملہ:

میں اس سے ملنے گیا	مگر	وہ گھر پر نہیں تھا۔
مفرد جملہ (۱)	حرفِ عطف	مفرد جملہ (۲)
میں (مبتدا) اس سے ملنے گیا (خبر)		وہ (مبتدا) گھر پر نہیں تھا (خبر)

مخلوط جملہ:

وہ لڑکا	جو	پیڑ کے نیچے کھڑا ہے	میرا ہم جماعت ہے۔
		تابع فقرہ	اصل فقرہ
مبتدا	ضمیر موصولہ	خبر (۱)	خبر (۲)

آپ ابتدائی جماعتوں میں پڑھ چکے ہیں کہ عام طور پر جملے کے دو حصے ہوتے ہیں (۱) مبتدا (۲) خبر۔ دو مفرد جملوں کو اگر حروفِ عطف سے جوڑا گیا ہے تو ایسے جملے **مرکب جملے** کہلاتے ہیں۔ اسی طرح اگر جملے میں ضمیر موصولہ (جو/ جس/ جن) ہو اور اس سے پہلے یا بعد جملے کا حصہ معنی میں ادھورا ہو تو ایسے جملے **مخلوط جملے** کہلاتے ہیں۔

اوپر کی مثالوں کو غور سے دیکھیں اور پڑھیں تو مفرد، مرکب اور مخلوط جملوں کی ساخت (بناوٹ) سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ہر قسم کے جملے کی ساخت کو **نحوی ساخت** کہتے ہیں۔ نحوی ساخت کے اجزا کو الگ کرنے کا عمل **نحوی تجزیہ** کہلاتا ہے۔ (جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں جملوں کا تجزیہ کیا گیا ہے)

مشقی سرگرمیاں

* **جملوں کی قسمیں لکھ کر ان کا نحوی تجزیہ کیجیے۔**

۱۔ اب اندر آرام سے بیٹھ کر دیکھو کہ خداوند جل وعلا نے تمھارے لیے کیسی کیسی لذتیں فراہم کی ہیں۔

۲۔ زمرد یہاں کی تمام عجوبہ چیزیں اسے دِکھاتی پھرتی تھی۔

۳۔ دونوں ایک ایسی وادی میں پہنچے جو ہر طرف سے پہاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔

طور

ذیل کے جملے پڑھیے۔

- میں یہ کتاب پڑھ چکا ہوں۔
- اس نے میری بات کاٹ دی۔
- ہمارے فوجیوں نے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے۔

ان جملوں سے ظاہر ہے کہ ان کے فعل کا اثر کسی نہ کسی مفعول پر ضرور پڑ رہا ہے۔ پہلے جملے میں 'مَیں' فاعل ہے، 'کتاب' مفعول ہے اور 'پڑھ چکا ہوں' فعل ہے یعنی میں (فاعل) کے پڑھنے (فعل) کا اثر کتاب (مفعول) پر پڑتا ہے۔ دوسرے جملے میں اس نے (دراصل وہ) فاعل ہے، 'میری بات' مفعول اور 'کاٹ دی' فعل ہے۔ اس (فاعل) کے کاٹنے (فعل) کا اثر میری بات (مفعول) پر پڑتا ہے۔ اسی طرح تیسرے جملے میں

’ہمارے فوجی‘ (فاعل)، ’دشمن‘ (مفعول) اور ’چھکے چھڑا دیے‘ (فعل) ہے۔ یہاں فوجیوں (فاعل) کے چھکے چھڑانے (فعل) کا اثر دشمنوں (مفعول) پر پڑتا ہے۔

اس تجزیے سے واضح ہے کہ کسی جملے میں فاعل کے فعل کا اثر مفعول پر پڑتا ہے۔ جملے میں ایسے عمل کے طور کو **طورِ معروف** کہتے ہیں یعنی جس کا فاعل معروف (جانا پہچانا) ہے۔

اب ذیل کے جملے پڑھ کر ان کے فاعل، مفعول اور فعل پر غور کیجیے۔

۱۔ رسّی کاٹ دی گئی۔

۲۔ پھول گلدانوں میں سجائے گئے۔

۳۔ وقت رہتے ٹکٹ بھی خرید لیے گئے۔

پہلے جملے میں ’رسّی‘ مفعول اور ’کاٹ دی گئی‘ فعل ہے۔ دوسرے جملے میں ’پھول‘ مفعول اور ’سجا دیے گئے‘ فعل ہے اور تیسرے جملے میں ’ٹکٹ‘ مفعول اور ’خرید لیے‘ فعل ہے۔

تینوں جملوں میں فاعل کون ہے، معلوم نہیں لیکن جملوں کا مفہوم بتاتا ہے کہ ہر جملے میں کوئی نہ کوئی فاعل ضرور ہے جس کا ذکر جملے میں نہیں کیا گیا ہے یعنی رسّی کاٹنے والا، پھول سجانے والا اور ٹکٹ خریدنے والا۔ جملے میں ایسے عمل کے طور کو **طورِ مجہول** کہتے ہیں یعنی جس کا فاعل مجہول (نامعلوم) ہے۔

جملے کے طور کی ایک تیسری قسم بھی ہے۔ یہ جملے پڑھیے۔

۱۔ ہوا چلی۔

۲۔ دن نکلا۔

۳۔ گھوڑے دوڑ پڑے۔

پہلے جملے میں ’ہوا‘ فاعل اور ’چلی‘ فعل ہے۔ دوسرے جملے میں ’دن‘ فاعل اور ’نکلا‘ فعل ہے۔ تیسرے جملے میں ’گھوڑے‘ فاعل اور ’دوڑ پڑے‘ فعل ہے۔ ان سب جملوں میں مفعول نہیں پایا جاتا۔ یہاں کہہ سکتے ہیں کہ فاعل کے فعل کا اثر خود فاعل پر پڑ رہا ہے۔ جملے میں ایسے عمل کے طور کو **طورِ معدولہ** کہتے ہیں یعنی جس کا مفعول غیر موجود ہے۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کے جملوں کے طور تبدیل کیجیے اور ان کے نام لکھیے۔

۱۔ مجھے اس عظیم عہدے کا مستحق سمجھا گیا ہے۔

۲۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رُکی۔

۳۔ جلسے میں رہنمائے قوم دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔

لفظ سازی

ہماری زبان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ دیگر زبانوں کے الفاظ کو بڑی آسانی سے قبول کرلیتی ہے۔ اُردو میں عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے بہت سے الفاظ رواج پا گئے ہیں۔لفظوں کے استعمال کی ضرورت کے پیشِ نظر مذکورہ زبانوں کے الفاظ اُردو میں ایک دوسرے سے جوڑ کر بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔اس طرح کی لفظ سازی سے زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں خوب اضافہ ہوا ہے جس کی چند مثالیں ذیل میں دی جارہی ہیں۔

ہندی + ہندی : ان لفظوں کو پڑھ کر ان کی بناوٹ پر غور کیجیے :

آپ بیتی، آگ بگولا، ٹڈی دَل، باگ ڈور، بن مانس، جل ترنگ، جنم دن، چاند گہن، چڑیا گھر، دیا سلائی، بیل گاڑی وغیرہ۔

یہ لفظی مرکبات ہندی کے دو اسموں کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔

فارسی + فارسی : ان لفظوں کو پڑھ کر ان کی بناوٹ پر غور کیجیے۔

زبان دراز، پاک دامن، آتش فشاں، زبردست، دل آزار، نیک بخت، شکر پارہ، سینہ زور، بیش بہا وغیرہ۔

یہ لفظی مرکبات فارسی کے دو لفظوں کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔

عربی + عربی : ان لفظوں کو پڑھ کر ان کی بناوٹ پر غور کیجیے۔

بقرعید، جامع مسجد، حاضر جواب، عالی شان، صدر مقام، صاحب کمال، خیر مقدم، تکیہ کلام، وعدہ خلاف وغیرہ۔

یہ لفظی مرکبات عربی کے دو لفظوں کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔

ہندی + فارسی : ان لفظوں کو پڑھ کر ان کی بناوٹ پر غور کیجیے۔

نیک چلن، گلاب جامن، گھوڑے سوار، تار گھر، چور دروازہ، گھر داماد، منہ زور وغیرہ۔

یہ لفظی مرکبات ایک ہندی اور ایک فارسی لفظ کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔

عربی + ہندی : ان لفظوں کو پڑھ کر ان کی بناوٹ پر غور کیجیے۔

امام باڑہ، عجائب گھر، موتی محل، عید ملن وغیرہ۔

یہ لفظی مرکبات عربی اور ہندی لفظوں کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔

فارسی + عربی : ان لفظوں کو پڑھ کر ان کی بناوٹ پر غور کیجیے۔

آتش مزاج، حرام مغز، سفرخرچ، دستخط، شیش محل، گاؤ تکیہ، نازک خیال، عالی خاندان، تیز مزاج وغیرہ۔

یہ لفظی مرکبات فارسی اور عربی لفظوں کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔

انگریزی + ہندی : ان لفظوں کو پڑھ کر ان کی بناوٹ پر غور کیجیے۔

ریل گاڑی، جیل خانہ، ٹکٹ گھر، نمبردار، فلم اداکار، کورٹ کچہری، نوٹ بندی وغیرہ۔

یہ لفظی مرکبات انگریزی اور ہندی لفظوں کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔

ذیل کے لفظوں کو پڑھ کر ان پر غور کیجیے :

میٹھا سے مٹھائی | کالا سے کالک | موٹا سے موٹاپن/ مُٹاپا | چار سے چوتھائی | زندہ سے زندگی

ان مثالوں میں پہلے خانے کے الفاظ صفت ہیں۔ دوسرے خانے میں انھی صفات میں کچھ تبدیلی سے جو لفظ بنے ہیں، وہ اسم ہو گئے ہیں یعنی 'میٹھا' صفت ہے اور اس سے بننے والا لفظ 'مٹھائی' اسم ہے۔

اب ان مثالوں کو دیکھیے۔

آنا سے آہٹ | سینا سے سلائی | سجانا سے سجاوٹ | کھیلنا سے کھیل | پھسلنا سے پھسلن | آزمانا سے آزمائش

ان خانوں میں پہلے خانے کے الفاظ فعل کے مصدر ہیں۔ دوسرے خانے میں انھی مصدروں میں کچھ تبدیلی سے جو لفظ بنے ہیں، وہ اسم ہو گئے ہیں یعنی 'آنا' فعل ہے اور اس سے بننے والا لفظ 'آہٹ' اسم ہے۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کے لفظی مرکبات کو جدول کے مطابق تقسیم کیجیے۔

خوش پوش ، تیز دھار ، تراش خراش ، تیز قدم ، چال ڈھال ، تفریح گاہ ، ڈاک ٹکٹ ، مٹر گشت ، ادھ کھلا پھول ، خوشبو دار تیل ، بیش قیمت ، گرم جوشی ، نوعمر ، کتب خانہ ، لغت نویسی ، بس اڈّا ، کفن چور

عربی + ہندی	فارسی + فارسی	فارسی + ہندی	عربی + فارسی	عربی + عربی	ہندی + ہندی	انگریزی + ہندی

* ذیل کی صفات سے اسم بنائیے۔

صفات	اسم
کمزور	
دبلا	
سفید	
گندہ	
محنتی	

* ذیل کے افعال سے اسم بنائیے۔

افعال	اسم
بخشنا	
جلنا	
اُکتانا	
لگنا / لگانا	
اُترنا	

حصّۂ نظم

۱ حمدیہ رباعیات

مرزا سلامت علی دبیرؔ

پیشِ درس

شاعری میں قصیدہ، مرثیہ، حمد اور نعت کی اصناف اپنے موضوعات سے پہچانی جاتی ہیں۔ حمد کا موضوع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ حمدیہ شاعری میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جاتی ہے اور حمد کی ظاہری ہیئت مختلف نظموں میں مختلف ہوسکتی ہے یعنی حمد کے اشعار غزل یا قصیدے کے شعروں کی طرح مقفّیٰ ہوسکتے ہیں یا کم و بیش مصرعوں کے بندوں میں بھی حمد لکھی جاسکتی ہے۔ کبھی شاعر صرف چار مصرعوں میں اللہ کی تعریف کو مکمل کردیتا ہے۔ ان چار مصرعوں کا وزن بحر ہزج کا ایک خاص وزن ہو تو اسے 'رباعی' کہتے ہیں۔ اب تک کی جماعتوں میں آپ نے مختلف ہیئتوں والی حمدیں پڑھی ہیں۔ یہاں حمد کو رباعی کی ہیئت میں پیش کیا جارہا ہے۔

پہلی رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر شے کا خالق ہے (خلاقِ ماہ و ماہی)، وہی اپنے بندوں کو تاج و تخت اور دولت سے نوازتا (بخشندۂ تاج و تختِ شاہی) اور وہ بے مانگے بھی اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا رہتا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ." دوسری رباعی میں اس بات کو شاعر یوں کہتا ہے کہ پروانہ جو شمع کی طرف لپک رہا ہے، وہ شمع کی لو کی طرف نہیں، اللہ کے نور کی طرف لپک رہا ہے۔ چاند سورج، ستاروں میں اللہ تعالیٰ ہی کا نور ہے بلکہ ہر روشن شے میں اللہ تعالیٰ کا نور دمک رہا ہے۔

تیسری رباعی میں "وتعزمن تشاءُ" کا مضمون نظم کیا گیا ہے کہ اللہ کی قدرت قطرے کو گوہر بناتی ہے۔ اللہ کی قدرت ہی سے سرو بلندی حاصل کرتا ہے۔ پھولوں میں رنگ و بو بھی اللہ کے دم سے ہے۔ اپنے آپ کو کچھ سمجھنا غلط ہے۔ اگر اللہ عزت نہ دے تو ہر چیز کی اہمیت، ہر شخص کا وقار بیکار ہے۔

چوتھی رباعی میں بندے سے اللہ تعالیٰ کے اٹوٹ رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ حضرت خضرؑ جنگل بیابانوں سے تو واقف ہیں مگر عدم کے صحرا کی انھیں خبر نہیں۔ موت کے بعد انسان کی روح اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اب بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔

آخری رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ میں بڑا گناہ گار ہوں بلکہ گناہوں کی وجہ سے قلم کی سیاہی سے زیادہ سیاہ ہوگیا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے گناہ جتنے زیادہ ہیں، اللہ تعالیٰ کی غفاری کا معاملہ بھی میرے ساتھ اتنا ہی زیادہ ہے۔ تیسرے مصرعے میں شاعر نے بہت احتیاط سے کہا ہے کہ اسے میری جرأت نہ سمجھیں کہ خدا اور مَیں دونوں اپنی اپنی جگہ یکتا ہیں۔ گناہوں میں مجھ سا کوئی نہیں اور مغفرت میں اللہ جیسا کوئی نہیں۔

جان پہچان

مرزا دبیرؔ کا اصل نام مرزا سلامت علی تھا۔ ان کے اجداد ایران سے آئے تھے۔ وہ ۲۹؍ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔ وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عربی اور فارسی کے علاوہ دیگر علوم میں بھی انھوں نے مہارت حاصل کی۔ شاعری کی طرف میلان دیکھ کر ان کے والد نے انھیں اس وقت کے مشہور مرثیہ گو شاعر میر مظفر حسین ضمیرؔ کی شاگردی میں دے دیا۔ میر ضمیرؔ نے اپنے شاگرد کا تخلص دبیرؔ رکھا۔

مرزا دبیرؔ نے رباعی، قطعہ، مثنوی، سلام اور قصیدے بھی کہے ہیں۔ لطیف تشبیہوں، دلآویز استعاروں اور صنائع بدائع کی فراوانی نے مرزا دبیرؔ کے کلام کو ایک انفرادیت بخشی۔ وہ مضمون آفرینی اور مبالغہ آرائی میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مرثیے 'دفترِ ماتم' کے نام سے بیس جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ دبیرؔ نے ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں وفات پائی اور اپنے مکان ہی میں دفن ہوئے۔

یا رب ، خلّاقِ ماہ و ماہی تو ہے
بخشندۂ تاج و تختِ شاہی تو ہے
بے مِنّت و بے سوال و بے اِستحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی ، تو ہے

☆

پروانے کو دُھن ، شمع کو لَو تیری ہے
عالم میں ہر اک کو تگ و دو تیری ہے
مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب
جس نور کو دیکھتا ہوں ، ضو تیری ہے

☆

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو ، گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تشخّص ہے ، تصنّع بے سود
عزّت وہی عزّت ہے جو تو دیتا ہے

☆

صحرائے عدم سے خضر آگاہ نہیں
اس راہ میں ، روح تک بھی ہمراہ نہیں
صحت میں ، مرض میں ، رنج و راحت میں دبیرؔ
بندے کا کوئی سوائے اللہ ، نہیں

☆

خامہ بھی مری طرح سیہ کار نہیں
یہ مشقِ گناہ کسی کو زنہار نہیں
گر خوفِ برابری نہ ہو ، صاف کہوں
مجھ سا عاصی ، خدا سا غفار نہیں

معانی و اشارات

لفظ	معنی
خلّاق	بہت تخلیق کرنے والا
بخشندہ	عطا کرنے والا
استحقاق	حق
لَو	محبت، لگن، چاہت
تگ و دو	بھاگ دوڑ مراد تلاش
مصباح	چراغ
تشخّص	شخصیت، مراد شناخت
صحرائے عدم	عدم کا ریگستان، مراد بہت بڑا بیابان (موت کے بعد کا عالم)
زنہار	ہرگز

مشقی سرگرمیاں

* رباعی کی تعریف بیان کیجیے۔
* رباعیات کا بغور مطالعہ کرکے ذیل کی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

(۱)

* شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

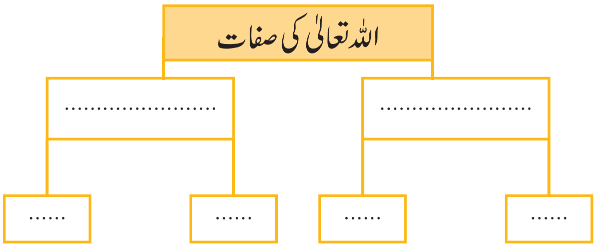

* اللہ کی صفات کو ظاہر کرنے والے الفاظ کی مناسبت سے خاکے میں موزوں لفظ لکھیے۔

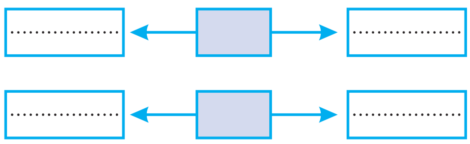

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

ا۔ رباعی کی روشنی میں اللہ کی صفات کو واضح کیجیے۔

۲۔ خدا کی جانب سے 'بے منت و بے سوال و بے استحقاق' ملنے والی چند نعمتوں کا ذکر کیجیے۔

۳۔ رباعی کے کسی ایک قافیے کا استعمال اپنے جملے میں کیجیے۔

۴۔ رباعی کا مفہوم واضح کیجیے۔

(۲)

* خاکہ مکمل کیجیے۔

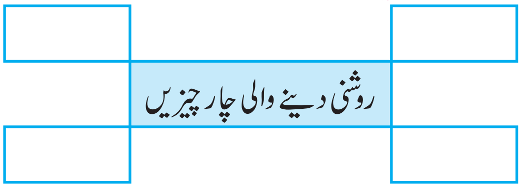

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

ا۔ رباعی میں استعمال ہونے والی صنعت کو واضح کرکے اس کا نام لکھیے۔

۲۔ رباعی میں باندھے گئے مضمون کو بیان کیجیے۔

۳۔ 'عالم میں ہر اک کو تگ و دو تیری ہے' اس مصرعے کی وضاحت کیجیے۔

(۳)

* رباعی کی مدد سے خاکے میں موزوں الفاظ لکھیے۔

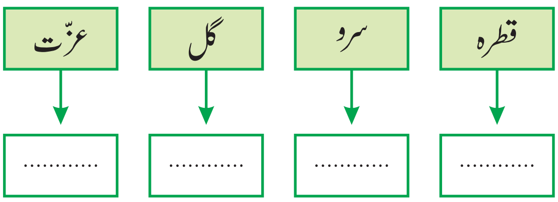

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

ا۔ تشخص اور تصنع کے مرادی مفہوم تحریر کیجیے۔

۲۔ 'عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے' مصرعے کی وضاحت کیجیے۔

۳۔ رباعی کے مضمون کو بیان کیجیے۔

۴۔ 'قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے' مصرعے کی وضاحت کیجیے۔

۵۔ درج ذیل شعر کے معنوی حسن کو واضح کیجیے۔

بیکار تشخص ہے ، تصنع بے سود
عزّت وہی عزّت ہے جو تو دیتا ہے

(۴)

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ 'صحرائے عدم سے خضر آگاہ نہیں'، واضح کیجیے۔

۲۔ اس رباعی میں استعمال ہونے والی صنعت لکھیے۔

۳۔ رباعی کا مرکزی خیال واضح کیجیے۔

۴۔ درج ذیل شعر کا مطلب بیان کیجیے۔

صحت میں ، مرض میں ، رنج و راحت میں دبیؔر
بندے کا کوئی سوائے اللہ ، نہیں

(۵)

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ 'خامہ بھی میری طرح سیہ کار نہیں' اس مصرعے کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۲۔ 'مشقِ گناہ' کے معنی و مفہوم واضح کیجیے۔

۳۔ رباعی کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔

۴۔ اس رباعی میں 'سیہ کار'، 'زنہار' اور 'غفار' قافیے استعمال ہوئے ہیں۔ آپ اسی طرح کے مزید چار قافیے لکھیے۔

۵۔ 'کار' لاحقے کا استعمال کر کے چار نئے الفاظ کا شبکی خاکہ بنائیے۔

سرگرمی/منصوبہ

رباعیات کا ایک منصوبہ تیار کیجیے جس میں رباعی کی تعریف، بحر کے علاوہ شاعر کا نام، تعارف اور اس کے دیوان کا تذکرہ شامل ہو۔

۲

نعتِ رسولؐ

حفیظؔ جالندھری

پیشِ درس

نعت کے لغوی معنی تو تعریف کے ہیں مگر اصطلاح میں حضرت محمد ﷺ کی مدح سرائی کو نعت کہا جاتا ہے۔ اس صنفِ شاعری کا آغاز عربی زبان میں حضورؐ کے زمانے سے ہوا اور حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت کعبؓ بن زُہیر جیسے مشہور صحابی شعرا نے اس صنف کو خوب پروان چڑھایا۔ عربی، فارسی سے ہوتی ہوئی یہ صنف اُردو میں آئی اور کافی مقبول ہوئی۔ نعت میں آپؐ کی تعریف و توصیف کے علاوہ آپؐ کی سیرت کے واقعات بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ جیسے آپؐ کی ولادت، آپؐ کی ہجرت، واقعۂ معراج وغیرہ۔ طلبہ کو یاد ہوگا کہ انھوں نے دسویں جماعت میں حضرت محمد ﷺ کے طائف کے سفر پر مشتمل نعت پڑھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو حقیقی معبود کی عبادت کا سبق دیا۔ آپؐ نے سماج کے پچھڑے ہوئے لوگوں کو ان کی پرہیزگاری کے سبب اونچے مرتبے پر بٹھایا۔ امیر غریب، غلام آقا، سب کو آپؐ کی تعلیم نے برابر کردیا۔ آپؐ جو پیغام لائے اس نے ظالم بادشاہوں کی حکومت ختم کرکے انصاف پسند حکمرانوں کو عوام اور خواص میں مقبول بنایا۔ آپؐ کی سیرت کی پیروی سے معاشرے میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ آپؐ کا نامِ نامی فرشتوں کی دعا اور اذان کے کلمات میں گونجتا رہتا ہے۔ خود اللہ نے قرآن میں آپؐ کی تعریف کی اور آپؐ پر درود بھیجنے کی تاکید فرمائی ہے۔

جان پہچان

حفیظؔ جالندھری ۱۴؍جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی شمس الدین حافظِ قرآن تھے۔ حفیظؔ نے پہلے قرآن حفظ کیا، بعد میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ انھیں بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے غزلیں، نظمیں اور گیت لکھے ہیں۔ 'شاہنامہ اسلام' نے ان کی شہرت میں اضافہ کیا۔ یہ ایک طویل نظم ہے اور اس میں اسلامی تاریخ کو منظوم کیا گیا ہے۔ حفیظؔ جالندھری کا انتقال ۲۱؍دسمبر ۱۹۸۲ء کو لاہور میں ہوا۔ ان کی مشہور کتابیں 'نغمہ زار، سوز و ساز، تلخابۂ شیریں' وغیرہ ہیں۔

محمد مصطفیٰؐ مہرِ سپہرِ اَوجِ عرفانی
ملی جس کے سبب تاریک ذرّوں کو درخشانی

کیا ساجد کو شیدا جس نے مسجودِ حقیقی پر
جھکایا عبد کو درگاہِ معبودِ حقیقی پر

دلائے حق پرستوں کو حقوقِ زندگی جس نے
کیا باطل کو غرقِ موجۂ شرمندگی جس نے

غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا
یتیموں کے سروں پر کر دیا اقبال کا سایا

گداؤں کو شہنشاہی کے قابل کر دیا جس نے
غرورِ نسل کا افسون باطل کر دیا جس نے

وہ جس نے تخت اوندھے کر دیے شاہانِ جابر کے
بڑھائے مرتبے دنیا میں ہر انسانِ صابر کے

دلایا جس نے حق انسان کو عالی تباری کا
شکستہ کر دیا ٹھوکر سے بت سرمایہ داری کا

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں مؤذّن کی اذانوں میں

وہ جس کے معجزے نے نظمِ ہستی کو سنوارا ہے
جو بے یاروں کا یارا ، بے سہاروں کا سہارا ہے

ثنا خواں جس کا قرآں ہے، ثنا ہے جس کی قرآں میں
اُسی پر میرا ایماں ہے ، وہی ہے میرے ایماں میں

معانی و اشارات

مہرِ سپہرِ اوجِ عرفانی	عرفان (اللہ تعالیٰ کے وجود کی سمجھ) کے بلند آسمان کا سورج مراد رسولِ اکرمؐ
درخشانی	چمک دمک
مسجودِ حقیقی	مراد اللہ تعالیٰ
درگاہِ معبودِ حقیقی	مراد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ
غرقِ موجۂ شرمندگی	شرمندگی کی موج میں ڈوبا ہوا مراد بہت شرمندہ
سریرِ سلطنت	حکومت کا تخت
اقبال کا سایا	عظمت کا سایہ
افسون باطل کرنا	جادو کے اثر کو ختم کرنا
شاہانِ جابر	ظالم بادشاہ
عالی تباری	اونچا مرتبہ
نظمِ ہستی	زندگی کا نظام
یارا	زور، طاقت، حوصلہ

مشقی سرگرمیاں

* حضورؐ کی کوششوں کے متعلق نعت سے مناسب فقرے تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے
- قابل کر دیا ← ....
- باطل کر دیا ← ....
- اوندھے کر دیے ← ....
- حق دِلا دیا ← ....

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ نبی اکرمؐ نے بندوں کا تعلق خدا سے جوڑ دیا، شاعر کے اس خیال کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ نظم کے مطابق دنیا کے مظلوموں پر حضورؐ کے احسانات کو بیان کیجیے۔

۳۔ زمین و آسمان میں حضورؐ کے تذکرے کی خصوصیت بیان کیجیے۔

۴۔ حقوقِ انسانی کے پس منظر میں آپؐ کی عظمت بیان کیجیے۔

۵۔ صنعتِ تضاد کے اشعار تلاش کر کے لکھیے۔

۶۔ نظم کے حوالے سے حضورؐ کے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے بارے میں لکھیے۔

۷۔ نظم 'نعتِ رسولؐ' کا خلاصہ لکھیے۔

۸۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

(i) غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا
تیموں کے سروں پر کر دیا اقبال کا سایا

(ii) ثنا خواں جس کا قرآں ہے، ثنا ہے جس کی قرآں میں
اُسی پر میرا ایماں ہے، وہی ہے میرے ایماں میں

* ذیل کے اسموں کو فاعل اور مفعول میں تبدیل کیجیے۔

اسم	فاعل	مفعول
سجدہ	....	....
عبادت	....	....
جبر	....	....
خدمت	....	....

سرگرمی/منصوبہ

۱۔ 'دلایا جس نے حق انسان کو عالی تباری کا' اس عنوان پر مضمون لکھیے۔

۲۔ حضورؐ کی سیرت پر مبنی کسی ایک کتاب کا مطالعہ کر کے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

۳۔ مختلف شعرا کی پانچ نعتیں تلاش کر کے شاعر کے نام اور تعارف پر مبنی منصوبہ تیار کیجیے۔

٣

عشقِ حقیقی

نواب مرزا شوقؔ لکھنوی

پیش درس

کہانیاں کہنا سننا انسانی فطرت ہے۔ کہانی نثر میں بھی ہوتی ہے اور نظم میں بھی۔ دنیا بھر میں منظوم کہانیاں سننے سنانے کا رواج ہر زمانے میں پایا جاتا رہا ہے۔ اُردو شاعری میں مثنوی ایک ایسی صنف ہے جس میں کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے اور اخلاق و نصیحت کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔ مثنوی کے قصوں میں دیووں، پریوں کے تخیلی واقعات، بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی محبت اور نفرت کے قصے، جادوئی چیزوں اور عجیب وغریب جانوروں وغیرہ کی تلاش کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ میر حسنؔ کی مثنوی 'سحر البیان' اور دیاشنکر نسیمؔ کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' ایسی ہی مشہور مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ نواب مرزا شوقؔ کی مثنویاں 'فریبِ عشق، بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' بھی اُردو شاعری کا بڑا سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔

مثنوی میں اکثر کچھ کرداروں کے عشق و محبت کے حوالوں سے شاعر تصوف کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مثنوی 'بہارِ عشق' میں شاعر نے خود اپنے حالات نظم کیے ہیں۔ 'عشقِ حقیقی' کے عنوان سے مثنوی کے آخر میں جو اشعار شاعر نے سنائے ہیں، ان میں دنیا کے عیش کو ترک کر کے آخرت کی لذتوں کو حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تجھے عشق کرنا ہے تو خدا سے کر مگر اس سے پہلے شاعر کا خیال ہے کہ انسان کو انسان سے عشق کرنا چاہیے۔ یہ انسان دوستی کا پیغام دیتا ہے۔

اس نظم میں حقیقت اور مجاز، فنا اور بقا، اوّل اور آخر، وصل اور جدائی جیسے تضادات سے شاعر نے بڑی حکمت اور عقل کی باتیں کی ہیں۔

عشق ایک والہانہ جذبہ ہے جس کا مفہوم کسی سے بہت زیادہ محبت کرنا سمجھا جاتا ہے۔ کہانیوں، مثنویوں میں انسانی عشق کی دیگر مثالیں مجنوں، فرہاد، رانجھا وغیرہ کے عشق سے دی جاتی ہیں جو انھیں لیلیٰ، شیریں اور ہیر سے تھا۔ شاعری میں اکثر ایسے عشق کو مجازی عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی محبت کے جذبے کی نسبت اللہ کی ذات سے ہو جائے تو اسے عشقِ حقیقی کہتے ہیں۔ شوقؔ کی مثنوی 'بہارِ عشق' میں مجازی عشق کی انسانی نفسیات کی طرف اشارہ ملتا ہے جسے وہ مثنوی کے خاتمے پر عشقِ حقیقی میں بدلنے کی خواہش کرتے ہیں۔

جان پہچان

شوقؔ لکھنوی کا نام حکیم تصدق حسین خان ہے۔ ان کی عرفیت نواب مرزا اور تخلص شوقؔ ہے۔ ان کی پیدائش ٦؍جنوری ١٧٨٢ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ حکمت اور طبابت ان کا آبائی پیشہ تھا۔ انھوں نے واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں شاہی طبیب کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل کرنے کے بعد ذاتی شوق اور اساتذہ کی صحبت میں رہ کر انھوں نے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ اس وقت کے لکھنؤ کے شعری ماحول سے متاثر ہو کر وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شاگردی اختیار کی۔ ابتدائی دور میں انھوں نے غزل میں طبع آزمائی کی مگر بہت جلد مثنوی کی طرف رجوع ہوئے اور اسی صنف میں کمال حاصل کیا۔ انھوں نے 'فریبِ عشق، بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' جیسی معرکہ آرا مثنویاں تصنیف کیں۔ ان کی ہر مثنوی سیکڑوں اشعار پر مشتمل ہے۔ روزمرہ اور محاوروں کی صفائی، قافیوں کی نشست، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے یہ مثنویاں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ مرزا شوقؔ لکھنوی نے ٣٠؍جون ١٨٧١ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

اب سنیں صاحبانِ عقل و شعور
ہے یہ دنیا تمام مکر اور زوٗر

شہد ظاہر میں ، زہر اندر ہے
جس قدر اِس سے بھاگے ، بہتر ہے

صاحبِ عقل کو نہیں ہے زیب
کہ اُٹھائے جہاں میں رہ کے فریب

سب یہ دنیا ، سرائے فانی ہے
عشقِ معبود جاودانی ہے

کہتے ہیں صوفیانِ صافی دل
کہ ہے عشقِ خدا بہت مشکل

کوئی اُلفت نہ بے وفا سے کرے
عشق کرنا ہو تو خدا سے کرے

چار دن کی یہ زندگانی ہے
جو ہے اِس کے سوا ، وہ فانی ہے

وہی اوّل میں ہے ، وہی آخر
وہی باطن میں ہے ، وہی ظاہر

کون سی جا ہے جس جگہ وہ نہیں
چاہیے ہے نگاہِ وحدت بیں

کرتے اِس واسطے ہیں عشقِ مجاز
تا حقیقت کا کچھ ہو ظاہر راز

منہ سے کہتا نہیں ، جو پاتا ہے
دل ہی اِس کا مزہ اُٹھاتا ہے

اس میں ہر اک کو امتیاز نہیں
منہ تلک آئے ، یہ وہ راز نہیں

لکھتے ہیں صوفیانِ با توقیر
عشقِ اللہ ہے عجب اِکسیر

جس کو اُس در تلک رسائی ہے
دین و دنیا کی بادشائی ہے

مثلِ سیماب دل کی ہے تاثیر
خاک ہو جاوے تب بنے اِکسیر

دنیا کہتے ہیں جس کو ، پردا ہے
باقی اللہ کے سوا کیا ہے

منکشِف اِس کی کیا حقیقت ہو
وہی دیکھے جسے بصیرت ہو

پردے اُٹھ جائیں جب جدائی کے
حال اُس دم کھلیں خدائی کے

معانی واشارات

صاحبانِ عقل وشعور	-	عقل مند لوگ
زوٗر	-	فریب
سرائے فانی	-	فنا ہونے والی جگہ مراد دنیا
جاودانی	-	ہمیشہ رہنے والا
صوفیانِ صافی دل	-	پاکیزہ دل صوفی
نگاہِ وحدت بیں	-	خدا کی یکتائی کو پہچاننے والی نگاہ
عشقِ مجاز	-	ظاہری چیزوں اور افراد سے محبت
صوفیانِ باتوقیر	-	بڑی عزت والے صوفی
اِکسیر	-	معمولی دھات کو سونا بنانے والی شے
منکشِف	-	ظاہر، عیاں

مشقی سرگرمیاں

* عشقِ معبود اور عشق اللہ سے متعلق اقوال خاکے میں لکھیے۔

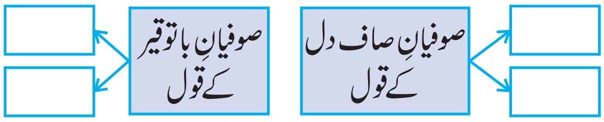

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

ا۔ مثنوی کی تعریف لکھیے۔

۲۔ دنیا کو شاعر نے مکر وفریب کہا ہے، وجہ لکھیے۔

۳۔ مثنوی میں دنیا کے لیے استعمال کی گئی صفات کو ترتیب سے تحریر کیجیے۔

۴۔ صوفیانِ صافی کے عشق خدا سے متعلق خیالات کو قلم بند کیجیے۔

۵۔ شاعر کے مطابق خدائی کی حقیقت منکشف ہونے کا سبب بیان کیجیے۔

۶۔ عقل مندوں کے لیے شاعر کی نصیحت کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۷۔ ذیل کے لیے مترادف الفاظ نظم سے تلاش کرکے لکھیے۔
دوامی، توحید، عزّت، فریب

۸۔ دنیا سرائے فانی ہے اور عشقِ معبود جاودانی ہے۔ ان خیالات پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

۹۔ درج ذیل شعر کی روشنی میں زندگی کی حقیقتوں کو بیان کیجیے۔

چار دن کی یہ زندگانی ہے
جو ہے اُس کے سوا ، وہ فانی ہے

۱۰۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

(i) وہی اوّل میں ہے ، وہی آخر
وہی باطن میں ہے ، وہی ظاہر

(ii) پردے اُٹھ جائیں جب جدائی کے
حال اُس دم کھلیں خدائی کے

۱۱۔ صنعتِ تضاد کی تعریف لکھیے اور مثنوی سے صنعتِ تضاد کا شعر تلاش کرکے لکھیے۔

۱۲۔ نظم کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیے۔

* خاکے میں مناسب الفاظ لکھیے۔

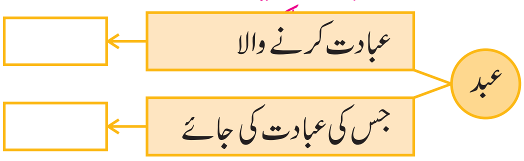

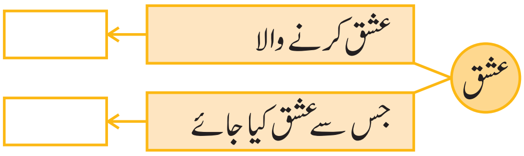

* نظم کی مدد سے خاکہ مکمل کیجیے۔

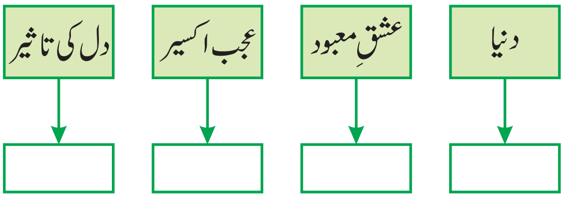

* مثنوی سے تشبیہ کا شعر تلاش کرکے لکھیے۔

* لفظ 'صاحب' کا استعمال کرکے زیرِ اضافت والے چار الفاظ بنائیے۔

* نظم سے ایسے قافیے تلاش کرکے لکھیے جن میں حرف 'ی' استعمال ہوا ہے۔

سرگرمی/منصوبہ

پیش درس میں جن شعرا کی مثنویوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے کسی ایک مثنوی کے اقتباس پر منصوبہ تیار کیجیے۔

۴ درشانِ حمید الدّولہ

خواجہ ابراہیم ذوقؔ

پیش درس

عام طور پر بادشاہوں اور نوابوں کی تعریف میں کہی جانے والی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں۔ اُردو شاعری میں قصیدہ نگاری کی ایک اہمیت ہمیشہ رہی ہے۔ شاعر قصیدے میں بادشاہ یا نواب کی تعریف خوب بڑھا چڑھا کر کرتا اور صلے میں انعام و اکرام پاتا۔ اُردو شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ اور مرزا غالبؔ کے قصیدے مشہور ہیں۔ غالبؔ اور ذوقؔ دونوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں قصیدے پڑھے ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ ان کے بڑے امیر درباری یا نواب کے محلوں میں عید بقر عید کے موقعوں پر شاعر قصیدے پیش کرتے تھے۔ ذوقؔ کا یہ قصیدہ نواب حمید الدولہ کی شان میں کہا گیا ہے۔ شاعر کا ایک دوست جب شاعر سے ملتا اور اسے بری حالت میں پاتا ہے تو شاعر کو تاکید کرتا ہے کہ جاؤ اور نواب صاحب کی خدمت میں قصیدہ پیش کرو۔ تمھارے تو ان سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ وہ تمھاری خراب حالت کو ضرور درست کر دیں گے اور فیاضی دِکھانے میں دیر نہیں کریں گے۔ تب شاعر یعنی ذوقؔ نواب کی خدمت میں اپنا قصیدہ پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نواب اگر اپنی فیاضی دِکھائے تو قطرے کو گہر اور پتھر کو لعل کر دے۔ اگر نواب کسی کی مدد کے لیے اس کا ہاتھ پکڑیں اور اسے خاک بھی دیں تو لینے والا مالا مال ہو جائے۔ بادشاہ ظفر بھی نواب صاحب کو اپنا لائق بیٹا کہتے اور انھیں دوست رکھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ نواب کی تعریف کرنے سے زبان قاصر ہے۔ ان کے لیے بس دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ تیری دولت خوب بڑھے اور میری مراد بر آئے۔

اُنیسویں صدی میں جب مغل حکومت اپنے خاتمے پر پہنچ رہی تھی، اُردو شاعری میں قصیدے کی روایت زوروں پر تھی۔ دہلی کے دربار کے ساتھ لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ ریاستوں میں بڑے بڑے دربار قائم تھے اور شعرا یہاں پہنچ کر نوابوں کی خدمت میں قصیدے پیش کر کے خوب انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ملکی حکومتوں کے بعد انگریز حکومت میں بہت سے شاعر انگریز گورنروں کی خدمت میں قصیدے سنایا کرتے تھے۔

جان پہچان

ذوقؔ کا اصل نام شیخ محمد ابراہیم اور تخلص ذوقؔ ہے۔ وہ ۲۲؍اگست ۱۷۹۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر تھے۔ ذوقؔ کی رسمی تعلیم نہایت معمولی تھی مگر مطالعے کے شوق نے ان کی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے میں مدد کی۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے مدرسے کے استاد حافظ غلام رسول شوقؔ سے اصلاح لی۔ بعد میں شاہ نصیرؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ ان کی قادر الکلامی سے متاثر ہو کر اکبر شاہ ثانی نے انھیں 'ملک الشعرا' اور 'خاقانیِ ہند' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ آخری مغل تاجدار محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ آغازِ سخن ہی سے ذوقؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ ذوقؔ عربی اور فارسی زبان کے علاوہ متعدد علوم جیسے موسیقی، نجوم، طب، تعبیرِ خواب وغیرہ پر دسترس رکھتے تھے۔ اصنافِ سخن میں بالخصوص قصیدہ گوئی میں انھیں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ اُردو ادب میں مرزا محمد رفیع سوداؔ اور ذوقؔ نے قصیدے کی صنف کو جو رفعت عطا کی، یہ انھی کا حصہ ہے۔ ان کے قصائد میں مستعمل علمی اصطلاحات سے علوم پر ان کی قدرت کا پتا چلتا ہے۔ ذوقؔ کا کلام بالعموم تصنع اور تکلف سے پاک ہے جس میں محاورات و اَمثال کا استعمال برمحل نظر آتا ہے۔ ۱۶؍نومبر ۱۸۵۴ء کو ذوقؔ کا انتقال دہلی میں ہوا۔

آج ہے وہ روزِ عشرت ، آج وہ دن عید کا
ہوتے ہیں آ کر بغل گیر آشنا سے آشنا

عید ہے ، گھر دوستوں کے جاتے ہیں ملنے کو دوست
ہے یہی رسمِ محبت ، ہے یہی راہِ وفا

ہاں ، چناں چہ ایک میرے بھی شفیق و مہرباں
یار جانی ، دوست صادق اور محبِّ باصفا

آئے میرے گھر وہ اور احوال میرا دیکھ کر
دیر تک حیراں رہے اور بعد حیرت یہ کہا

''ذوق تو، تو اب تلک ووہی پریشاں حال ہے
ووہی اک کہنہ دو شالہ ، ووہی اک کہنہ قبا

یہ ترا حال اور تو نوّاب صاحب کا قدیم
دوست دار و خاکسار و خاکِ راہ و خاکِ پا

پھر جو ہے کم التفاتی اس قدر ، یہ کیا سبب
کیا گنہ ، کیا جرم ، کیا تقصیر ، تو نے کیا کِیا

وہ نہیں ایسا کہ تھوڑا دے کے تجھ کو ٹال دے
اور یہ کہہ دے ''ابھی جلدی نہ کر ، تو ٹھیر جا''

جلد کر نوّاب سے احوال اپنا جا کے عرض
اور یہ جو کچھ حقیقت ہے ، یہ سب اُس کو سنا

جب سنے اُس آشنا کے منہ سے میں نے یہ کلام
ووہیں خدمت میں تری ، یہ کہہ کے میں حاضر ہوا

مطلع ثانی

بحر و بر میں جھاڑ دے دامن اگر تو فیض کا
قطرہ دُرِّ بے بہا ہو ، لعل سنگِ بے بہا

ہاتھ پکڑے جس کا تو ، ہاتھ آئے اس کے دستِ غیب
جس کو چٹکی خاک کی دے ، ہو وہ صاحب کیمیا

تجھ کو شاہنشاہِ دوراں اپنا فرزندِ لئیق
کہہ چکا ہے ، واہ وا ، تیری لیاقت ، واہ وا

دوست دارِ ملک و دولت خواہِ شاہِ دیں پناہ
ہوشیار و مردِ آخر بیں ، امیر و پارسا

کیا لکھوں تعریف تیری ، میری قاصر ہے زباں
لیک تیرے حق میں ہے یہ دم بدم دل سے دعا

عید ہو تجھ کو مبارک اور دولت ہو فزوں
اور بدولت تیری ، میرا بھی بر آئے مدعا

معانی و اشارات

روزِ عشرت	-	عیش کا دن
محبِّ باصفا	-	مخلص دوست
دوست دار	-	دوست، بھلا چاہنے والا
خاکِ راہ	-	راستے کی خاک مراد معمولی
خاکِ پا	-	پاؤں کی دھول مراد معمولی
کم التفاتی	-	کم میل جول، توجہ کم کرنا
تقصیر	-	گناہ، خطا، غلطی
وو ہیں	-	وہ ہی، ویسا ہی، اُسی وقت
دستِ غیب	-	غیبی مدد کرنے والا ہاتھ
صاحب کیمیا	-	مراد دولت مند
شاہنشاہِ دوراں	-	زمانے کا شہنشاہ
فرزندِ لئیق	-	لائق بیٹا
دوست دارِ ملک	-	ملک کو دوست رکھنے والا
دولت خواہِ شاہِ دیں پناہ	-	دین کو پناہ دینے والے بادشاہ کی حکومت کا بھلا چاہنے والا
مردِ آخر بیں	-	آئندہ کو دیکھ لینے والا
لیک	-	لیکن
دم بدم	-	ہر سانس میں
فزوں	-	زیادہ

مشقی سرگرمیاں

* شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

* شاعر کے گھر آنے والے دوست کے لیے شاعر نے جن صفاتی الفاظ کا استعمال کیا ہے، ان لفظوں کو شبکی خاکے میں لکھیے۔

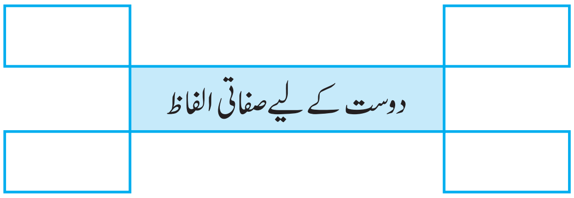

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

۲۔ قصیدے میں بیان کیے گئے عید کے منظر کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ شاعر کے دوست کی حیرت کا سبب بیان کیجیے۔

۴۔ قصیدے سے 'صنعتِ تضاد' کا شعر پہچان کر لکھیے۔

۵۔ دوست نے نواب صاحب سے ذوقؔ کے تعلق کو بیان کرنے کے لیے جن لفظوں کو استعمال کیا ہے، اُن لفظوں کا شبکی خاکہ تیار کیجیے۔

۶۔ دوست کے الفاظ میں ذوقؔ کے حالات بیان کیجیے۔

۷۔ نواب صاحب سے ملنے کے متعلق ذوقؔ کے دوست کی ترغیب کا انداز بیان کیجیے۔

۸۔ ذوقؔ کے قصیدے کا خلاصہ لکھیے۔

۹۔ قصیدے سے 'گریز' کا شعر تلاش کرکے لکھیے۔

۱۰۔ قصیدے سے حسنِ طلب کا شعر تلاش کرکے لکھیے اور شعر کی تشریح کیجیے۔

* درج ذیل شعر کی روشنی میں عید کے دن کی رسومات تحریر کیجیے۔

عید ہے ، گھر دوستوں کے جاتے ہیں ملنے کو دوست
ہے یہی رسمِ محبت ، ہے یہی راہِ وفا

* مندرجہ ذیل شعر میں جس صنعت کا استعمال ہوا ہے، اس کی نشان دہی کیجیے۔

کیا لکھوں تعریف تیری ، میری قاصر ہے زباں
لیک تیرے حق میں ہے یہ دم بدم دل سے دعا

* درج ذیل اشعار کی صنعتیں پہچانیے۔

۱۔ یہ ترا حال اور تو نوّاب صاحب کا قدیم
دوست دار و خاکسار و خاکِ راہ و خاکِ پا

۲۔ بحر و بر میں جھاڑ دے دامن اگر تو فیض کا
قطرہ دُرِّ بے بہا ہو ، لعلِ سنگِ بے بہا

* ابراہیم ذوقؔ اُردو کے مشہور شاعر تھے۔ ان کے فن و شخصیت پر ۲۵ تا ۳۰ سطروں کا مضمون لکھیے۔

سرگرمی/منصوبہ

'اُردو کمار بھارتی' نویں، دسویں جماعت سے قصیدے نقل کر کے دونوں قصیدوں کے (۱) شاعر کا تعارف (۲) قصیدے کے اجزا (۳) قصیدے کا انداز اور (۴) ہجویہ قصیدہ، شخصی قصیدہ کی تفصیلات پر مبنی منصوبہ تیار کیجیے۔

۵ تلوار کا پانی

آرزوؔ لکھنوی

پیشِ درس

کربلا کا واقعہ اسلامی تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ عموماً میدانِ کربلا میں شہید ہونے والوں کی یاد میں لکھی گئی نظم کو مرثیہ کہا جاتا ہے۔ مرثیے کے دو بڑے شاعر گزرے ہیں؛ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ، انھوں نے چھے چھے مصرعوں کے بند میں مرثیے لکھے ہیں۔ چھے مصرعوں کے بند کو مسدّس کہا جاتا ہے۔ مسدّس سے پہلے مرثیہ مختلف ہیئتوں میں لکھا جاتا تھا۔

اکثر مرثیہ نگاروں نے اس واقعے کو مسدس کی شکل میں نظم کیا ہے۔ آرزوؔ لکھنوی کا یہ مرثیہ غزل کی شکل میں ہے جو اس منظر کی عکاسی کرتا ہے جب حضرت عباس پانی لینے کے لیے نہرِ فرات پر پہنچے۔ آرزوؔ نے لفظ 'پانی' کو یہاں مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے جیسے 'تلوار کا پانی' کے معنی 'تلوار کی تیز دھار' کے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ محاورے بھی یہاں برتے گئے ہیں مثلاً کلیجا پانی ہونا، ٹاپ مارنے سے پانی نکل آنا، آنکھ سے پانی ٹپکنا، ماتھے سے پانی ٹپکنا۔ اس مرثیے میں حضرت عباس کی جنگ اور شہادت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ امام حسین کی صاحب زادی سکینہ پیاس سے بے قرار تھیں۔ ان کی فرمائش پر حضرت عباس پانی لانے دریا کے گھاٹ تک گئے۔ مشک میں پانی بھرا اور واپس پلٹے لیکن دشمنوں نے گھیر لیا۔ حضرت عباس بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

انسانی معاشرے میں پیاسے کو پانی پلانا نیکی کا ایک بڑا کام ہے اور پیاسے کو پانی نہ پینے دینا یا پانی پر روک لگانا ظلم سمجھا جاتا ہے۔ مرثیے میں اس اخلاقی عمل کو بہت دردمندی سے بیان کیا گیا ہے۔

جان پہچان

سیّد انور حسین آرزوؔ لکھنوی ۱۷ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے اُردو، فارسی اور عربی کے علاوہ دیگر علوم کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ گھر کی روایت کے مطابق انھوں نے شاعری کو اپنایا اور ضامن علی جلالؔ لکھنوی کے شاگرد بن گئے۔ آرزوؔ لکھنوی ادیب، دانشور، ڈراما نگار اور علمِ عروض کے ساتھ زباندانی کے بھی ماہر تھے۔ انھوں نے غزلیں، مرثیے، قصیدے وغیرہ کے علاوہ ہندوستانی فلموں کے نغمے بھی لکھے۔ آرزوؔ نے لکھنوی غزل کے رنگ کو نکھارا اور اسے ایک نئی اور سادہ زبان دی۔ 'فغانِ آرزوؔ'، 'جہانِ آرزوؔ'، 'سریلی بانسری' اور 'نشانِ آرزوؔ' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ صحیفۂ الہام (سلام)، صبحِ اسلام (نعتیہ مسدس)، خمسۂ متحیرہ (مرثیہ)، دردانہ (مثنوی)، اربع عناصر (مرثیہ) ان کی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔ شعری فن کے رموز، اُصولِ بیان اور قواعد کے حوالے سے ان کی دو کتابیں 'نظامِ اُردو' اور 'میزان الحروف' بہت مشہور ہوئیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد آرزوؔ کراچی چلے گئے اور وہیں ۱۶/ اپریل ۱۹۵۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔

تپتے بن میں رہے پیاسے تو یہ سوکھا پانی
بچے روئے بھی تو آنکھوں سے نہ نکلا پانی

پیاس پر اُن کی ، نہ کیوں کر ہو کلیجا پانی
بوند بھر جن کو نہ لؤ دھوپ میں پہنچا پانی

رن میں گھوڑا جو اُڑاتے ہوئے پہنچے عباس
چوکیاں گھاٹ پہ بیٹھی تھیں ، رُکا تھا پانی

برچھیاں تانے بڑھے آگے لہُو کے پیاسے
ہو جنھیں دیکھ کے پتھر سا کلیجا پانی

منچلا ایسا کبھی کاہے کو دیکھا ہوگا
لینے آیا ہے جو اِتنوں سے اکیلا پانی

ہم ہیں لاکھوں ، یہ اکیلا ہے، بنا سکتا ہے کیا ۔۔۔ سؤرما بھی ہے تو ہو ، لے نہیں سکتا پانی
بل پڑے تیوریوں پر ، ہوگئی چتوَن کچھ اور ۔۔۔ تمتمانے لگا منہ ، ماتھے سے ٹپکا پانی
کھنچ کے باہر ہوئی کاٹھی سے تڑپتی ناگن ۔۔۔ لہریں لینے لگا تلوار کا ٹھہرا پانی
چھیڑ جیسے ہی ہوئی ، آپ نے بھی تان لی باگ ۔۔۔ ٹاپ گھوڑے نے جو ماری ، نکل آیا پانی
پہلے ہی وار میں ریتی پہ لہو یوں برسا ۔۔۔ جیسے آئی ہوئی برسات کا پہلا پانی
جو تھے ساونت بڑے ، اُن کے بھی جی چھوٹ گئے ۔۔۔ منچلوں کا بھی ہوا ، ڈر سے کلیجا پانی
آن کی آن میں لاکھوں کا ڈبویا بیڑا ۔۔۔ نہیں دیکھا کسی تلوار کا ایسا پانی
لڑ کے جب چھین لیا گھاٹ تو چلّا کے کہا ۔۔۔ اب تمھارا ہے یہ پانی کہ ہمارا پانی
پیاسے بچّوں کا بلکنا جو نہیں بھولا تھا ۔۔۔ اُٹھا چھاتی سے دھواں ، آنکھ سے ٹپکا پانی
اتنے میں روکنے کو آگئے پھر غول کے غول ۔۔۔ کہتے جاتے تھے کہ لے جانے نہ دینا پانی
آپ بھی ہوگئے گھوڑے پہ سنبھل کر تیار ۔۔۔ لے لیا ، جتنا بھی چھاگل میں سمایا پانی
پھر کھنچی میان سے تلوار ، چلے وار پہ وار ۔۔۔ گھاٹ پر لال لہو سے ہوا سارا پانی
پھر بھی لاکھوں سے اکیلے کی لڑائی کب تک ۔۔۔ دھوپ ، لؤ ، پیاس ، تھکن ، اُس پہ نہ پینا پانی
وار بھرپور چلے ، گھاؤ بھی گہرے آئے ۔۔۔ بہہ گیا اُتنا لہُو ، لائے تھے جتنا پانی
کٹ گئے ہاتھ بھی ، جینے کی بھی اب آس نہیں ۔۔۔ آپ بچ سکتے نہ تھے ، کون بچاتا پانی
آپ گھوڑے سے گرے ، 'ہائے سکینہ' کہہ کر ۔۔۔ سوچ یہ تھی کہ بھتیجی کو نہ پہنچا پانی
ہچکی اک آئی ، لویں پھرنے لگیں ، سانس اُکھڑی ۔۔۔ نیل آنکھوں سے ڈھلا ، ماتھے سے ٹپکا پانی

آرزؔو ! ڈوب کے جب تھاہ لگائے تو کھلے
اُتھلی ندّی میں نہ ہونے پہ ہے کتنا پانی

معانی و اشارات

یہ سوکھا پانی	پانی ایسا سوکھا	کاٹھی	تلوار کی میان
کلیجا پانی ہونا	بہت تکلیف ہونا، بہت ڈر لگنا	ٹاپ مارنے سے پانی نکل آنا	زمین میں گڑھا ہوجانا مراد مشکل حل ہونا
عباس	حضرت علیؓ کے صاحبزادے	ساونت	بڑے بہادر
تیوریوں پر بل پڑنا	پیشانی پر لکیریں اُبھر آنا، مراد ناراض ہونا	جی چھوٹنا	ہمت ہار جانا
چتون	نظر	تلوار کا پانی	تلوار کی دھار

چھاتی سے دھواں اُٹھنا - کسی کے غم کا اثر ہونا
غول کے غول - بہت سی ٹولیاں
لویں پھرنا - مرنے کے قریب کان کی لویں پھر جانا
آنکھوں سے نیل ڈھلنا - موت کے آثار پیدا ہونا
تھاہ لگانا - پانی کی گہرائی ناپنا

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کا شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

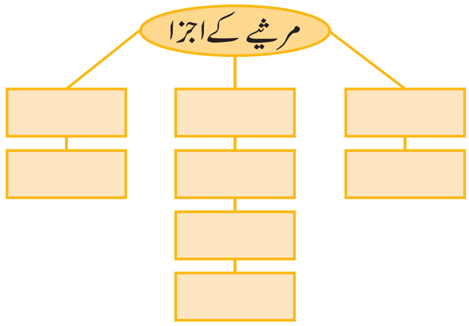

* مندرجہ ذیل خاکے مکمل کیجیے۔

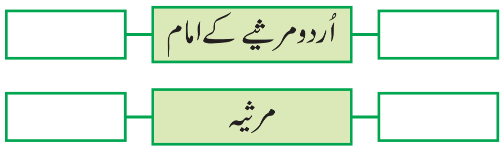

* دیے ہوئے الفاظ کے مترادف سے خاکہ مکمل کیجیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

ا۔ کربلائی مرثیے کی تعریف لکھیے۔
۲۔ بچوں کی آنکھوں سے پانی نہ نکلنے کی وجہ بیان کیجیے۔
۳۔ میدانِ جنگ میں حضرت عباس کے پہنچنے کا منظر اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
۴۔ مرثیے سے استعارے والے شعر کی نشاندہی کیجیے۔
۵۔ مرثیے سے مبالغے کے اشعار تلاش کر کے لکھیے۔
۶۔ مرثیے کے آخری دو اشعار کی تشریح اپنے الفاظ میں کیجیے۔
۷۔ سیاق وسباق کی مدد سے درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

(i) کھنچ کے باہر ہوئی کاٹھی سے تڑپتی ناگن
لہریں لینے لگا تلوار کا ٹھہرا پانی

(ii) چھیڑ جیسے ہی ہوئی، آپ نے بھی تان لی باگ
ٹاپ گھوڑے نے جو ماری، نکل آیا پانی

(iii) آپ گھوڑے سے گرے، 'ہائے سکینہ' کہہ کر
سوچ یہ تھی کہ بھتیجی کو نہ پہنچا پانی

۱۰۔ مرثیے کا خلاصہ بیان کیجیے۔

سرگرمی/منصوبہ

ا۔ استاد کی رہنمائی میں کتاب یا انٹرنیٹ سے میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، فیض احمد فیضؔ اور وحید اخترؔ کے مرثیے تلاش کر کے ان کے دو دو بند اپنی بیاض میں لکھیے۔
۲۔ شخصی مرثیے پر مبنی منصوبہ تیار کیجیے۔

نکات: مرثیہ، شاعر، مرثیے کے اجزا، مرثیے میں شامل صنعتیں، لفظی تراکیب اور تبصرہ۔

۶ ہم زندہ رہیں گے

فراقؔ گورکھپوری

پیش درس

زندگی میں انسان کو اچھے برے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کو جیسا ماحول ملتا ہے، وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی کوشش اسے زندہ بھی رکھتی ہے۔ زندگی کا ارتقا صرف زمین پر نہیں ہوتا، اس کا سفر زمین سے آسمان کی طرف بھی بڑھتا ہے اور اس سفر میں زمانہ خاص طور پر انسان کو مٹانے کے درپے ہوتا ہے۔ عزم مصمم ہو تو انسان زمانے کے جبر کا مقابلہ کرتا اور ہر طرح کے دباؤ سے بچ کر نکلتا ہے، یہاں تک کہ موت آنے پر بھی نہیں مرتا۔ یہ بات دراصل مبالغہ ہے اور اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ انسان بھلے ہی مر جائے لیکن زندگی میں اس نے جو کارنامے انجام دیے تھے، ان کی یادیں زندہ رہتی ہیں۔ اس کی زندگی کی راہ میں بڑے بڑے پہاڑ اور گہرے سمندر آتے ہیں مگر انسان حوصلہ نہیں ہارتا، وہ بنتا ہے، مٹتا ہے، مٹ کر پھر بن جاتا ہے۔ دریا اور پہاڑ کی طرح فطرت کے موسم، رات دن اور شور و خاموشی تک اس کے دشمن بن جاتے ہیں مگر انسان فطرت کے جبر کے آگے ڈٹا رہتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔

اس مشکل سفر میں تاریخ، تہذیب، علم وفن سب میں انسان بڑے بڑے کارنامے انجام دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خلاؤں میں بھی سفر کرتا اور سیاروں پر اپنے جھنڈے گاڑ دیتا ہے۔ انسان کا عزم ہے کہ میں دنیا کو آباد رکھنے کے لیے نئی نئی ایجادات کروں، زمین کا حسن برباد نہ ہونے دوں اور اسے طرح طرح سے سجائے رکھوں۔

یہ نظم انسان کے بلند حوصلوں، جوش اور جذبات سے بھرا ہوا گیت ہے۔ اس گیت کی تیز لے سننے اور پڑھنے والوں کے جذبات کو بھی تیز کر دیتی ہے۔ آفاتِ زمانہ، وادیِ پرخار، ماحولِ شرر بار، زندانِ شبِ تار جیسی ترکیبیں اس گیت کے آہنگ کو شعریت سے بھر رہی ہیں۔ بحر و بر، کہسار، فطرت کے عناصر، ماحول اور زمانے کی گردش، ہر کوئی انسان کی زندگی کو ختم کرنا چاہتا ہے مگر انسان اپنے حوصلے اور ہمت کے بل پر ساری مصیبتوں سے لڑتا اور اپنی زندگی کا اعلان کرتا رہتا ہے۔

جان پہچان

فراقؔ گورکھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔ وہ ۲۸؍ اگست ۱۸۹۶ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ ان کی غزلوں میں جدید اور قدیم افکار کا امتزاج ملتا ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے انھوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اُردو شاعری میں انھوں نے ہندی کے الفاظ کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ وہ ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ’شعرستان، شبنمستان، روحِ کائنات، گلِ نغمہ‘ وغیرہ ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ ’روپ‘ بھی بہت مشہور ہے۔ ’حاشیے، اندازے، اُردو کی عشقیہ شاعری‘ اور ’اُردو غزل گوئی‘ ان کی نثری تصانیف ہیں۔ اُردو کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور ہندی میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں ان کے شعری مجموعے ’گلِ نغمہ‘ پر انھیں گیان پیٹھ انعام سے سرفراز کیا گیا۔ ۳؍ مارچ ۱۹۸۲ء کو دلّی میں ان کا انتقال ہوا۔

قرنوں کے مٹانے سے مٹے ہیں ، نہ مٹیں گے
آفاتِ زمانہ سے جھکے ہیں ، نہ جھکیں گے
اُبھرے تو دبانے سے دبے ہیں ، نہ دبیں گے
ہم موت کے مارے بھی مرے ہیں ، نہ مریں گے
ہم زندہ تھے ، ہم زندہ ہیں ، ہم زندہ رہیں گے

گو بحر و بر و چرخ مٹانے پہ تلے ہیں
اُبھرے ہوئے کہسار کے تیور بھی کڑے ہیں
بے درد عناصر بھی بہت بپھرے ہوئے ہیں
بن بن کے مٹے جائیں گے ، مٹ مٹ کے بنیں گے
ہم زندہ تھے ، ہم زندہ ہیں ، ہم زندہ رہیں گے

انسان ہے اور چار طرف وادیِ پُرخار
پُرہول مناظر کا وہ ماحولِ شرربار
وہ بولتے سناٹے ، وہ زَندانِ شبِ تار
کمزور ہیں پر جبر سے فطرت کی لڑیں گے
ہم زندہ تھے ، ہم زندہ ہیں ، ہم زندہ رہیں گے

تہذیب کو پروان چڑھایا ہے ہمیں نے
تاریخ کو ہر درس پڑھایا ہے ہمیں نے
سیاروں پہ قدموں کو جمایا ہے ہمیں نے
اب شمس و قمر اپنے اشاروں پہ چلیں گے
ہم زندہ تھے ، ہم زندہ ہیں ، ہم زندہ رہیں گے

سو رنگ سے دنیا کو ہم آباد کریں گے
ہر گام پہ دنیا نئی ایجاد کریں گے
ہم اس کو سہاگن کی طرح شاد کریں گے
دھرتی کی ، ہمیں اُجڑی ہوئی مانگ بھریں گے
ہم زندہ تھے ، ہم زندہ ہیں ، ہم زندہ رہیں گے

معانی و اشارات

قرن	-	زمانہ
بحر و بر و چرخ	-	سمندر، زمین اور آسمان
تیور کڑے ہونا	-	غصّے میں ہونا
بننا	-	وجود میں آنا
بن بن کے مٹے جائیں گے	}	وجود میں آ آ کر مٹ جائیں گے
مٹ مٹ کے بنیں گے	}	ختم ہو کر پھر وجود میں آ جائیں گے
وادیِ پر خار	-	کانٹوں سے بھری وادی
پُر ہول	-	خطرناک
شرر بار	-	چنگاریاں برسانے والا
بولتے سناٹے	-	ایسے سناٹے جن کا خوف محسوس کیا جا سکے (استعارہ) مرادرات
زندانِ شبِ تار	-	اندھیری رات کا قید خانہ
شاد کرنا	-	خوش کرنا

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ شاعر نظم کے پہلے بند میں جو بات کہنا چاہتا ہے، اسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۲۔ اس نظم کی ہیئت کی وضاحت کیجیے۔

۳۔ نظم سے وہ مصرعے چن کر لکھیے جن میں صنعتِ تشبیہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

۴۔ ’بولتے سنّاٹے‘ اور ’زندانِ شبِ تار‘ ان ترکیبوں کی وضاحت کیجیے۔

۵۔ نظم کے تیسرے بند کی تشریح کیجیے۔

۶۔ چوتھے بند کی روشنی میں ’ترقی‘ اور ’انسان کے عزم‘ کے بارے میں لکھیے۔

۷۔ نظم کے آخری بند میں شاعر کے عزم و حوصلے کو اپنے جملوں میں لکھیے۔

۸۔ ’ہم زندہ رہیں گے‘ اس عنوان پر اپنی رائے تحریر کیجیے۔

۹۔ ’ہم زندہ رہیں گے‘ اس گیت کا خلاصہ لکھیے۔

۱۰۔ گو بحر و بر و چرخ مٹانے پہ تلے ہیں
اُبھرے ہوئے کہسار کے تیور بھی کڑے ہیں
(الف) اس شعر میں آئی ہوئی صنعتوں کے نام لکھیے۔
(ب) ہر دو صنعت کی تعریف لکھیے۔

* ’بار‘ لاحقے کی مدد سے چار نئے الفاظ کا شبکی خاکہ بنائیے۔

سرگرمی/منصوبہ

عزم، حوصلہ، ہمت اس مرکزی خیال سے متعلق پانچ مختلف شعرا کے منتخب گیتوں کا مجموعہ تیار کیجیے۔

نکات : شاعر کا تعارف، گیت، گیت کا مرکزی خیال، تبصرہ

* چوتھے بند کی مدد سے خاکے کو مکمل کیجیے۔

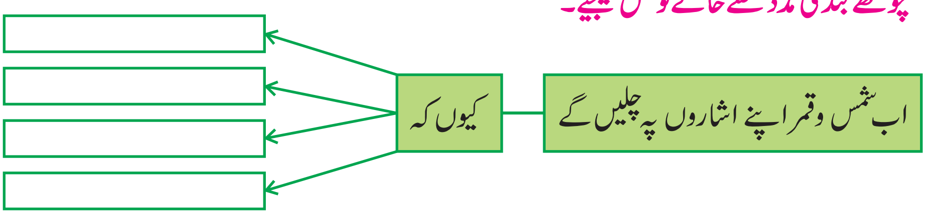

۷ آدمیوں کے میلے میں

خلیل الرحمٰن اعظمی

پیشِ درس

انسان سماج میں زندگی گزارتا ہے۔ وہ لوگوں سے ملتا جلتا، ان سے اپنی باتیں کہتا اور ان کی باتیں سنتا ہے۔ ایسا ہر سماج میں ہوتا ہے مگر نئے زمانے میں انسان سماج کی بھیڑ میں رہ کر بھی خود کو اکیلا سمجھتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ آج کی مشینی زندگی نے انسان کو خود سماجی مشین کا پرزہ بنا دیا ہے۔ اپنا ہر کام اسے مقررہ وقت پر انجام دینا پڑتا ہے۔ گویا وہ وقت کے دائرے میں محدود ہو گیا ہے۔ اس کے اطراف زندگی کی ہما ہمی جاری ہے، راستے روشنیوں سے جگمگا رہے ہیں، لوگوں کا، سواریوں کا شور وغل ہر طرف پھیلا ہے مگر اس بھیڑ اور شور میں ہر شخص خود کو کھویا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اسے ایسے فرد کی تلاش ہے جس کے ساتھ وہ سماج میں رہتا تھا۔ وہ شہر کی بھیڑ میں اسی آدمی کی تلاش کر رہا ہے۔

جدید شاعری کے نظریے کے مطابق آج کا فرد معاشرے کی بھیڑ میں گم ہو گیا ہے۔ اس گم شدگی کو ذات کی گم شدگی بھی کہتے ہیں۔ یہ شاعرانہ کنایہ بھی ہے کہ ہر فرد کا ضمیر اس سے چھوٹ گیا ہے۔ اخلاقی ضرورت سمجھ کر فرد اس ضمیر کو، اپنے آپ کو تلاش کرے اور اس کے ساتھ زندگی گزارے۔

اس نظم میں شاعر شہر کی بھیڑ میں اپنے کھوئے ہوئے ضمیر کو تلاش کر رہا ہے۔ وہ ہر چہرے کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ گویا اپنا عکس وہ ہر فرد کے چہرے میں تلاش کر رہا ہو۔ یہ حالت صرف شاعر کی نہیں ہے۔ اس کے مطابق معاشرے کا ہر فرد اسی عمل سے گزر رہا ہے۔

نظم 'آدمیوں کے میلے میں' شام کی منظر نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ شہر کی روشنیاں، آتے جاتے لوگوں کی بھیڑ، ان کے شور وغل سے یہاں کچھ حسی پیکر ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس شاعرانہ بیان کو پیکر تراشی کہتے ہیں۔

جان پہچان

خلیل الرحمٰن اعظمی ۹/ اگست ۱۹۲۷ء کو سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے بی.اے، ایم.اے اور پی ایچ.ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی میں شعبۂ اُردو میں استاد مقرر ہوئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کا ادبی سفر ترقی پسند تحریک کے زمانے میں شروع ہوا مگر وہ جلد ہی اس تحریک سے الگ ہو گئے اور جدیدیت کے رجحان کے ہم نوا ہو گئے۔ ان کے کلام میں روایت کی پاسداری اور جدت کی تلاش کا رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ذاتی محسوسات کے ساتھ ساتھ اپنے عصر کی ترجمانی بھی کی ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی زبردست قوتِ حافظہ اور ذہنی صلاحیت کے مالک، اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ 'اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'، مقدمۂ کلامِ آتش'، 'فکر وفن' اور 'مضامینِ نو' ان کی اہم تنقیدی کتابیں ہیں۔ 'کاغذی پیرہن' اور 'نیا عہد نامہ' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ یکم جون ۱۹۷۸ء کو علی گڑھ میں ان کا انتقال ہوا۔

وہی شامِ رنگیں ، وہی شہرِ خوباں
وہی جگمگاتے ہوئے راستے ہیں
وہی روشنی ہے ، وہی قہقہے ہیں
وہی شور و غل ہے ، وہی چہچہے ہیں
اُسی طرح سے قافلے آرہے ہیں
اسی طرح پرچھائیاں ہِل رہی ہیں

اسی طرح ملتے ہیں شانوں سے شانے
اسی طرح چھوتی ہیں باہوں کو باہیں
اسی طرح رُک رُک کے کچھ دیکھتی ہیں
ہر اک موڑ پر ڈھونڈتی ہیں پناہیں

ہر اک شخص کا جیسے اپنا ہی ساتھی
کوئی اپنا ہی آدمی کھو گیا ہو
ہر اک چہرے کو غور سے تک رہا ہو
ہر اک آنکھ سے جیسے کچھ پوچھتا ہو

کہیں بھیڑ میں تم نے دیکھا ہے اس کو
کوئی میری خاطر پریشان سا ہے
کسی کی زباں سے سنا نام میرا
کوئی مجھ کو بھی پوچھتا پھر رہا ہے

کوئی شکل ایسی بھی دیکھی ہے تم نے
جو میرے لیے ہی یہاں کھو گئی ہو
جو یوں دیکھنے کو تو دیکھے سبھی کو
مگر صرف مجھ کو ہی پہچانتی ہو

معانی و اشارات

شہرِ خوباں - خوب صورت لوگوں کا شہر

چہچہے - خوشیوں بھری آوازیں

پناہیں - پناہ کی جمع، حفاظت کی جگہیں

مشقی سرگرمیاں

❋ ذیل کا شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

❋ شاعر نے آدمیوں کے میلے کی جو منظر کشی کی ہے، اُسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

❋ نظم سے ایسا شعر تلاش کر کے لکھیے جس سے پتا چلتا ہو کہ شاعر کا دوست کھو گیا ہے۔

❋ نظم کا وہ بند تحریر کیجیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو کوئی تلاش کر رہا ہے۔

❋ ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ شام و سحر کی یکسانیت اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۲۔ شہرِ خوباں کی رنگین شام کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ شاعر کو ہر شخص کے پریشان نظر آنے کی وجہ بیان کیجیے۔

۴۔ نظم کی مدد سے شاعر کی اس کیفیت کو بیان کیجیے جسے وہ محسوس کر رہا ہے۔

۵۔ اس نظم کے بارے میں مختصراً اپنے خیال کا اظہار کیجیے۔

❋ درج ذیل کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

(i) کہیں بھیڑ میں تم نے دیکھا ہے اس کو
کوئی میری خاطر پریشان سا ہے
کسی کی زباں سے سنا نام میرا
کوئی مجھ کو بھی پوچھتا پھر رہا ہے

(ii) کوئی شکل ایسی بھی دیکھی ہے تم نے
جو میرے لیے ہی یہاں کھو گئی ہو
جو یوں دیکھنے کو تو دیکھے سبھی کو
مگر صرف مجھ کو ہی پہچانتی ہو

❋ آدمیوں کے میلے کا مرادی مفہوم تحریر کیجیے۔

سرگرمی/منصوبہ

اُردو کے پانچ مشہور شعرا کے تعارف کا منصوبہ 'جان پہچان' کے نام سے تیار کیجیے۔

۸ بیکراں سمندر

زاہدہ زیدی

پیش درس

وقت کا تصوّر کبھی فلسفے کا موضوع تھا۔ یونان اور ہندوستان کے فلسفیوں نے اس کے تعلق سے کئی نظریات پیش کیے ہیں۔ دن رات اور موسموں کے گزرنے سے عام آدمی بھی وقت کے تصور کی کچھ نہ کچھ سمجھ ضرور رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وقت کیا ہے، یہ کیسے گزرتا ہے اور دنیا اور دنیا والوں پر اس کے اثرات کس طرح مرتب ہوتے ہیں، ان سوالوں کے صحیح جوابات کبھی نہ ملے۔ پھر وہ وقت آیا کہ فلسفیوں کے بعد سائنس دانوں نے وقت کو زمینی اور خلائی وقت میں تقسیم کردیا۔ ان کے مطابق زمین اور خلا میں وقت کے گزرنے کا تصور بالکل مختلف ہے۔ وقت کے ان دونوں فلسفیانہ اور سائنسی تصورات کے علاوہ ایک تیسرا تصور شاعرانہ تصور ہے جس کا خیال زاہدہ زیدی نے اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ وقت کا یہ تصور شاعرانہ اس لیے کہلاتا ہے کہ فن کار اسے کبھی استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں (جیسے اس نظم کی سطر 'یہ وقت کا بیکراں سمندر') اور کبھی علامت کے طور پر (جیسے اوج پر ستارہ، تند و تیز دھارا)۔

نظم میں وقت کے سمندر کی لہریں ماضی سے حال اور مستقبل تک کی ہر چیز کو بہا کر لے جارہی ہیں۔ قدیم زمانے کے واقعات، تاریخ کے سارے کردار، پرانے علوم وفنون وغیرہ سب وقت کے تند و تیز دھارے میں بہے جارہے ہیں۔ سمندر کی لہریں انھیں لے جاکر وقت کے اندھیروں میں ڈبو رہی ہیں۔ جس طرح ہم سمندر کے ساحل پر کھڑے ہوکر آتی جاتی لہروں کا تماشا دیکھتے اور دور رہ کر خود کو سمندر کے طوفان سے محفوظ سمجھتے ہیں، نظم کے ماحول میں ایسا واقع نہیں ہورہا ہے۔ شاعرہ کے بیان سے واضح ہے کہ وہ ماضی سے حال کی طرف بڑھتی طوفانی لہروں کو دیکھ تو رہی ہے مگر اسے احساس ہے کہ وقت کا یہ تیز دھارا اب میری طرف بڑھ رہا ہے اور مجھے بھی اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔

یہ ایک آزاد نظم ہے جس میں ردیف، قافیوں کا استعمال اکثر نہیں کیا جاتا مگر شاعرہ نے اس میں بہت سے قافیے شامل کرکے نظم کی روانی کو تیز کردیا ہے۔ جیسے وارداتیں، راتیں/سفینے، قرینے/ پارہ پارہ، ستارہ وغیرہ۔

جان پہچان

پروفیسر زاہدہ زیدی ۴؍جنوری ۱۹۳۰ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق علمی خانوادے سے تھا۔ الطاف حسین حالؔی ان کے جدِ امجد تھے۔ ان کے والد کیمبرج یونیورسٹی میں ریاضی کے استاد تھے۔ زاہدہ زیدی نے علی گڑھ اور کیمبرج یونیورسٹی سے انگریزی مضمون میں ایم.اے کیا۔ لیڈی اِروِن کالج اور دلّی یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریس کے لیے مامور ہوئیں۔ انھوں نے تعلیم، شاعری، ڈراما نگاری، ناول نگاری، تنقید اور ترجمہ نگاری کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔

پروفیسر زاہدہ زیدی نے انگریزی اور اُردو میں کم وبیش ۳۰؍کتابیں تصنیف کیں۔ 'زہرِ حیات، دھرتی کا لمس، سنگِ جاں، شعلۂ جاں' (شعری مجموعے)، 'دوسرا کمرہ' (ڈراموں کا مجموعہ)، 'صحرائے اعظم، چیری کا باغ، 'انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے' (تراجم)، 'رموزِ فکر وفن، لذتِ آشنائی' (تنقیدی مضامین کے مجموعے) اور 'انقلاب کا ایک دن' (ناول) قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے اہم جدید یورپی ڈراموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ انھیں ڈرامے کے اسٹیج کا تجربہ بھی خوب تھا۔

زاہدہ زیدی کا ۱۱؍جنوری ۲۰۱۱ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔

یہ وقت کا بیکراں سمندر
جو میرے اطراف موجزن ہے
یہ تند و سفاک اور محشر بدوش دھارا
کہ جس کی زد میں ہیں
عہدِ ماضی کی وارداتیں
ہزار جلوہ طراز دن، سوگوار راتیں
گزشتہ ادوار کے سلگتے ہوئے سفینے
حیاتِ نو کے کئی قرینے
پرانی تاریخ کی حکایاتِ پارہ پارہ
وہ اہلِ زر، اہلِ جاہ و ثروت
رہا تھا جن کا بہت دنوں اوج پر ستارہ

اسی کی زد میں
قدیم علم و ہنر کے دھارے
بلند افکار کے مِنارے
نوا و شعر و سخن کے دفتر
شکستِ پرواز کے وہ شہپر
گداز نغمے، دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے تھے
حسین پیکر، نگار خانوں میں جو دلوں کے، سجے ہوئے تھے
ازل سے خاشاک کی طرح
تند و تیز دھارے میں بہہ رہے ہیں
ابد کی تاریک وادیوں میں وہ گر کے معدوم ہو رہے ہیں

یہی، یہی تند و تیز دھارا
مری سبھی کاوشوں کا موہوم سا سہارا
اسی کی شعلہ زبان لہروں پہ چل کے شاید ملے کنارا
کہ اب فنا کے سیاہ تاریک غار
خود میرے منتظر ہیں

معانی و اشارات

بیکراں - بے کنار
محشر بدوش - کندھے پر قیامت، مراد بڑی مصیبتیں اُٹھائے ہوئے
جلوہ طراز - جلوے بکھیرنے والا
قرینہ - سلیقہ، طور، طریقہ
حکایات پارہ پارہ - بکھری ہوئی کہانیاں
اہلِ جاہ و ثروت - دولت و عزت والے
اوج پرستارہ - مراد ترقی، بلندی، عظمت
شکست پرواز کے شہپر - پرواز ختم ہوتے وقت پروں کی حالت
نگار خانہ - تصویر خانہ
معدوم ہونا - ختم ہونا
موہوم - وہم کیا گیا، معمولی
شعلہ زبان لہریں - لہریں جن سے شعلے اُٹھ رہے ہوں

مشقی سرگرمیاں

* خاکہ مکمل کیجیے۔

* نظم کی مدد سے دیے ہوئے الفاظ کی مناسبت سے موزوں لفظ لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

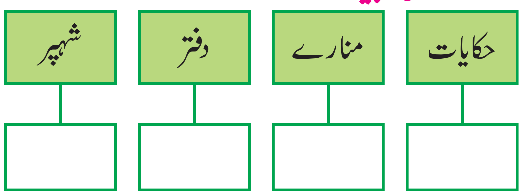

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ وقت کے بیکراں سمندر کی موجوں کی زد میں آنے والی چار چیزوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیجیے۔
۲۔ نظم کے مطابق گزشتہ زمانے کی یادگاروں کی فہرست بنائیے۔
۳۔ شاعرہ کے لیے موہوم سہارے کو واضح کیجیے۔
۴۔ 'فنا کے سیاہ تاریک غار' کا مرادی مفہوم تحریر کیجیے۔
۵۔ ازل سے ابد تک وقت کے دھارے کے سفر کی وضاحت کیجیے۔
۶۔ 'وقت کا بے کراں سمندر' پر اپنی رائے تحریر کیجیے۔
۷۔ عہد ماضی کی وارداتوں سے شاعرہ کی مراد لکھیے۔
۸۔ ذیل کے مصرعوں کا استحسان اس طرح کیجیے کہ 'وقت' (ماضی اور حال) کی تبدیلیوں کا احساس واضح ہوجائے۔

گداز نغمے، دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے تھے
حسین پیکر، نگار خانوں میں جو دلوں کے، سجے ہوئے تھے
ازل سے خاشاک کی طرح
تند و تیز دھارے میں بہہ رہے ہیں
ابد کی تاریک وادیوں میں وہ گر کے معدوم ہو رہے ہیں

* نظم میں وقت کے لیے استعمال کیے گئے استعارے تلاش کر کے لکھیے۔
* اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

سرگرمی/منصوبہ

نظم کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان میں سے درج ذیل نظموں کا منصوبہ تیار کیجیے۔
(۱) پابند نظم (۲) معریٰ نظم (۳) آزاد نظم
نکات : تعریف، مثال، شاعر کا نام، نظم کی خوبی، رائے۔

۹

قطعات

اکبرؔ الٰہ آبادی

پیش درس

ہماری زبان میں عربی فارسی کے بہت سے الفاظ شامل ہیں جو روزانہ گفتگو میں ہم استعمال کرتے رہتے ہیں۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعران زبانوں کے غیر مانوس الفاظ اپنے شعروں میں برت لیتے ہیں جیسے

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب

تجسّس کی راہیں بدلتی رہیں
دمادم نگاہیں بدلتی رہیں

اقبالؔ کے پہلے شعر میں 'سحاب' اور دوسرے شعر میں 'دمادم' کم استعمال کیے جانے والے الفاظ ہیں۔ یہاں ضرورت کے تحت اقبالؔ نے انھیں استعمال کرلیا ہے۔عربی فارسی کے لفظوں کے علاوہ کچھ شاعر کبھی ہندی اور انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔اکبرؔ الٰہ آبادی نے اپنے کلام میں جا بجا انگریزی الفاظ بڑی فنکاری سے استعمال کیے ہیں۔

آج کل ہم اپنی گفتگو میں بہت سے انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ٹی وی اور کمپیوٹر کے زمانے میں زبانیں ایک دوسرے کو خوب متاثر کررہی ہیں۔

اکبرؔ کے قطعات میں مشرقی اور اسلامی تہذیب و اقدار کی اہمیت کو جتایا گیا ہے۔ پہلے قطعے میں تاریخ اور فلسفے کی اہمیت تو بتائی گئی ہے لیکن ان کے ساتھ آخرت اور جنت و دوزخ کی اہمیت بھی جتائی گئی ہے۔دوسرے قطعے میں شاعر کہتا ہے کہ وطن سے ہمیں محبت ہونی چاہیے بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کو ہمیں اپنا سمجھنا چاہیے لیکن دنیا کی کوئی چیز ہماری نہیں، ہر چیز خدا کی ہے۔ ہم کتنے ہی مال و دولت کے مالک ہوجائیں، حقیقت یہ ہے کہ سارا مال ختم ہونے والا ہے۔

تیسرا قطعہ ایک دلچسپ لطیفہ ہے جس میں لیلیٰ اور مجنوں کے حوالے سے شاعر کہتا ہے کہ آج کالج کی تعلیم کی بہت اہمیت ہے۔ دنیا کا کاروبار ہو کہ عشق و محبت کا، تعلیم ضروری ہے۔لیلیٰ کی ماں مجنوں کو کالج میں داخلے کی تحریک دیتی ہے مگر وہ عشق کا بندہ تعلیم کے خلاف ہے اور کالج میں داخلے کے لیے تیار نہیں۔ یہ قطعہ دراصل تعلیم کے غیر جذباتی شعوری نظام اور عشق کے جذباتی کیف و کم کا تقابل ہے۔

طنز و مزاح کو تخلیقی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔طنز ایک ایسا طرزِ اظہار ہے جس میں زندگی کے تضادات اور ناہمواریوں کو تیکھے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ برائیاں جو معاشرے میں پائی جاتی ہیں اور جنھیں لوگ روزمرہ کا حصہ تصور کرکے نظر انداز کردیتے ہیں، طنز نگار اِن کو بڑے سلیقے سے بیان کرکے سماج کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتا ہے۔طنز ایک مشکل فن ہے۔ اس کا مقصد دل آزاری نہیں بلکہ تہذیب و شائستگی سکھانا ہے۔

جان پہچان

اکبر کا اصل نام سیّد اکبر حسین اور اکبرؔ تخلص تھا۔ان کے جدامجد ایران سے ہندوستان آئے تھے۔اکبرؔ ۱۶؍نومبر ۱۸۴۶ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔علمی اور ادبی گھرانے کے فرد ہونے کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے ادب کی طرف مائل ہوئے۔اکبرؔ کو اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور تھا۔ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ تعمیرات میں انھوں نے ملازمت کی۔ پھر ۱۸۶۷ء میں قانون کا امتحان پاس کیا اور بحیثیت جج ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں انھیں 'خان بہادر' کا خطاب ملا۔ وہ اُردو ادب میں صفِ اوّل کے طنز و مزاح کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ کے طنزیہ اسلوب پر بھی اکبرؔ کے طنزیہ رنگوں کی چھاپ واضح نظر آتی ہے۔اب تک ان کی شاعری کا کلیات کئی مرتبہ شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ ۹؍ستمبر ۱۹۲۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔

اس طرف تو نے ہسٹری رَٹ لی
اُس طرف جاکے فلسفہ پھانکا
لیکن اکبؔر ، خیالِ عقبیٰ سے
نار و جنت کو بھی کبھی جھانکا

☆

کالج میں ہوچکا جب سب امتحاں ہمارا
سیکھا زباں نے کہنا ، ہندوستاں ہمارا
رقبے کو کم سمجھ کر اکبؔر یہ بول اُٹّھے
ہندوستان کیسا ، سارا جہاں ہمارا
لیکن یہ سب غلط ہے ، کہنا یہی ہے لازم
جو کچھ ہے سب خدا کا ، وہم و گماں ہمارا

☆

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبؔر
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے میں نے جس کو زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دِقّت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے ، یہ اچھی سنائی
کجا عاشق ، کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدردانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا باحسرت و یاس

معانی و اشارات

نار	-	آگ، مراد دوزخ
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس	-	میں ان کی خوشحالی کی طرف سے مایوس ہوں
شاہدِ مقصود	-	جس معشوق کو حاصل کرنا مقصود ہو
ولیکن	-	لیکن
زیبِ قرطاس کرنا	-	لکھنا
کجا	-	کہاں
ہرن پر گھاس لادنا	-	بہت اہم چیز کو اہمیت نہ دینا، بے عزتی کرنا، حقیر سمجھنا
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس		مجھے ہر ایک کے قدموں کا غلام سمجھ لیا ہے (ہرچرن داس کے اصل معنی ہیں ہری یعنی بھگوان کے قدموں کا غلام)
دل خون کرنا	-	بہت تکلیف اُٹھانا
مغزِ سر آماس کرنا	-	دماغ کا پانی بنانا، غیر ضروری دماغی محنت کرنا
شرطِ وصلِ لیلیٰ	-	لیلیٰ سے ملاقات کی شرط

مشقی سرگرمیاں

* پہلے قطعے کی مدد سے خاکہ مکمل کیجیے۔

علوم

متضاد الفاظ

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ قطعے کی تعریف بیان کیجیے۔

۲۔ پہلے قطعے میں اکبرؔ نے جو طنز کیا ہے، اس پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ شاعر کے مطابق عقبیٰ کے خیال کا مفہوم بیان کیجیے۔

۴۔ دوسرے قطعے سے نصیحت والا مصرعہ لکھ کر اس کی تشریح کیجیے۔

۵۔ علامہ اقبالؔ کا وہ مصرعہ لکھیے جس میں انھوں نے اکبرؔ کے قطعے کے فقرے 'ہندوستاں ہمارا' کو استعمال کیا ہے۔

۶۔ دوسرے قطعے کی تشریح اپنے الفاظ میں کیجیے۔

۷۔ مجنوں نے کالج کی تعلیم کو بکواس کہا، وجہ بیان کیجیے۔

۸۔ آخری قطعے میں شاعر نے جس شرط کی طرف اشارہ کیا ہے، اس پر روشنی ڈالیے۔

۹۔ تیسرے قطعے میں 'ہرن، لادنا، گھاس' کے الفاظ آئے ہیں۔اس مناسبت سے شعری صنعت پہچان کر لکھیے۔

۱۰۔ دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
اس صنعت کا نام،تعریف اور صنعت کے الفاظ لکھیے۔

۱۱۔ تیسرے قطعے کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

✻ **ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔**

۱۔ پہلے قطعے کا مرکزی خیال لکھیے۔

۲۔ دوسرے قطعے کو پیش نظر رکھ کر پہلے فقرے کی مناسبت سے دوسرا فقرہ لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

زباں نے کہنا سیکھا	←
اکبر بول اُٹھے	←
یہی کہنا لازم ہے	←
ہمارا	←

۳۔ 'زباں کا کہنا ، ہندوستاں ہمارا' اور 'اکبر کا بولنا سارا جہاں ہمارا' اس پر اپنی ذاتی رائے کا اظہار چار جملوں میں کیجیے۔

۴۔ 'جو کچھ ہے سب خدا کا ، وہم وگماں ہمارا' اس مصرعے کی روشنی میں واضح کیجیے کہ دنیا کی ہر شے خدا کی ہے۔

۵۔ تیسرے قطعے سے زیر اضافت کے الفاظ کا شبکی خاکہ بنائیے۔

۶۔ تیسرے قطعے کے پہلے دو شعروں کے حوالے سے مسلم معاشرے کے بارے میں اکبؔر کے خیالات واضح کیجیے۔

۷۔ اکبؔر کے فرضی لطیفے کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۸۔ ان مصرعوں کا مطلب ایک جملے میں لکھیے۔

(الف) ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

(ب) مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس

(ج) نہیں منظور مغز سر کا آماس

۱۰

غزلیات

غزل - ۱

ولیؔ دکنی

پیش درس

غزل اُردو شاعری کی ایک بہت مقبول صنف ہے۔ اُردو زبان کی ابتدا ہی سے غزل عوام اور خواص میں خوب پسند کی جاتی رہی ہے۔ فارسی غزل کے اثرات نے اُردو غزل میں ایرانی روایات کو داخل کر دیا تھا۔ اس تعلق سے ولیؔ دکنی کا نام اہم ہے کہ انھوں نے مقامی دکنی اثرات کے ساتھ فارسی کے خیالات اور مضامین کو اپنی غزل میں شامل کیا۔ پھر بھی اُردو غزل سے قدیم دکنی اثرات ایک زمانے کے بعد ختم ہوئے۔ جیسے جیسے زبان میں تبدیلیاں آئیں، غزل کی شاعری میں بھی ان تبدیلیوں کو جگہ ملتی گئی۔ ناسخؔ اور ان کے شاگردوں نے زبان کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ انھوں نے بہت سے الفاظ اور روزمرہ کو غزل میں استعمال کرنا بھی ترک کر دیا۔ ان کے بعد مصحفیؔ، آتشؔ، انشاؔ وغیرہ نے غزل میں نئے خیالات اور زبان کے نئے نئے استعمالات کو داخل کیا۔ ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، حالیؔ وغیرہ کے زمانے تک اُردو زبان اپنے شباب پر آ چکی تھی۔ ذوقؔ اور غالبؔ مغل دربار کے اہم شاعر تھے۔ دونوں کے شاگرد ہندوستان بھر میں موجود تھے اس لیے ان کی زبان کے اثرات بھی دور دور تک پھیلے۔ ان کے بعد ریاضؔ، اصغرؔ، جگرؔ اور یگانہؔ کی غزل کے رنگ اُردو میں نمایاں نظر آنے لگے۔ داغؔ، اقبالؔ اور جوشؔ نے اپنے زمانے کے افکار و خیالات کو غزل میں عام کیا جو عوام میں وطن کی محبت کا جذبہ بیدار کرنے والی لفظیات سے مالا مال تھے۔ ملک کی آزادی کی تحریک کے دوران ترقی پسند ادبی تحریک کے زیر اثر فراقؔ، مجروحؔ، جذبیؔ، مخدومؔ، ساحرؔ وغیرہ نے غزل میں اشتراکیت اور عقلیت پسند خیالات کو شامل کیا۔ اس غزل کی لفظیات پرانی شاعری کی لفظیات سے مختلف ہے۔

دوسری جنگ عظیم اور ملک کی آزادی کے بعد دنیا بھر میں بہت سی فکری اور مادّی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ یورپ اور امریکہ کے فلسفے دور دور تک پھیل گئے۔ اس زمانے کے ادیبوں، شاعروں نے جدید تعلیم حاصل کی تو ان کو بھی مغربی خیالات نے بہت متاثر کیا۔ اس زمانے میں اُردو شاعری جدیدیت سے متاثر ہوئی اور نظم میں ہیئتی تبدیلیوں کے ساتھ غزل میں فکری اور فنی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ ناصرؔ، شکیبؔ، جامیؔ، بانیؔ، عمیقؔ، شہریارؔ، علویؔ، ندؔا وغیرہ شعرا نے پرانی زبان اور مضامین کو ترک کر کے بالکل نئے لفظوں میں غزل کہنی شروع کی جس کی مثالیں ان کی غزلوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

آپ غزل کی ہیئت (مطلع، مقطع، قافیے، ردیف) سے واقف ہیں۔ یہاں اُردو زبان کی ابتدائی مثال سے لے کر موجودہ عہد تک کی غزل کی زبان اور لفظیات کی مثالیں مختلف شعرا کی غزلوں میں پیش کی گئی ہیں۔

جان پہچان

ولیؔ کا پورا نام ولی محمد تھا۔ ان کے آبا و اجداد گجرات سے ہجرت کر کے دکن کی طرف آئے اور وہیں بس گئے۔ عام خیال یہ ہے کہ ولیؔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا سنۂ پیدائش ۱۶۶۸ء بتایا جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو دکن کے پیش رو شعرا کے برخلاف غزل کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اس صنف کو انھوں نے بہت جلد بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

جب ولیؔ دلّی پہنچے (۱۷۰۰ء) تو اہلِ دلّی نے ان کی اور ان کے کلام کی بڑی قدر کی۔ ولیؔ کی شگفتہ اور خوش آہنگ غزلوں نے دلّی والوں کا دل موہ لیا۔ یہیں سے اُردو غزل کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ ولیؔ سے پہلے دکنی شاعری میں عشق کا سطحی تصور عام تھا، ولیؔ نے عشق کے تصور کو گہرائی اور گیرائی سے آشنا کیا اور داخلیت کی کیفیات پیدا کیں۔ ولیؔ کا عشق تصوف آشنا ہے۔ یہ اُردو غزل میں بالکل نیا مضمون تھا۔ ۳۱؍ اکتوبر ۱۷۰۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔

نہیں کُئی تا سنے احوال میری دل فگاری کا
کہوں کِس کَن ، گریباں چاک کر ، دکھ بے قراری کا
عجب نئیں اُٹھ کے بے تابی سوں سر مارے کنارے پر
سنے گر ماجرا دریا ہمارے اشکِ جاری کا
ترے غم میں نیَن سے جو نکلتا ہے انجھو باہر
دؤجا گوہر کہاں ہے جگ میں اُس کی آبداری کا
تری وو انتظاری ہے جسے حد ہَور نہایت نئیں
شکایت کِس کنے جاکر کروں اس انتظاری کا
ہوئی ہے آرسی جوگن ترے مکھ کے تصور میں
بھبھوتی مؤ پہ کیا دم مارتی ہے خاکساری کا
کھڑا ہے راستی کے دم میں یک پگ پر ، سو جیوں جوگی
ترے قد سوں لگا ہے دھیان سروِ جوئباری کا
ولؔی انکھیاں کی کر داوات ، پتلی کی سیاہی سوں
لکھیا تیری صفت کوں لے قلم معنی نگاری کا

معانی واشارات

کُئی - کوئی
تا - تاکہ
دل فگاری - دل کا زخمی ہونا
کِس کَن - کس کے پاس، کس سے
نئیں - نہیں
سوں - سے
سر مارے - سر پٹکے
انجھو - آنسو
دؤجا - دوسرا
آب داری - چمک
وو - وہ
نہایت - ختم، خاتمہ

کِس کنے - کس کے پاس، کہاں
آرسی - آئینہ
جوگن - راہبہ، سنیاسن، جوگی کا مؤنث
بھبھوتی - ایک قسم کی راکھ جسے جوگی اپنے بدن پر مَلتے ہیں۔
مؤ - منہ
راستی - سیدھا پن، سچائی
یک پگ - ایک پاؤں
سروِ جوئباری - نہر کے کنارے اُگا ہوا سرو
انکھیاں - آنکھیں
داوات - دوات
کوں - کو
معنی نگاری - ایک بات میں کئی معنی پیدا کرنا

مشقی سرگرمیاں

* قوافی کو متعلقہ مصرعے سے جوڑ کر مکمل شعر لکھیے۔

	الف	ب
۱۔	اشکِ جاری	ترے غم میں نین سے جو نکلتا ہے انجھو باہر
۲۔	آبداری	تری وو انتظاری ہے جسے حد ہور نہایت نئیں
۳۔	انتظاری	ولی انکھیاں کی کر داوات ، پتلی کی سیاہی سوں
۴۔	معنی نگاری	عجب نئیں اٹھ کے بے تابی سوں سر مارے کنارے پر

* غزل کا بغور مطالعہ کرکے ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ مطلع سے دکنی الفاظ تلاش کرکے لکھیے۔

۲۔ غزل کے حوالے سے شاعر کے دل فگاری کے احوال کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ غزل کی روشنی میں شاعر کی بے تابی کا ماجرا سن کر 'دریا کنارے پر سر مارے گا' اس خیال کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ شاعر نے غزل میں آنسو کو گوہر سے تشبیہ دی ہے۔ اس تشبیہ کے اجزا کی وضاحت کیجیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ وہ مصرعہ تلاش کرکے لکھیے جس میں راہبہ کا مترادف لفظ استعمال ہوا ہے۔

۲۔ وہ مصرعہ لکھیے جس میں آنسو کو چمکدار موتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۳۔ وہ مصرعہ لکھیے جس میں راکھ کا مترادف لفظ استعمال ہوا ہے۔

۴۔ اس شعر کی نشان دہی کیجیے جس میں مراعاۃ النظیر کی صنعت استعمال کی گئی ہے۔

* غزل سے وہ اشعار لکھیے جن میں محاورے استعمال کیے گئے ہیں۔

* دیے ہوئے الفاظ سے متعلق غزل میں جو الفاظ آئے ہیں، انھیں دائرے میں لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

آنکھ ← ○ ، ○

آنسو ← ○ ، ○

* مقطع کے شعر میں آئے دکنی الفاظ کا شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

دکنی الفاظ ← ▭ ▭ ▭ ▭

* غزل کی مدد سے موزوں مترادفات لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

۱۔ چہرہ ← مکھ ، انجھو ← ○

۲۔ نہیں ← نئیں ، نین ← ○

۳۔ سنیاسی ← جوگن ، جوگی ← ○

۴۔ پاس ← کُئی ، کنے ← ○

* درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

ہوئی ہے آرسی جوگن ترے مکھ کے تصور میں
بھبھوتی مؤ پہ کیا دم مارتی ہے خاکساری کا

* درج ذیل شعر کا تصوّراتی حسن اس طرح بیان کیجیے کہ شاعر کی دل فگاری و بے قراری واضح ہو جائے۔

نہیں کُئی تا سنے احوال میری دل فگاری کا
کہوں کِس کَن ، گریباں چاک کر ، دکھ بے قراری کا

* صنعتِ مبالغہ کی تعریف لکھ کر غزل سے مبالغے کا شعر تلاش کر کے اس کی وضاحت کیجیے۔

* درج ذیل شعر کا مطلب اپنے الفاظ میں لکھیے۔

تری وو انتظاری ہے جسے حد ہور نہایت نئیں
شکایت کِس کَنے جا کر کروں اس انتظاری کا

اضافی معلومات

غزل - حاتم

جان پہچان : شیخ فتح الدین کے بیٹے شیخ ظہور الدین حاتم ۱۶۹۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ سپاہی پیشہ اور شاہ محمد امین کے مرید تھے۔ کچھ عرصہ الہ آباد کے صوبے دار نواب امیر خاں کی رفاقت میں رہے۔ اس کے بعد ہدایت علی خاں، مراد علی خاں جیسے امرا بھی ان کی مدد کرتے رہے۔ آخر عمر میں انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ حاتم فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے۔ وہ فارسی میں مرزا صائبؔ اور ریختے میں ولیؔ دکنی کو استاد مانتے تھے۔ رفتہ رفتہ ریختے میں وہ خود استاد ہو گئے۔ سوداؔ انھی کے شاگرد تھے۔ اصلاحِ زبان کا کام سب سے پہلے حاتم نے ہی شروع کیا۔ انھوں نے بہت سے نامانوس الفاظ ترک کر کے فصیح الفاظ داخل کیے۔ ان کی تصانیف میں ایک فارسی دیوان ہے۔ اُردو میں انھوں نے ایک ضخیم دیوان جمع کر لیا تھا جبکہ آخر عمر میں اس سے ایک چھوٹا دیوان تصنیف کیا اور اس کا نام 'دیوان زادہ' رکھا۔ ایک دیوان قدیم رنگ میں تھا جو نادر شاہ کی تاخت و تاراج میں ضائع ہو گیا۔ انھوں نے حقے پر ایک مثنوی محمد شاہ بادشاہ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ حاتم نے دہلی میں ۱۷۹۱ء میں وفات پائی اور دلّی دروازے کے باہر دفن ہوئے۔

حاتم کی درج ذیل غزل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ولیؔ کی آمد سے شمال میں دکنی زبان کے اثرات کو بھی قبول کیا جانے لگا تھا، بالخصوص جمع بنانے کے طریقوں میں دکنی اُصولوں کو اپنانے کی روایت زور پکڑ رہی تھی مثلاً آنکھ سے انکھیاں، جگ ہنسی سے جگ ہنسائیاں، کلائی سے کلائیاں، خود نمائی سے خود نمائیاں وغیرہ۔ حاتم ولیؔ کی طرزِ زبان کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ان کی غزلوں کی زبان میں 'دکنی پن' صاف دِکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ حاتم نے خود اصلاحِ زبان کا بیڑا اُٹھایا تھا مگر دکنی زبان کے اثرات سے وہ خود محفوظ نہیں رہے۔

جب سے تمھاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں
تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں

جور و جفا و محبت و مہر و وفا و اُلفت
تم کیوں بڑھائیاں ہیں اور کیوں گھٹائیاں ہیں

مل مل کے روٹھ جانا اور روٹھ روٹھ ملنا
یہ کیا خرابیاں ہیں کیا جگ ہنسائیاں ہیں

زلفوں کا بل بناتے آنکھیں چرا کے چلنا
کیا کم نگاہیاں ہیں کیا کج ادائیاں ہیں

آئینہ روبرو رکھ اور اپنی سج بنانا
کیا خود پسندیاں ہیں کیا خود نمائیاں ہیں

حاتم کے بن اشارہ سچ کہہ یہ چشم و ابرو
کس سے لڑائیاں ہیں کس پر چڑھائیاں ہیں

غزل - ۲

امام بخش ناسخ

جان پہچان

ناسخ کا اصل نام شیخ امام بخش ہے۔ وہ ۱۰ / اپریل ۱۷۷۲ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن لکھنؤ میں گزرا اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کا شمار لکھنؤ کے استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے مزاج میں خودداری بہت تھی اس لیے وہ کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔ اودھ کے حکمراں غازی الدین حیدر انھیں 'ملک الشعرا' کا خطاب دینا چاہتے تھے مگر انھوں نے انکار کر دیا اور عتاب کے خوف سے لکھنؤ چھوڑ کر کچھ عرصے کے لیے الٰہ آباد چلے گئے۔ نظامِ دکن کے دیوان مہاراجا چندو لال نے انھیں حیدر آباد آنے کی دعوت دی مگر انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

ناسخ شاعری کے ظاہری حسن کے دلدادہ تھے۔ ان کے زمانے میں بہت سے الفاظ متروک قرار دیے گئے اور نئے نئے لفظوں کا استعمال بڑھا۔ انھیں دبستانِ لکھنؤ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ گوئی میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے تین دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ ناسخ کا انتقال ۱۶ / اگست ۱۸۳۸ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

اس غزل کے مقطع کے پہلے مصرعے میں شاعر نے کہا ہے کہ حضرت دردؔ نے خوب بات کہی ہے۔ دردؔ کی بات دوسرے مصرعے میں آئی ہے جسے واوین میں لکھا گیا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اپنے سے پہلے گزرے ہوئے شاعر کا کوئی مصرعہ اپنی غزل میں لے کر اس کی حمایت یا مخالفت میں اپنی بات کہتا ہے۔ ایسے شعر کو **تضمین** کا شعر کہتے ہیں۔

نہیں عشق سے زرد ، زردار مَیں ہوں
اگر ہے وہ یوسف ، خریدار مَیں ہوں

وہ بے زار مجھ سے ہوا ، زار مَیں ہوں
وہ مے خوار غیروں میں ہے ، خوار مَیں ہوں

تمنا ہے ، ساقی کبھی بزمِ مے میں
وہ سرشار ہو اور ہشیار مَیں ہوں

وہ کرتا ہے باتیں ، میں کرتا ہوں آہیں
گہربار وہ ہے ، شرربار مَیں ہوں

وہی بولتا ہے جو میں بولتا ہوں
اگر وہ ہے بلبل تو منقار مَیں ہوں

دگرگوں ہے ہر آن وضعِ محبت
کبھی غیر مَیں ہوں ، کبھی یار مَیں ہوں

کہا حضرتِ دردؔ نے خوب ناسخؔ
''یہ زلفِ بتاں کا گرفتار مَیں ہوں''

معانی و اشارات

زردار	دولت مند
زار	بری حالت میں
خوار	رسوا، بے عزّت
بزمِ مے	میخانہ
منقار	چونچ
وضعِ محبت	محبت کے انداز
زلفِ بتاں	معشوقوں کی زلف
بتاں	بت کی جمع، مراد معشوق

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ پہلے مطلع میں شاعر اور اس کے دوست کی حالت کا موازنہ کیجیے۔

۲۔ مطلع کا شعر صنعتِ تلمیح کی مثال ہے۔ اس میں جس تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ تیسرے شعر میں شاعر کی تمنا کو واضح کیجیے۔

۴۔ غزل میں دوست کے باتیں کرنے کو گہرباری کہا گیا ہے، وضاحت کیجیے۔

۵۔ پانچویں شعر کے مفہوم کو اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۶۔ 'دگرگوں ہے ہر آن وضعِ محبت' اس مصرعے کا مفہوم واضح کیجیے۔

* غزل کے موزوں اشعار کی مدد سے خاکہ مکمل کیجیے۔

غزل کے اجزا
- مطلع: ....
....
- حسنِ مطلع: ....
....
- مقطع: ....
....

* درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

(i) وہ کرتا ہے باتیں، میں کرتا ہوں آہیں
گہربار وہ ہے، شرربار میں ہوں

(ii) وہی بولتا ہے جو میں بولتا ہوں
اگر وہ ہے بلبل تو منقار میں ہوں

* وہ بے زار مجھ سے ہوا، زار میں ہوں
وہ مے خوار غیروں میں ہے، خوار میں ہوں

دیے ہوئے شعر سے تجنیس کے الفاظ تلاش کیجیے۔

(i) تجنیس کا نام لکھیے۔

(ii) تجنیس کی تعریف لکھیے۔

(iii) وضاحت کیجیے۔

* اس غزل میں مستعمل ضمائر 'میں' اور 'وہ' کی صفات متعلقہ خانوں میں لکھیے۔

میں	وہ
....	....
....	....
....	....

غزل - ۳

ریاضؔ خیرآبادی

جان پہچان

ریاضؔ کا اصل نام سیّد ریاض احمد ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸۵۲ء میں ضلع سیتاپور کے گاؤں خیرآباد میں ہوئی۔ انھوں نے اپنے نام کو تخلص کے طور پر اختیار کیا۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد طفیل احمد سے حاصل کی۔ جب ان کی طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی تو ابتدا میں انھوں نے مظفر علی اسیرؔ اور ان کے انتقال کے بعد امیرؔ مینائی کی شاگردی اختیار کی۔ ریاضؔ کو 'لسان الملک' اور 'خیام الہند' کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے خیرآباد سے 'ریاض الاخبار' اور ماہ نامہ 'گل کدۂ ریاضؔ' جاری کیے۔ ریاضؔ نے گورکھپور میں بھی سکونت اختیار کی۔ یہاں انھوں نے 'فتنہ' اور 'عطرِ فتنہ' نامی رسالے جاری کیے جن میں ادبی لطائف اور ذوقِ سخن سے متعلق مواد ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو انگریزی ناولوں کا ترجمہ بھی کیا۔ محمود آباد کے راجا صاحب کے اصرار پر وہ لکھنؤ آ گئے تھے۔

ریاضؔ خیرآبادی نے اُردو غزل کو نیا رنگ بخشا۔ شراب کی سرمستی اور سرشاری سے معمور اشعار کی کثرت کی وجہ سے انھیں اُردو شاعری کا 'رندِ پارسا' کہا جاتا ہے۔ ان کا کلیات 'ریاضِ رضواں' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ریاضؔ آبائی وطن میں ہیضے کا شکار ہوئے اور ۲۸ر جولائی ۱۹۳۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔

شرمِ گنہ سے حشر میں جایا نہ جائے گا
ہم سے تو منہ خدا کو دِکھایا نہ جائے گا

ہم سے بھی اس کے دام گھٹائے نہ جائیں گے
ان سے جو مول دل کا بڑھایا نہ جائے گا

بن بن کے بجلی ، آگ لگانے وہ آئیں گے
آنکھوں میں نور بن کے سمایا نہ جائے گا

وہ بھی کھنچے ہیں ، تیغ بھی ان کی کھنچی ہوئی
دونوں کا ناز ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا

دل دیں کسی کے دستِ حنائی میں کس طرح
ہم سے تو آگ میں یہ جلایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ساتھ مرے شمعِ بزم کو
روتے ہوؤں کو تم سے ہنسایا نہ جائے گا

کہتے ہیں وہ ریاضؔ کا دل لے کے کیا کریں
ہم سے گلے کا ہار بنایا نہ جائے گا

معانی واشارات

منہ نہ دِکھانا - سامنے نہ جانا، سامنا نہ کرنا

کھنچا ہونا - غصّے میں ہونا

ناز اُٹھانا - نخرے برداشت کرنا

گلے کا ہار بنانا - قریب رکھنا

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ شاعر حشر میں خدا کو منہ دِکھانے کے قابل نہیں۔ وجہ بیان کیجیے۔

۲۔ دل کے سودے میں شاعر اور اس کے دوست کا رویہ بیان کیجیے۔

۳۔ ناز اُٹھانے میں شاعر کی پریشانی واضح کیجیے۔

۴۔ شاعر اور شمعِ بزم کی حالت کی یکسانیت واضح کیجیے۔

۵۔ شاعر اور شمعِ بزم کو بزم والوں کے چھیڑنے کا مقصد لکھیے۔

۶۔ غزل میں آئے ہوئے محاورے تلاش کر کے اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

۷۔ غزل سے زیرِ اضافت والی ترکیبیں تلاش کر کے لکھیے۔

۸۔ درج ذیل شعر کی تشریح اپنے الفاظ میں کیجیے۔

بن بن کے بجلی ، آگ لگانے وہ آئیں گے
آنکھوں میں نور بن کے سمایا نہ جائے گا

* دیے ہوئے مصرعے کی مناسبت سے خالی چوکون میں مناسب محاورہ لکھیے۔

۱۔ ہم سے تو منہ خدا کو دِکھایا نہ جائے گا ☐

۲۔ وہ بھی کھنچے ہیں، تیغ بھی ان کی کھنچی ہوئی ☐

۳۔ دل دیں کسی کے دستِ حنائی میں کس طرح ☐

۴۔ ہم سے گلے کا ہار بنایا نہ جائے گا ☐

* درج ذیل شعر کا مطلب اپنے الفاظ میں لکھیے۔

ہم سے بھی اس کے دام گھٹائے نہ جائیں گے
ان سے جو مول دل کا بڑھایا نہ جائے گا

* درج ذیل شعر کا معنوی حسن بیان کیجیے۔

وہ بھی کھنچے ہیں ، تیغ بھی ان کی کھنچی ہوئی
دونوں کا ناز ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا

* درج ذیل شعر کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

دل دیں کسی کے دستِ حنائی میں کس طرح
ہم سے تو آگ میں یہ جلایا نہ جائے گا

سرگرمی/منصوبہ

'اشعار میں محاورے' کا البم تیار کیجیے۔ شعر لکھ کر محاورہ اور اس کا مطلب لکھیے۔

غزل - ۴

نوؔح ناروی

جان پہچان

نوؔح ناروی کا پورا نام محمد نوح اور تخلص نوؔح تھا۔ وہ ۱۸؍ستمبر ۱۸۷۸ء کو بھوانی پور (رائے بریلی) میں پیدا ہوئے۔ مختلف اساتذہ سے ابتدائی عربی، فارسی کا علم حاصل کیا۔ ابتدا ہی سے ان کا مَیلان شعر گوئی کی طرف تھا۔ بعد میں انھوں نے داغؔ کی شاگردی اختیار کی۔ وہ داغؔ کے جانشین ہیں۔ نوؔح کا شمار استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے۔ نوؔح کی شاعری کا مزاج عاشقانہ ہے۔ انھیں جملے تراشنے، فقرے وضع کرنے اور خوب صورت الفاظ کے استعمال سے اُنسیت ہے۔ انھوں نے زبان کے محاوروں کو بڑی خوب صورتی سے اپنے شعروں میں استعمال کیا ہے۔ ان کے کئی دیوان ہیں مثلاً 'سفینۂ نوؔح، طوفانِ نوؔح، اعجازِ نوؔح' وغیرہ۔ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔

بڑی سند ہے یہی اشکِ غم بہانے کی
مٹی مٹی سی عبارت مرے فسانے کی

ملی یہ داد ہمیں اپنے دل لگانے کی
ترے ستم سہے ، باتیں سہیں زمانے کی

جو کچھ کہا وہ کہا ، خیر اب خموش رہو
دلاؤ یاد نہ گزرے ہوئے زمانے کی

مکان ہو یہ مبارک مکان والوں کو
ہمیں ہے فکر کسی دل میں گھر بنانے کی

وہ دل جلوں سے یہ کہتے ہیں ، آہ آہ کرو
ابھی ہَوا نہیں پہچانتے زمانے کی

علاوہ خانہ خرابی کے اور کچھ بھی نہ ہو
یہی شناخت ہے میرے غریب خانے کی

یہ ہم کو سانس اُکھڑنے سے ہوگیا معلوم
کہ اک طرح نہیں رہتی ہَوا زمانے کی

اُٹھائیں ہم کوئی طوفان تو بیاں بھی کریں
وہ بات پوچھتے ہیں نوؔح کے زمانے کی

معانی و اشارات

داد - انصاف، تعریف

شناخت - شناسائی، پہچان

اک طرح نہ رہنا - بدلتے رہنا

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ شاعر کے افسانے کی عبارت مٹی مٹی ہے، اس کی وجہ بیان کیجیے۔

۲۔ شاعر کو دل لگانے سے جو صلہ ملا ہے، اسے بیان کیجیے۔

۳۔ شاعر دوست کو خاموش رہنے کی تاکید کر رہا ہے، وجہ لکھیے۔

۴۔ چوتھے شعر میں شاعر کو جس بات کی فکر ہے، اسے واضح کیجیے۔

۵۔ شاعر نے غریب خانے کی جو پہچان بتائی ہے، اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۶۔ اس غزل میں تلمیحی شعر کو پہچان کر اس واقعے کو مختصراً بیان کیجیے۔

۷۔ غزل سے اپنی پسند کے شعر کی نشاندہی کیجیے اور پسند کی وجہ بیان کیجیے۔

* درج ذیل اشعار کا مطلب اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

(i) مکان ہو یہ مبارک مکان والوں کو
ہمیں ہے فکر کسی دل میں گھر بنانے کی

(ii) وہ دل جلوں سے یہ کہتے ہیں، آہ آہ کرو
ابھی ہوا نہیں پہچانتے زمانے کی

(iii) یہ ہم کو سانس اُکھڑنے سے ہوگیا معلوم
کہ اک طرح نہیں رہتی ہوا زمانے کی

* زمانے کی ہوا نہ پہچاننا اور زمانے کی ہوا ایک طرح نہ رہنا، ان محاوروں کی وضاحت کیجیے۔

* غزل میں آئے ہوئے محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

دل لگانا ، آہ آہ کرنا ، سانس اُکھڑنا ، طوفان اُٹھانا ، دل میں گھر بنانا

* 'کہ اک طرح نہیں رہتی ہوا زمانے کی' اس مصرعے کی روشنی میں زمانے کی تبدیلی کے بارے میں لکھیے۔

* شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

غزل کے قافیے

* ہر شعر کے سامنے غزل کے اجزا کے نام لکھیے۔

بڑی سند ہے یہی اشکِ غم بہانے کی
مٹی مٹی سی عبارت مرے فسانے کی

ملی یہ داد ہمیں اپنے دل لگانے کی
ترے ستم سہے، باتیں سہیں زمانے کی

اُٹھائیں ہم کوئی طوفان تو بیاں بھی کریں
وہ بات پوچھتے ہیں نوح کے زمانے کی

غزل - ۵

خورشید احمد جامیؔ

جان پہچان

خورشید احمد جامیؔ کی پیدائش ۱۵/ مئی 1915ء کو حیدرآباد (دکن) میں ہوئی۔ جامیؔ کے بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا، اس لیے معاشی مشکلات نے گھیر لیا۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے فاضل کی سند حاصل کی۔ روزگار کے سلسلے میں وہ محکمۂ آبکاری میں کچھ عرصہ ملازم رہے مگر بعد میں انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

جامیؔ ایک پختہ کار شاعر تھے۔ انھیں فن پر عبور اور زبان پر قدرت حاصل تھی۔ وہ جلیلؔ مانک پوری کے شاگرد تھے۔ استاد کے انتقال کے بعد وہ علی اخترؔ حیدرآبادی اور جوشؔ ملیح آبادی کے شاگرد ہوئے۔ ابتدا میں انھوں نے روایتی انداز کی شاعری کی مگر وطن کی آزادی بالخصوص حیدرآباد میں سیاسی اتھل پتھل کے بعد ان کے شعر کہنے کا انداز بدل گیا۔ ان کی شاعری نے اپنی لفظیات اور موضوعات کے حوالے سے منفرد شناخت بنائی۔ انھوں نے اُردو میں نئی غزل کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی غزلیں اپنے عہد کے مسائل اور تلخ حقیقتوں کو پیش کرتی ہیں۔ ان کے شعری مجموعے 'برگِ آوارہ، رخسارِ سحر، یاد کی خوشبو' مقبول ہو چکے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی نثر اور نظم دونوں میں لکھا۔ بچوں کی نظموں کا مجموعہ 'تاروں کی دنیا' کے نام سے شائع کیا۔ جامیؔ کا انتقال ۸/ مارچ ۱۹۷۰ء کو ہوا۔

خوابوں کی فضا ہے نہ خیالوں کی پری ہے
ہر سمت وہی دھوپ کی دیوار کھڑی ہے

دیکھا تو وہ جھونکا تھا نسیمِ سحری کا
دھوکا یہ ہوا تھا کہ صدا آپ نے دی ہے

اک بار ذرا موسمِ گل کو بھی دِکھاؤ
سوکھے ہوئے پتوں پہ کوئی لاش پڑی ہے

قبروں پہ لگائے ہوئے کتبے تو نہیں ہیں
ہر شکل پہ کیوں ایک سی تحریر لکھی ہے

اک صبح چُراتی ہے ترا رنگِ ندامت
اک رات سنا ہے کہ مجھے ڈھونڈ رہی ہے

کھو جاؤ گے لفظوں کے حسیں شہر میں جا کر
اوہام و عقائد کی وہاں بھیڑ لگی ہے

معانی و اشارات

رنگِ ندامت - شرم کا رنگ

اوہام - وہم کی جمع، گمان، خیال

مشقی سرگرمیاں

٭ **ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔**

ا۔ شاعر کو نسیم سحری سے جس بات کا دھوکا ہوا ہے، اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ دی ہوئی غزل سے درج ذیل الفاظ کے مترادف تلاش کر کے لکھیے۔

آواز ، ہوا ، شرمندگی

۳۔ سوکھے پتوں کو دیکھ کر شاعر کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیال کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ اوہام اور عقائد کو شاعر نے لفظوں کے حسین شہر کہا ہے، اس خیال کی وضاحت کیجیے۔

٭ **درج ذیل اشعار کا مطلب اپنے الفاظ میں لکھیے۔**

(i) قبروں پہ لگائے ہوئے کتبے تو نہیں ہیں
ہر شکل پہ کیوں ایک سی تحریر لکھی ہے

(ii) اک صبح چراتی ہے ترا رنگِ ندامت
اک رات سنا ہے کہ مجھے ڈھونڈ رہی ہے

(iii) کھو جاؤ گے لفظوں کے حسیں شہر میں جا کر
اوہام و عقائد کی وہاں بھیڑ لگی ہے

٭ **لفظ 'گل' سے نیا لفظ جوڑ کر مرکب الفاظ کا شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔**

گل
↓

سرخ پھول -	
پھول سے جسم والا -	
گلاب کی پنکھڑی -	
پھول برسانے والا -	

غزل - ٦

باقؔر مہدی

جان پہچان

باقؔر مہدی ۱۱رفروری ۱۹۲۷ء کو ردولی (بارہ بنکی) میں پیدا ہوئے مگر ان کی عمر کا بڑا حصہ ممبئی میں گزرا۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے معاشیات اور ممبئی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم.اے کیا۔ ان کی متعدد تصانیف میں 'شہرِ آرزو، کالے کاغذ کی نظمیں، ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں' (شعری مجموعے)، 'آگہی و بے باکی، شعری آگہی، تنقیدی کشمکش' (تنقیدی مجموعے) اور ادبی مجلّہ 'اظہار' قابلِ ذکر ہیں۔ 'سیاہ سیاہ' عنوان سے ان کی شاعری کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔

باقؔر مہدی کا شمار جدیدیت کے علم بردار اِن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری میں نئے نئے تجربات کو زیادہ راہ دی۔ انھوں نے نظموں اور غزلوں دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کی نظموں میں احتجاج کی فضا حاوی نظر آتی ہے۔ وہ روشن خیالی اور انسان دوستی کے نظریات کے حامی تھے۔ 'تنقیدی کشمکش' پر اُتر پردیش اور مہاراشٹر کی اُردو اکیڈمیوں نے انھیں انعامات سے نوازا۔ ان کا انتقال ۲۳رستمبر ۲۰۰۶ء کو ممبئی میں ہوا۔

دردِ دل آج بھی ہے ، جوشِ وفا آج بھی ہے
زخم کھانے کا ، محبت میں مزا آج بھی ہے

گرمیِ عشق نگاہوں میں نہیں ہے ، نہ سہی
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں حیا آج بھی ہے

حسن پابندِ قفس ، عشق اسیرِ آلام
زندگی ، جرمِ محبت کی سزا آج بھی ہے

بندشِ لب کے قوانین وہی ہیں ، اے دوست
زہر آمیز زمانے کی فضا آج بھی ہے

دستِ مزدور سے اُلجھی ہوئی زنجیریں ہیں
آہنی ہاتھوں پہ یہ ظلم روا آج بھی ہے

غم کدوں پر ہیں وہی جنگ کے بادل چھائے
امن کی گونجتی ہر سمت ندا آج بھی ہے

اپنے آلام و مصائب کا وہی ہے درماں
'درد کا حد سے گزرنا' ہی دوا آج بھی ہے

میرؔ و غالبؔ کے زمانے سے نئے دور تلک
شاعرِ ہند گرفتارِ بلا آج بھی ہے

معانی واشارات

پابندِ قفس	- پنجرے میں قید	بندشِ لب	- اظہار کی آزادی کا نہ ہونا
اسیرِ آلام	- مصیبتوں میں گرفتار	زہر آمیز	- زہریلا

مشقی سرگرمیاں

* زندگی کو شاعر نے جرمِ محبت کی سزا کہا ہے۔ اسباب بیان کیجیے۔
* 'درد کا حد سے گزرنا' شعر کا یہ فقرہ غالبؔ کی ایک غزل سے لیا گیا ہے، وہ شعر تلاش کرکے لکھیے۔
* درج ذیل شعر کی تشریح اپنے الفاظ میں لکھیے۔

دستِ مزدور سے اُلجھی ہوئی زنجیریں ہیں
آہنی ہاتھوں پہ یہ ظلم روا آج بھی ہے

* 'بندشِ لب کے قوانین' سے شاعر کا جس طرف اشارہ ہے، اسے لکھیے۔
* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ زمانے کی فضا زہر آمیز ہے، وضاحت کیجیے۔
۲۔ نگاہوں میں گرمیِ عشق اور آنکھوں میں حیا کا ربط بیان کیجیے۔
۳۔ غزل کے مقطع کا مطلب واضح کیجیے۔

* غزل کے اشعار کی مدد سے دیے ہوئے الفاظ کے لیے موزوں لفظی ترکیب لکھیے۔

حسن ← ....
عشق ← ....
زندگی ← ....
فضا ← ....

* دی ہوئی اضافی ترکیبوں کو 'حرفِ اضافت' (کا، کی، کے) کا استعمال کرکے خالی چوکون میں لکھیے۔

جرمِ محبت ← ....
جوشِ وفا ← ....

بندشِ لب ← ....
گرفتارِ بلا ← ....

* موجودہ زمانے کی روش اور حالات کے تناظر میں درج ذیل شعر کا استحسان کیجیے۔

بندشِ لب کے قوانین وہی ہیں، اے دوست
زہر آمیز زمانے کی فضا آج بھی ہے

* درج ذیل شعر کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

میرؔ و غالبؔ کے زمانے سے نئے دور تلک
شاعرِ ہند گرفتارِ بلا آج بھی ہے

* درج ذیل شعر کی روشنی میں عالمی منظرنامے پر روشنی ڈالیے۔

غم کدوں پر ہیں وہی جنگ کے بادل چھائے
امن کی گونج ہر سمت ندا آج بھی ہے

* مناسب الفاظ کی مدد سے خاکہ مکمل کیجیے۔

حیا ← ....
زندگی ← ....
زنجیریں ← ....
شاعرِ ہند ← ....

غزل - ۷

رؤف خیرؔ

جان پہچان

رؤف خیر کا اصل نام محمد عبدالرؤف اور تخلص خیرؔ ہے۔ ان کی پیدائش ۵/نومبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد (دکن) میں ہوئی۔ انھوں نے پی ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ گورنمنٹ جونیئر کالج، ورنگل میں اُردو کے لیکچرر ہوئے۔ ان کی تصانیف میں 'اقرأ، ایلاف، شہداب' (شعری مجموعے)، 'بچشمِ خیرؔ، اقبالؔ بچشمِ خیرؔ، خطِ خیرؔ، دکن کی چند ہستیاں' (تنقیدی مجموعے) اور 'قطناز' (اقبالؔ کے فارسی قطعات کا منظوم ترجمہ) منظر عام پر آچکے ہیں۔

رؤف خیرؔ کا شمار جدیدیت کے نمائندہ شعرا میں کیا جاتا ہے۔ کلام کی صلابت اور پر اعتماد لہجے نے انھیں بہت جلد ممتاز جدید شاعروں کی صف میں کھڑا کردیا۔ ان کے کلام میں غزلیں، نظمیں، آزاد نظمیں، سانیٹ، ترائیلے (ایک فرانسیسی صنفِ سخن) سبھی رنگ ملتے ہیں۔

جس شعر میں شاعر اپنی شاعری یا اپنی ذات کے بارے میں فخر کا اظہار کرتا ہے، اسے **تعلّی** کہتے ہیں۔ اس غزل میں تعلّی کی مثالیں موجود ہیں۔

جنوں پسند ، حریفِ خرد تو ہم بھی ہیں
عدو جو نیک نہیں ہے تو بد تو ہم بھی ہیں

ہزار صِفُر سہی ، اک عدد تو ہم بھی ہیں
تمھارے ساتھ ازل تا ابد تو ہم بھی ہیں

اب اتنا ناز سمندر مزاجیوں پہ نہ کر
کہ اپنے آپ میں اک جزر و مد تو ہم بھی ہیں

ہم اپنے آپ سے آگاہ اس قدر تو نہ تھے
چلو ، نشانۂ رشک و حسد تو ہم بھی ہیں

گلہ نہیں ہے اگر تم پہ کھل نہیں پائے
خود اپنے آپ سے ہی نابلد تو ہم بھی ہیں

کوئی ہمیں نظر انداز کر نہیں سکتا
سخن وری کے گلِ سرسَبَد تو ہم بھی ہیں

ہیں مہربان بہرحال اپنے یاروں پر
مخالفین کے رد میں اشد تو ہم بھی ہیں

پڑے ہیں خیرؔ، دکن میں تو چشم کم سے نہ دیکھ
اگرچہ میرؔ نہیں ہیں ، سند تو ہم بھی ہیں

معانی و اشارات

جنوں پسند	جنون کو پسند کرنے والے
حریفِ خرد	عقل کے دشمن
سمندر مزاجی	سمندر کا سا مزاج رکھنے والا، مراد بار بار تبدیل ہونا
کھل نہ پانا	اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنا، واضح نہ ہونا
نابلد	ناواقف
سخن وری	شاعری
گُلِ سرسَبَد	پھولوں کی ٹوکری میں سب سے اوپر والا پھول، مراد نمایاں
سبد	ٹوکری
اشد	بہت شدت کرنے والا
چشمِ کم سے دیکھنا	کم تر سمجھنا

مشقی سرگرمیاں

* شاعر نے اپنے لیے جن صفات کا استعمال کیا ہے اُن سے ذیل کا شمسی خاکہ مکمل کیجیے۔

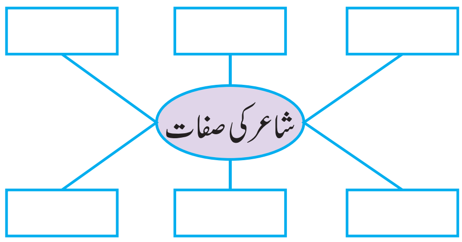

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

ا۔ شاعر کو اپنے نظر انداز نہ کیے جانے کے یقین کی وجہ لکھیے۔

۲۔ درج ذیل شعر کا مطلب لکھیے۔

ہم اپنے آپ سے آگاہ اس قدر تو نہ تھے
چلو ، نشانۂ رشک و حسد تو ہم بھی ہیں

۳۔ شاعر نے سمندر مزاجیوں پر ناز نہ کرنے کی جو وجہ بتائی ہے، اسے لکھیے۔

۴۔ 'ہزار صف' فقرے میں 'ہزار' کے دو معنی ہیں، انھیں لکھیے۔

۵۔ سمندر مزاجی کے مقابلے کے لیے شاعر نے اپنی جو صفت بتائی ہے، اسے لکھیے۔

۶۔ 'نشانۂ رشک و حسد' بننے سے شاعر کو جو فائدہ ہوا ہے، اسے بیان کیجیے۔

۷۔ 'شاعر اپنے آپ کو نہیں جانتا' اِس مفہوم کا مصرعہ لکھیے۔

۸۔ اس غزل سے تعلّی کے دو اشعار چن کر لکھیے۔

* حصہ 'الف' میں دیے ہوئے الفاظ کے پہلے لفظ کا استعمال کر کے حصہ 'ب' میں اسی ترکیب کا نیا مرکب لفظ بنائیے۔

حصہ الف	حصہ ب
حریفِ خرد	....
سخن وری	....
گلِ سرسبد	....
چشمِ کم	....

* درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

اب اتنا ناز سمندر مزاجیوں پہ نہ کر
کہ اپنے آپ میں اک جزر و مد تو ہم بھی ہیں

* 'سخن وری کے گلِ سرسبد تو ہم بھی ہیں' اس مصرعے کی روشنی میں شاعر کی شاعرانہ خود اعتمادی کا استحسان کیجیے۔

* صنعتِ تضاد کی تعریف لکھیے اور اس غزل سے صنعتِ تضاد کے اشعار تلاش کر کے لکھیے۔

قواعد

مجازِ مرسل

ذیل کے جملوں کو پڑھ کر ان کے مفہوم پر غور کیجیے:

۱) • بس دومنٹ میں واپس آتا ہوں۔ (مگر بولنے والا گھنٹے بھر کے بعد واپس آتا ہے) یہ جز بول کر کُل مراد لینا ہے۔
• 'ان ہاتھوں کی تعظیم کرو' (دراصل مزدور کی تعظیم کرو) یہ کُل بول کر جز مراد لینا ہے۔

۲) • میز پر چائے رکھی ہے۔ (چائے سے بھرا کپ رکھا ہے) یہ مظروف بول کر ظرف مراد لینا ہے۔
• بچہ ٹفن لے کر گیا تھا۔ (ٹفن میں کھانا لے کر گیا تھا) یہ ظرف بول کر مظروف مراد لینا ہے۔

کبھی گفتگو میں یا لکھتے وقت ہم لفظوں کو ان کے معلوم معنی سے الگ معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے معنی دو قسم کے ہیں (۱) لغوی معنی یعنی جو معلوم ہیں اور لغت میں لکھے ہوئے ہیں (۲) مجازی معنی جو لغت میں لکھے ہوئے نہیں ہیں مگر بولنے اور سننے والا ان کے معنی اپنی سمجھ کے مطابق طے کر لیتا ہے۔ لفظوں کے ایسے استعمال کو **مجازِ مرسل** کہتے ہیں۔ مجازِ مرسل ہماری گفتگو میں بہت عام ہے۔

اس کی کئی قسمیں ہیں۔ زبان کا مجازی استعمال شاعری میں بھی خوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً

بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال — چرخ گویا ہے آب در غربال

اس شعر میں 'بوند' (جز) سے مراد 'بارش' (کُل) ہے۔

جز بمعنی کل: مثال

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

یہاں لفظ 'سر' (جز) کو سر والے یعنی 'شخصیت' (کُل) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

کل بمعنی جز: مثال

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

یہاں 'بازار' (کُل) کہہ کر بازار کی 'دکان' (جز) مراد ہے۔

ظرف بمعنی مظروف: مثال

سو بار بیاباں میں گیا محملِ لیلیٰ — مجنوں کی طرف ناقہ کوئی گام نہ آیا

بیاباں میں صرف 'محمل' (ظرف) نہیں گیا۔ اس میں 'لیلیٰ' (مظروف) بھی تھی۔

مظروف بمعنی ظرف: مثال

چشم و دل سے جو نکلا ہجراں میں — نہ کبھو بحر و کان سے نکلا

یہاں چشم و دل سے نکلنے والی اشیا 'آنسو اور خون' (مظروف) مراد ہیں جو 'بحر و کان' (ظرف) سے نکلتے ہیں۔

لف و نشر

آتشؔ کا یہ شعر پڑھ کر لفظوں کے استعمال پر غور کیجیے:

جو ابر گریہ کناں ہے تو برق خندہ زناں — کسی میں خو ہے ہماری، کسی میں خو تیری

پہلے مصرعے میں دو اسموں کو ان کی صفات کے ساتھ بیان کیا ہے یعنی ابر - گریہ کناں برق - خندہ زن

مصرعے میں لفظوں کے ایسے استعمال کو 'لف' (یعنی لپیٹنا) کہتے ہیں۔
انھی دو باتوں کو دوسرے مصرعے میں ہماری اور تیری خو (عادت) سے جوڑا گیا ہے یعنی ابر کی طرح رونا ہماری خو ہے اور برق کی طرح خندہ زن ہونا (یعنی ہنسنا) تیری خو ہے۔
دوسرے مصرعے میں پہلے مصرعے کی چیزوں سے ربط کو کھولا گیا ہے، اسے 'نشر' (یعنی کھولنا / پھیلانا) کہتے ہیں۔ شعر میں لفظوں کے ایسے استعمال کو صنعتِ لف ونشر کہا جاتا ہے۔ غالبؔ کا شعر :

آتش و آب و خاک و باد نے لی — وضعِ سوز و نم و رم و آرام

یہاں پہلے مصرعے کے الفاظ 'آتش، آب، خاک، باد' (لف) کے مقابلے میں دوسرے مصرعے کے الفاظ 'سوز، نم، رم، آرام' (نشر) لائے گئے ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

❋ ذیل کے شعروں میں لف ونشر سے ربط والے الفاظ کو آمنے سامنے لکھیے۔

۱۔ بحر و بر میں جھاڑ دے دامن اگر تو فیض کا
قطرہ دُرِ بے بہا ہو ، لعل سنگِ بے بہا

۲۔ کس قدر ہوتے ہیں ناخوش کس قدر ہوتے ہیں خوش
آپ ہم کو دیکھ کر اور آپ کو ہم دیکھ کر

❋ اس شعر میں مجازِ مرسل کی قسم بتائیے۔

ترے غم میں نیَن سے جو نکلتا ہے انجھو باہر
دوُجا گوہر کہاں ہے جگ میں اُس کی آبداری کا

تجنیسِ خطی

ذیل کے اشعار پڑھ کر ان میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے :

تیاریِ تیغ و تبر و تیر ہوئی ہے — تدبیرِ گرفتاریِ شبّیر ہوئی ہے

تلافی ہوگئی عسرت کی عشرت ، اے زہے قسمت — مبدل ہوگئی آسانیوں سے میری دشواری

پہلے شعر کے الفاظ 'تبر - تیر' لکھنے میں ایک سے ہیں۔ ان میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے۔ دوسرے شعر کے الفاظ 'عسرت - عشرت' بھی یکساں لکھے گئے ہیں، صرف نقطوں کا فرق ہے۔
جب شعر میں ایسے دو لفظ آئیں کہ املا میں ایک جیسے ہوں مگر صرف ایک دو نقطوں کے فرق سے ان کے معنی بدل جاتے ہوں تو ایسی تجنیس کو تجنیسِ خطی کہتے ہیں۔

تجنیسِ زائد/ ناقص

ذیل کے اشعار پڑھ کر ان میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے :

یوں نہ باتیں چبا چبا کے کرو — مہرباں ، بات ہے ، نبات نہیں

متاعِ جاں پہ مری چال چل رہا ہے کوئی — دیا ہے جس نے مجھے دل اسے دماغ ملا

دیوار کھڑی کرتے ہوئے راہ میں راہی — کہتا ہے کہ سایے کو شجر آئے نہ آئے

پہلے شعر کے الفاظ 'بات - نبات' میں ایک حرف 'ن' شروع میں زائد ہے۔
دوسرے شعر کے الفاظ 'چال - چل' میں ایک حرف 'ا' درمیان میں زائد ہے۔
اور تیسرے شعر کے الفاظ 'راہ - راہی' میں ایک حرف 'ی' آخر میں زائد ہے۔
جب شعر میں ایسے دو لفظ آئیں جن کے املا میں ایک حرف (شروع، درمیان یا آخر میں) زیادہ ہو تو ایسی تجنیس کو **تجنیسِ زائد** یا **تجنیسِ ناقص** کہتے ہیں۔

تجنیسِ مذیّل

ذیل کے اشعار پڑھ کر ان میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے:

مانگ سے اس کی ، مانگتی ہے بھیک
سر کا کاسہ ہوا شبِ تاریک

چشمِ غضب سے نیم نگہ میرے واسطے
اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا

عجب رنگ رنگیں قباؤں میں تھے
دل و جان جیسے بلاؤں میں تھے

پہلے شعر کے الفاظ 'مانگ - مانگتی' کے آخر میں دو حروف 'ت ی' زائد ہیں۔
دوسرے شعر کے الفاظ 'نیم - نیمچہ' ہیں اور دو حروف 'چ ہ' زائد ہیں۔
تیسرے شعر کے الفاظ 'رنگ - رنگیں' ہیں اور دو حروف 'ی، ں' زائد ہیں۔
جب شعر کے دو یکساں لفظوں میں ایک لفظ کے آخر میں دو حروف زائد آئیں تو ایسی تجنیس کو **تجنیسِ مذیل** کہتے ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

* **درج ذیل اشعار میں تجنیسِ خطی، زائد اور مذیل کی نشان دہی کر کے اس کا نام لکھیے۔**

۱۔ نہیں عشق سے زرد ، زردار میں ہوں
اگر ہے وہ یوسف ، خریدار میں ہوں

۲۔ وہ بے زار مجھ سے ہوا ، زار میں ہوں
وہ مے خوار غیروں میں ہے، خوار میں ہوں

۳۔ یا رب ، خلاقِ ماہ و ماہی تو ہے
بخشندۂ تاج و تخت شاہی تو ہے

۴۔ پردے اُٹھ جائیں جب جدائی کے
حال اس دم کھلیں خدائی کے

بحر اور تقطیع

کسی کہانی کو بلند آواز سے پڑھیے۔ آپ اپنی آواز سن کر محسوس کریں گے کہ اس کے لفظوں کو ادا کرتے وقت گویا ہم کسی سے بات کر رہے ہوں۔ یہ نثر پڑھنے یا بولنے کا انداز ہے۔ ایسے ہی اگر ہم کوئی نظم بلند آواز سے پڑھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہماری آواز میں ایک خاص قسم کا اُتار چڑھاؤ یا آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ آہنگ سے پڑھنا شعر پڑھنے کا انداز ہے۔ اسے آوازوں کی موزونیت سے پڑھنا بھی کہتے ہیں۔ موزونیت کا مطلب ہے کہ شعر میں استعمال کیے جانے والے الفاظ ایک خاص وزن رکھتے ہیں۔ یہی شعر کا آہنگ ہے جسے علمی زبان میں بحر کہتے ہیں۔ بحر دراصل شعر کی ادائیگی میں استعمال کیا جانے والا چھوٹی بڑی آوازوں کا ایک نظام ہے۔ مختلف شعروں کا آہنگ یا آوازوں کا نظام مختلف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے شعروں کی بحریں بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں۔ شعروں کی بحر کی آوازوں کی مقدار کے مطابق ہر بحر کا الگ نام ہوتا ہے مثلاً بحرِ متقارب۔ ذیل کے مسدس کا ایک بند بلند آواز سے پڑھیے۔

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ، وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا — نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا — ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

جب یہ اشعار مسلسل پڑھے جاتے ہیں تو ہمیں اپنی آواز میں ایک خاص آہنگ سنائی دیتا ہے۔ یہی ان شعروں کی بحر کا آہنگ ہے۔ آپ نویں جماعت میں سوداؔ کی یہ غزل پڑھ چکے ہیں۔

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

اس شعر کے بعد غزل کے دوسرے شعروں کا آہنگ بھی اوپر دیے گئے حالیؔ کے شعروں کے آہنگ جیسا ہے یعنی دونوں کی بحر ایک ہے۔ اس بحر کے آہنگ کو ظاہر کرنے والی چھوٹی بڑی آوازوں کا جو صوتی رکن بنتا ہے، اس کا نام فعولن ہے اور اس رکن کی تکرار سے بننے والی بحر کا نام بحرِ متقارب ہے۔ اب اس رکن کو تکرار سے پڑھیے :

فعولن فعولن فعولن فعولن
فعولن فعولن فعولن فعولن

آپ محسوس کریں گے گویا ہم اوپر دیے ہوئے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ اس رکن 'فعولن' میں 'ف' چھوٹی آواز ہے اور 'عو' اور 'لن' بڑی آوازیں ہیں۔ ان آوازوں کو ہم دیے گئے شعروں کے لفظوں کے سامنے رکھیں تو پتا چلے گا کہ شعر کی چھوٹی آوازیں 'ف' کے مقابل اور بڑی آوازیں 'عولن' کے مقابل آ رہی ہیں جیسے :

عرب جس	کا چرچا	ہے یہ کچھ،	وہ کیا تھا
ف عو لن	ف عو لن	ف عو لن	ف عو لن
ع ربِ جس	کَ چرچا	ہَ یے کچھ	وَ کا تھا
چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ

(چھ آ = چھوٹی آواز، ب آ = بڑی آواز)

جہاں سے	الگ اک	جزیرہ	نما تھا
ف عو لن	ف عو لن	ف عو لن	ف عو لن
ج ہا سے	ا لگ اک	ج زی رہ	نُ ما تھا
چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ

خیال رہنا چاہیے کہ پہلے مصرعے میں لفظ 'کا'، لفظ 'ہے' اور لفظ 'وہ' چھوٹی آوازوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس مصرعے میں لفظ 'کیا' کی یائے وصلی کو گرا کر 'کا' کر دیا گیا ہے جب کہ لفظ 'یہ' لمبی آواز میں جیسے 'یے'۔ رکن 'فعولن' شعر کے دونوں مصرعوں میں آٹھ مرتبہ آیا ہے اس لیے اس سے بننے والی بحر کو **بحر متقارب مثمن سالم** کہتے ہیں۔ (مثمن کے معنی عربی میں آٹھ ہیں)

اوپر کے تجزیوں میں ہم نے شعر کو بحر کے رکن 'فعولن' کے وزن پر جانچا۔ اس عمل کو **تقطیع** کہتے ہیں۔

شعر کی تقطیع کے اِن اصولوں کو یاد رکھیے:

۱۔ چھوٹی آواز کے سامنے چھوٹی اور بڑی آواز کے سامنے بڑی آواز آتی ہے۔

۲۔ ساکن حرف کے سامنے ساکن اور متحرک کے سامنے متحرک حرف آتا ہے۔

۳۔ کبھی چھوٹی آواز کو بڑی آواز کی طرح پڑھنا پڑتا ہے۔

۴۔ کبھی بڑی آواز کو چھوٹی آواز کی طرح بھی پڑھنا پڑتا ہے۔

۵۔ کبھی زیر اضافت کو 'یے' کی طرح بڑی آواز میں پڑھتے ہیں۔

۶۔ ہکاری آوازیں (بھ، جھ، کھ وغیرہ) ایک آواز شمار کی جاتی ہیں (ب، ج، ک وغیرہ)

۷۔ 'ں' کو تقطیع میں شمار نہیں کیا جاتا یعنی غنہ منفرد آواز نہیں ہے۔

۸۔ تشدید والی آوازیں دو آوازیں مانی جاتی ہیں۔

۹۔ تقطیع میں وہی آوازیں شمار کی جاتی ہیں جن کو ادا کیا جاتا ہے۔ ان کا شمار نہیں ہوتا جو صرف لکھی جاتی ہیں، ادا نہیں کی جاتیں۔

بحر ہزج

آتشؔ کے درج ذیل اشعار بلند آواز سے پڑھ کر ان کی موزونیت پر توجہ دیجیے:

محبت کا تری بندہ ہر اک کو ، اے صنم پایا ‌ ‌ ‌ ‌ برابر گردنِ شاہ و گدا دونوں کو خم پایا
ہزاروں حسرتیں جاویں گی میرے ساتھ دنیا سے ‌ ‌ ‌ ‌ شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں ‌ ‌ ‌ ‌ غنیمت جان ، جو آرام تو نے کوئی دم پایا

آپ پڑھ چکے ہیں کہ بحر متقارب کے رکن میں تین آوازیں ہیں: ایک چھوٹی (فَ) اور دو بڑی (عو اور لن)۔ آتشؔ کے اشعار پڑھنے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس میں بھی چھوٹی بڑی آوازیں سنائی دیتی ہیں: ایک چھوٹی 'مَ' اور تین بڑی 'فا عی لن'۔ ان آوازوں کے ملنے سے شعر کے آہنگ کا جو وزن بنتا ہے اسے **مفاعیلن** (مفا عی لن) کہتے ہیں اور اس سے بننے والی بحر کا نام **ہزج** ہے۔ رکن مفاعیلن کو تکرار سے پڑھیے:

مفاعی لُن ‌ ‌ مفاعی لُن ‌ ‌ مفاعی لُن ‌ ‌ مفاعی لُن
مفاعی لُن ‌ ‌ مفاعی لُن ‌ ‌ مفاعی لُن ‌ ‌ مفاعی لُن

آپ کو یہاں یہی محسوس ہوگا گویا ہم آتشؔ کے اشعار پڑھ رہے ہوں۔ مفاعیلن کی تکرار کو ہم دیے گئے شعروں کے سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ شعر کی چھوٹی آوازیں 'م' کے سامنے اور بڑی آوازیں 'فاعی لُن' کے سامنے آ رہی ہیں جیسے :

محبت کا	تری بندہ	ہراک کوا ے	صنم پایا
م فاعی لن	م فاعی لن	م فاعی لن	م فاعی لن
م حب بت کا	تِ ری بندہ	ہَ رِک کواَے	صَ نم پایا
چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ

برابر گر	د نِ شاہ و	گدا دونوں	کوخم پایا
م فاعی لن	م فاعی لن	م فاعی لن	م فاعی لن
ب را بر گر	د نے شاہو	گ دا دونو	کُ خم پایا
چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ

خیال رہے کہ دوسرے مصرعے کی تقطیع میں 'گردنِ شاہ وُ' کا فقرہ ٹوٹ جائے گا۔ 'گرُ' پہلے حصے میں آتا ہے اور لفظ 'گردنِ' کو 'گردنے' پڑھیں گے۔ اسی طرح 'کوخم پایا' میں 'کوُ' چھوٹی آواز 'کُ' بن جائے گا۔ رکن 'مفاعیلن' شعر کے دونوں مصرعوں میں آٹھ بار آتا ہے اس لیے اس بحر کو **بحر ہزج مثمن سالم** کہتے ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کے اشعار کی تقطیع کیجیے۔

۱۔ وہی روشنی ہے ، وہی قمقمے ہیں
وہی شور و غل ہے ، وہی چہچہے ہیں

۲۔ وہ کرتا ہے باتیں ، میں کرتا ہوں آہیں
گہربار وہ ہے ، شرربار میں ہوں

۳۔ دلایا جس نے حق انسان کو عالی تباری کا
شکستہ کردیا ٹھوکر سے بت سرمایہ داری کا

۴۔ ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

۵۔ ہوئی ہے آرسی جوگن ترے مکھ کے تصور میں
بھبھوتی مؤ پہ کیا دم مارتی ہے خاکساری کا

۶۔ وہی بولتا ہے جو میں بولتا ہوں
اگر وہ ہے بلبل تو منقار مَیں ہوں

اضافی مطالعہ

۱ اُمّید کی خوشی

سرسیّد احمد خاں

پیشِ درس

انشائیہ نثری ادب کی ایک صنف ہے جس میں کسی موضوع کے حوالے سے انوکھے خیالات، تاثرات اور احساسات کو ادبی پیرایے میں بیان کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار کے نقطۂ نظر اور اس کی انوکھی سوچ کے علاوہ انشائیے میں شخصی اظہار کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ غیر رسمی طریقۂ کار، شگفتگی، بے تکلفی اور آزادانہ اظہارِ خیال انشائیے کو ایک لطیف نثر پارہ بناتے ہیں۔

اُردو کی چند نئی اصناف کی طرح انشائیہ بھی مغربی ادب سے مستعار ہے۔ فرانسیسی ادیب مونٹین اس کا موجد ہے۔ Essay یا Personal Essay کے نام سے معروف اس صنف کو کئی زبانوں نے اپنایا۔ انگریزی میں بیکن، ہیزلٹ، لیمب، ایڈیسن، اسٹیل، جانسن اور اے جی گارڈنر جیسے ادیبوں نے اسے پروان چڑھایا۔

سرسیّد احمد خاں نے انگریزی 'ایسے' کی طرز پر اُردو میں انشائیے تحریر کیے۔ ان کے ہم عصر ادیبوں میر ناصر علی، عبدالحلیم شرؔر، خلیقی دہلوی، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی وغیرہ کے مضامین میں انشائیوں کا رنگ و آہنگ موجود ہے۔

جدید انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اس صنف کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامے 'اوراق' میں کئی انشائیہ نگاروں کو متعارف کیا گیا۔

انشائیہ عام مضامین اور مقالات سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ مقالات کے مطالعے سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ انشائیہ پڑھ کر گویا ہم کسی ایسی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں جو روزانہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات و محسوسات کو بے تکلفی کے ساتھ دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے۔ انشائیہ ناول اور افسانے سے مختلف قسم کی تحریر ہے۔ افسانے اور ناول میں مرکزی خیال کا ہونا ضروری ہے۔ انشائیے میں واقعات ہو سکتے ہیں لیکن ان کا مقصد کہانی کی پیش کش نہیں بلکہ انشائیہ نگار ان کی مدد سے اپنی بات مکمل کرتا ہے۔ انشائیہ ذہن کی آوارہ خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ وہ اپنی ذہنی ترنگ اور تخیل کے سہارے معمولی موضوعات پر بھی انوکھے خیالات پیش کر کے انسانی فطرت کے کسی نیم تاریک گوشے کو منور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُردو میں کئی ادیبوں نے مختلف موضوعات پر معیاری انشائیے تحریر کیے ہیں۔

جان پہچان

سرسیّد احمد خاں ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی اور مشرقی علوم سے فراغت کے بعد وہ بائیس سال کی عمر میں عدالت صدر امین (دلّی) کے محکمے سے منسلک ہوئے۔ کچھ عرصے بعد وہ کمشنر آگرہ کے دفتر میں نائب منشی بنے، پھر مین پوری میں سرکاری خدمات انجام دیں۔ بہادر شاہ ظفرؔ نے انھیں جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا کیا۔ مرادآباد، علی گڑھ اور بنارس میں صدر الصدور کے منصب پر بھی وہ فائز رہے۔ ۱۸۷۶ء میں وظیفہ یاب ہو کر قومی خدمت میں سرگرم ہو گئے۔

سرسیّد نے ہندوستانی مسلمانوں میں جدید سائنسی تعلیم کو فروغ دینے کی غرض سے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۸۷۷ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ہے جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔

سرسیّد کی تصانیف میں 'آثار الصنادید، اسبابِ بغاوتِ ہند، خطباتِ احمدیہ' اور 'تاریخِ سرکشیِ بجنور' اہم ہیں۔ ان کا عظیم الشان ادبی کارنامہ ان کے وہ مضامین ہیں جو 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی نثر میں علمی متانت، فطری سادگی، بے ساختگی اور استدلال

کا حسن ہے۔ سر سیّد نے ایڈیسن اور اسٹیل کے طرز پر مضامین لکھے۔ انگریزی کے ان مشہور انشائیہ نگاروں کے ہاں معاشرے کی اصلاح کا جذبہ نمایاں ہے۔ سر سیّد بھی اسی جذبے سے سرشار تھے۔ ان کے مضامین میں 'اُمید کی خوشی' کو اُردو انشائیے کا اوّلین نقش تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ سر سیّد کا انتقال ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں ہوا۔

او نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوب صورت بیٹی اُمید! خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لیے نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری، بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے لیے محبت، محبت کے لیے نیکی تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیرے ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

اے آسمانوں کی روشنی اور اے نااُمید دِلوں کی تسلی اُمید! تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محبت کا پھل ملتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے درمیان جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایے کو ڈھونڈتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانے کی خیالی خوشیاں سب آ موجود ہوتی ہیں۔

دیکھ! نادان بے بس بچہ گہوارے میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے کام میں لگی ہوئی ہے اور اس کے گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے: سو جا میرے بچے سو جا، اے میرے دل کی کونپل سو جا۔ اور پھل پھول! تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پائے۔ تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ پر نہ آوے۔ کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی، تو نہ دیکھے۔ سو جا میرے بچے، سو جا۔

یہ اُمید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جب بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا، پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق سنانے لگا اور جب وہ تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو اُمید کی خوشیاں کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ آہ، ہماری پیاری اُمید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھ وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنویں میں سات تہ خانوں میں بند ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے۔ بے یار و دیار غیر قوم کے لوگوں کے ہاتھوں میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانے کی مصیبت، اس کی تنہائی، اس کا گہرا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے مگر اے ہمیشہ رہنے والی اُمید! تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں مگر سب میں اس کو تقویت تجھی سے ہے۔ وہ جب اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوتِ بازو اور اے بہادری کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال اس کے دل کو تقویت دیتا ہے۔ ان کے کان نقارے میں تیرے ہی نغمے کی آواز سنتے ہیں۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید! جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے، پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہوجاتا ہے، منہ پر مردنی چھا جاتی ہے، ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔

اس وقت بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دِکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، اُمید ہوتی ہے۔ یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لیے موسمِ بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہوجاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی اُمید تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو خوشی کی صبح میں بدل دیتی ہے گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ اُمید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلیف آنے والے زمانے کی اُمید میں نہایت بُردباری سے اور رنجوں کے زمانے کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے جان دیتا ہے۔

مشقی سرگرمیاں

* **ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔**

۱۔ اُن افراد اور ان کی اُمیدوں کا ذکر کیجیے جن کا آخری سہارا اُمید ہوتی ہے۔
۲۔ 'ماں کی لوری' اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
۳۔ موت کے وقت اُمید کے سہارے کی وضاحت کیجیے۔
۴۔ 'اُمید' سے متعلق اپنی رائے بیان کیجیے۔

* **ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔**

۱۔ مصنف نے اُمید کو جن فقروں سے پکارا ہے، اُن کی وضاحت کیجیے۔
۲۔ ''انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیرے ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔'' اس بیان پر اپنی رائے تحریر کیجیے۔
۳۔ ''اُمید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔'' اس بیان کے لیے سبق سے مثالیں تلاش کر کے لکھیے۔
۴۔ ''اُمید غم کی شام کو خوشی کی صبح میں بدل دیتی ہے۔'' اس جملے کی تائید میں اپنا خیال/کہانی/واقعہ بیان کیجیے۔

سرگرمی/منصوبہ سابقہ درسی کتابوں سے سرسیّد احمد خاں کے کسی ایک انشائیے کو نقل کیجیے اور اس پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

۲

مچھّر

خواجہ حسن نظامی

جان پہچان

خواجہ حسن نظامی کا اصل نام سیّد علی حسن تھا۔ وہ ۶/جنوری ۱۸۷۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام سیّد عاشق علی نظامی تھا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے خواجہ حسن نظامی کی کئی جہتیں ہیں؛ افسانہ نگار، مترجم، صحافی، تنقید نگار، روزنامچہ نگار، انشائیہ نگار وغیرہ۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر تقریباً تین سو کتابیں لکھیں۔ ان کی تصانیف میں 'سی پارۂ دل، بیگمات کے آنسو، جگ بیتی کہانیاں، کرشن بیتی، یزید نامہ' اور 'غدرِ دہلی کے افسانے' بہ طور خاص مشہور ہیں۔ انھوں نے کئی اخبار نکالے مثلاً 'منادی، توحید، روزنامہ رعیت' وغیرہ۔

خواجہ حسن نظامی نمائندہ انشائیہ نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ 'غدرِ دہلی کے افسانے' غدر کے بعد تباہ شدہ دلّی کی عصری صورتِ حال کا آئینہ ہے۔ انھوں نے روزنامچے بھی لکھے۔ یہی روزنامچے ان کی انشائی فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مچھر، جھینگر کا جنازہ، دیاسلائی، آنسو کی سرگزشت، اُلّو وغیرہ خواجہ حسن نظامی کے نمائندہ انشائیے ہیں۔ ۳۱/جولائی ۱۹۵۵ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کردی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلے کے لیے مہمّیں تیار ہوتی ہیں۔ جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔ مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پاسکتا۔ طرح طرح کے مسالے بھی بناتا ہے کہ ان کی بو سے مچھر بھاگ جائیں۔ لیکن مچھر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بیچارہ آدم زاد حیران رہ جاتا ہے۔

امیر غریب، ادنیٰ اعلیٰ، بچے بوڑھے، عورت مرد، کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی اس کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ اِن جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجیٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے مگر مچھر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھر اور پسّو کے ذریعے سے پھیلتا ہے۔ ان کو فنا کردیا جائے تو یہ ہولناک بلا دور ہوجائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔ اس سرے سے اس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹادو۔ مچھروں کو کچل ڈالو۔ مچھروں کو تہس نہس کردو اور ایسی تدبیریں نکالو جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہوجائے۔

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے 'پائنیر' کو آکر دیکھتا اور اپنی برائی کے حروف پر بیٹھ کر اُس خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا

اپنے قاعدے کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کرسکتے۔

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے، کوڑے کرکٹ، میل کچیل سے پیدا ہوتا ہے اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدلی تو دیکھو، اس وقت حملہ کرتا ہے جب ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا، بے خبر کے چرکا لگانا مردانگی نہیں، انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو، کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں، بے ڈول چہرہ اس شان وشوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے، خوش وضع پیاری ادا کی دشمنی! بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب! ہمت ہے تو مقابلہ کیجیے۔ ذات صفات نہ دیکھیے۔ میں کالا سہی، بدرونق سہی اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہیے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کا ناک میں دم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت! میں تو کان میں آ کر 'الٹی میٹم' دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہوجاؤ! اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کردے گا کہ میدانِ جنگ میں کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں والا، بے ڈول فتح یاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اِس پردۂ دنیا پر کیا کیا جوہر دِکھائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا؟ کون اس پر غالب آیا؟ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی؟ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجیے یا مجھ سے سنیے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کیے لیتے ہو۔ میں تمھارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کرلو۔ وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالمِ ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارہ خلوت خانے میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے، باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہوکر اپنے مالک کے دیے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کریں اور حمد وشکر کے گیت گائیں۔ اس لیے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے، ''اُٹھو میاں، اُٹھو جاگو۔ جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بے فکر ہوکر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے۔'' مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہوکر غیظ وغضب میں اس کے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ پر واہ رے انسان! آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بے چارے مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اِس دروغ گو سے پوچھے کہ جناب عالی! کَے سیکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہورہا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سن کر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں بلکہ میں دل ہی دل میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب مصلّے پر بیٹھے وظیفہ پڑھتے ہیں اور میں ان کے

پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور مناسب رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگر چہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی ہے، قدم چومتا ہے اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوتی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔

سو اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کرلیں جیسا کہ صوفی صاحب نے کیا تو یقین ہے کہ ہماری قوم انسان کو ستانے سے خود بخود باز آجائے گی۔ ورنہ یاد رہے کہ میرا نام مچھر ہے۔ لطف سے جینے نہ دوں گا۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ مچھر کے لیے استعمال کیے گئے ناموں کا شبکی خاکہ بنائیے۔

۲۔ مچھر کے آگے انسان کی بے بسی کی کیفیت قلم بند کیجیے۔

۳۔ مچھر نے اپنی تعریف میں جو جملے کہے ہیں، انھیں ترتیب سے لکھیے۔

۴۔ مچھر کی زبانی بیان کیے گئے کارنامے تحریر کیجیے۔

۵۔ شاہ صاحب کے مچھر کو پسند کرنے کی وجہ بیان کیجیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ مچھر کے بارے میں انسان کے خیالات کو اپنے جملوں میں تحریر کیجیے۔

۲۔ مچھر کی کھری کھری باتوں کو لکھیے۔

۳۔ ''اُٹھو میاں، اُٹھو جاگو۔ جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے۔'' اس بیان کی وضاحت کیجیے۔

سرگرمی/منصوبہ

اُردو کمار بھارتی، نویں جماعت سے انشائیہ نقل کیجیے اور اس پر تبصرہ کیجیے۔

۳

بے ترتیبی

احمد جمال پاشا

جان پہچان

احمد جمال پاشا یکم جون ۱۹۳۲ء کو الہ آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ انھوں نے 'اودھ پنچ کی ادبی خدمات' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈی.لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ایک عرصے تک روزنامہ 'قومی آواز' کے شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج سیوان میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔

احمد جمال پاشا اُردو کے اہم مزاح نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں معاشرے کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے اور ایسے کردار پیش کیے ہیں جو سماجی ناہمواریوں اور بدعنوانیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کا مضمون 'ادب میں مارشل لا' طنز کی عمدہ مثال ہے۔ احمد جمال پاشا نے آخری عمر میں انشائیہ نگاری کی تحریک سے متاثر ہوکر اس صنف کے فنی لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے انشائیے تحریر کیے۔ ان میں 'ہجرت، بے ترتیبی، بلبیوں کے سلسلے میں' اور 'بور' قابلِ ذکر ہیں۔ احمد جمال پاشا نے فنِ انشائیہ نگاری سے متعلق مضامین بھی لکھے۔ 'اندیشۂ شہر، چشمِ حیراں' اور 'مضامینِ پاشا' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ۲۸ر ستمبر ۱۹۸۶ء کو پٹنہ میں ان کا انتقال ہوا۔

بے ترتیبی عین فطرت ہے۔ اس دنیائے آب و رنگ کی سب سے بڑی ترتیب یہی ہے کہ کوئی ترتیب نہ رہ جائے جس کے سب سے بڑے گواہ ہمارے اِرد گرد بکھرے ہوئے مظاہرِ فطرت ہیں۔ فطرتِ انسانی بھی تو آخر نیچر ہی کی تابع ہے جس میں نہ جانے کتنے نظامِ شمسی اور لاتعداد جہان بلا کسی ترتیب کے اپنے اپنے مدار پر گردشِ ماہ و سال میں مصروف ہیں۔

میری نگاہوں کے سامنے لامحدود نیلگوں آسمان کتابِ فطرت کی طرح کھلا ہوا ہے جس پر بے شمار ستارے اور سیارے انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ جل اور بجھ رہے ہیں۔ بالکل فوج کی طرح میدانِ جنگ میں بکھرے ہوئے، پھیلے ہوئے اس بے ترتیبی میں عجب شانِ ترتیب ہے۔ چھوٹے، بڑے، دور، قریب، مدھم، روشن بلب کی طرح بھڑکتے اور فیوز ہوتے، روشنی کی لکیر بناتے ہوئے غائب ہوجانے والے تارے!

شام کو میری بہترین تفریح آسمانی بائیسکوپ ہے۔ چارپائی پر لیٹا ہوا، اپنے وجود سے بے نیاز آوارہ بادلوں کے رنگ برنگے ٹکڑوں سے بنتی مٹتی تصویریں دیکھتا رہتا ہوں۔ ایک بڑا سا بادل سمٹ کر پہاڑ بن گیا۔ پہاڑ کا دامن بڑھتے بڑھتے اونٹ بن گیا۔ اونٹ کے نیچے پہاڑ نظر آنے لگا۔ جو پارۂ ابر چڑیا معلوم ہورہا تھا، اب ہاتھی سے بھی بزرگ تر سیمرغ بن بیٹھا۔ اس کی دیومالائی چونچ تحلیل ہوکر بڑا سا انسانی چہرہ بن گئی جس کے گدھے کی طرح لمبے لمبے کان نمودار ہوگئے، سونڈ نکل آئی، جو بڑھتے بڑھتے اژدہا ہوگئی۔ اژدہا بڑھ کر گھڑیال معلوم ہونے لگا، سمٹا تو قطب مینار ہوگیا۔ رفتہ رفتہ مینار پھیل کر نیلی جھیل میں تبدیل ہوگیا، جھیل پہاڑوں میں روپوش ہوگئی۔ نفسِ انسانی کی طرح ان سیماب پا ابر پاروں کو قرار نہیں۔ بادل کے ٹکڑے یوں پلک جھپکنے میں بدل جاتے ہیں جیسے آدمی بات بدل دیتا ہے۔ بادل تو دھرتی کا عکس ہیں۔ ان میں انسانی فطرت جھلکتی ہے۔ یہ بھی باہر کے آدمی کی طرح اندر سے کچھ، باہر سے کچھ، جیسے انسان کے دل میں کچھ ہوتا ہے، دماغ میں کچھ، منہ پر کچھ، پیٹھ پر کچھ، حلق میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ خیال کی طرح بادل میں بھی سرے سے کوئی ترتیب ہی نہیں ہوتی۔ دراصل بادل بھی انسان کی طرح باطنی ترتیب سے آراستہ و پیراستہ ہیں اسی لیے ظاہر میں ان کا

حسن بھی چکا چوند کرتا رہتا ہے۔

جب بھی ہوائی جہاز سے اس جہانِ گزراں کے مشاہدے کا موقع ملا تو یہ سجے سجائے شاد و آباد شہر، بستیاں، سنسان میدان، ویران ریگستان، آسمان سے باتیں کرتے سلسلۂ کوہ، چوڑے چکلے دریا اور بے کراں سمندر عجب بے ہنگم نظر آئے۔ گویا ماقبل تاریخ کے زندہ عجائب گھر یا برٹش میوزیم کا نظارہ کر رہے ہوں۔ ٹیڑھی میڑھی لکیریں، اونچی اونچی قطاریں، لہریے دار روشنی کی زنجیریں جو اپنے حصار میں طلسمِ ہوش رُبا کی طرح شہروں اور آبادیوں کو لیے ہوتی ہیں۔ غار، کھڈ، ٹیلے؛ ہر شے ٹیڑھی میڑھی، آڑی ترچھی، دھیرے دھیرے غائب ہونے والی بھول بھلیّاں، رفتہ رفتہ جس کی ہر شے روشن اور تاریک دھبوں میں تبدیل ہو کر دھند میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

جب بھی گلوب کا نظارہ کرتا ہوں تو مجھے بیشتر ممالک کے چہرے مختلف جانوروں کے مماثل نظر آتے ہیں۔ براعظم مختلف بحرِ اعظموں سے اس طرح گھرے ہوئے ہیں جیسے کوئی عجیب الخلقت جانور درندوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہر براعظم یا بڑے ملک کے ساتھ اس کا دم چھلا بھی نظر آتا ہے جیسے بڑے آدمی کے ساتھ اس کا مصاحب۔ آسٹریلیا کے ساتھ نیوزی لینڈ، ہندوستان کے ساتھ لنکا، افریقہ کے ساتھ مڈگاسکر، یورپ کے ساتھ سسلی۔ کچھ ملک ماقبل تاریخ کے دیو پیکر جانوروں کی طرح بے ڈول لحیم و جسیم جیسے روس اور چین، کچھ گھریلو پالتو جانوروں کی طرح ننھے منے جیسے انگلستان یا جاپان۔ شاید اسی وجہ سے ہر ملک کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔

میرے خیال میں ترتیب جنت کی ہر شے میں ہوگی اسی لیے اس کی بہترین تعریف ہی فردوسِ نظر ہے۔ ترتیب تو آسمانی شے ہوئی، جیتے جی اس دنیا میں کوئی ترتیب ممکن نہیں۔ میں روزانہ جن کاموں کی فہرست بناتا ہوں، اس کی ایسی ترتیب ہوتی ہے کہ ڈرائنگ روم یا آراستہ و پیراستہ مکان کی طرح ہر چیز قرینے سے سجی سجائی لیکن گھر سے برآمد ہوتے ہی کاموں کی ترتیب تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتی ہے۔ اس بے ترتیبی کا دن بھر کا حاصل وہ ترتیب ہوتی ہے جو زندگی کرنے کے لیے ضروری ہے۔

بے ترتیبی زندگی میں ترتیب کا شعور عطا کرتی ہے۔ میں کتنے لوگوں کو روزانہ حواس باختہ دیکھتا ہوں۔ ان کی کوئی چوُل سیدھی نظر نہیں آتی لیکن جب ان کے گھر جائیے تو حیرت میں پڑ جائیے کہ وہ کتنی باقاعدہ سجی سجائی، دھلی دھلائی، مکلّف اور ڈرائی کلین زندگی گزار رہے ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

* **ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔**

۱۔ مصنف کے مطابق بے ترتیب مناظرِ فطرت کا بیان اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ 'بے ترتیبی عین فطرت ہے۔' اس جملے کا مفہوم واضح کیجیے۔

۳۔ آسمانی بائیسکوپ سے دیکھے گئے مناظر بیان کیجیے۔

۴۔ مصنف نے ہوائی جہاز سے جو مشاہدہ کیا، اسے لکھیے۔

۵۔ گلوب کے نظارے تحریر کیجیے۔

۶۔ ترتیب سے متعلق مصنف کی رائے کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۷۔ 'بے ترتیبی زندگی میں ترتیب کا شعور عطا کرتی ہے۔' اپنی رائے لکھیے۔

۴ صحافت کسے کہتے ہیں؟

سیّد اقبال قادری

پیشِ درس

صحافت ایک باوقار پیشہ ہے۔ اس میں حالاتِ حاضرہ سے متعلق خبریں تیار کر کے اخبارات میں شائع کی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے اخبارات کے علاوہ دوسرے ذرائع ابلاغ خصوصاً ریڈیو، ٹیلی وژن اور انٹرنیٹ کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ صحافت اکثر ملکوں میں آزادانہ طور پر اور بعض میں حکومت کی پابندیوں کے ساتھ خدمات انجام دیتی ہے۔ صحافت مقامی، ملکی اور عالمی پیمانے کی سرگرمیوں سے عوام کو واقف کراتی ہے۔ جمہوریت میں یہ عوامی مسائل اور لوگوں کی آرا کو حکومت تک پہنچاتی ہے اس لیے اسے جمہوریت کے چوتھے ستون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

صحافت کا براہِ راست تعلق عوام سے ہوتا ہے اس لیے اسے عوامی بیداری کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مختلف ملکوں میں صحافت نے حکمرانوں کے ظلم وستم سے لوگوں کو آگاہ کر کے ان میں بیداری پیدا کی اور انقلاب برپا کیا۔ ہمارے ملک میں بھی صحافت نے جنگِ آزادی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولوی محمد باقر، ظفرعلی خاں، محمد علی جوہرؔ، بال گنگادھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے وغیرہ آزادی کے مجاہدین نے اپنے اخبارات کے ذریعے عوام کو انگریزوں کے مظالم سے آگاہ کیا اور انھیں آزادی کی جدوجہد کے لیے بیدار کیا۔

موجودہ زمانے میں ترسیل وابلاغ کی ترقی کے سبب صحافت کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اخبارات، رسائل اور ٹیلی وژن کے ذریعے ملکی اور غیر ملکی خبریں بہت کم وقت میں عوام تک پہنچ جاتی ہیں۔ صحافت کا کام صرف خبروں کی ترسیل ہی نہیں بلکہ ان کے پس پردہ عوامل کا تجزیہ کر کے عوام کو حقیقت سے آگاہ کرنا بھی ہے۔ اخبار کے ترسیلی اجزا مثلاً اداریے، کالم اور تجزیاتی مضامین اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جان پہچان

سیّد اقبال قادری ۵؍مئی ۱۹۳۵ء کو بنگلور میں پیدا ہوئے۔ ایم.اے اور بی.ایڈ کے علاوہ صحافت سے متعلق مختلف اسناد حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ایک آزاد صحافی کے طور پر اپنی خدمات انجام دیں۔ سیّد اقبال قادری اُردو، کنڑ اور انگریزی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے تدریس کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ سیّد اقبال قادری کو شعبۂ صحافت میں قابلِ قدر خدمات کے لیے قومی اور بین الاقوامی انعامات سے نوازا گیا۔ صحافت سے متعلق ان کی تصنیف 'رہبرِ اخبار نویسی' منظرِ عام پر آچکی ہے۔

صحافت ایک معزّز پیشہ ہے۔ اخبار نویسی، صحیفہ نگاری یا جرنلزم کے دیگر ناموں سے بھی یہ معروف ہے۔ صحافت پیشہ فرد صحافی، اخبار نویس یا جرنلسٹ کہلاتا ہے۔ صحافت ایک ذمے دارانہ پیشہ ہے جس میں دماغی صلاحیتوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ اخلاقی جرأت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ مشقت اور بھرپور توجہ کا طالب ہے۔ یہ فن صرف کتابوں کے صفحات سے نہیں سیکھا جاسکتا۔ اس فن میں مہارت کسی کلاس روم کی چار دیواری میں بیٹھ کر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ صحافت میں مرتبہ حاصل کرنے کے لیے تجربات کی بھٹی میں جلنا پڑتا ہے۔

فنِ صحافت کی ایک عمدہ کتاب 'ایکسپلورنگ جرنلزم' کے امریکی مصنّفین نے صحافت کی مختصر مگر جامع تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ''وسائلِ ابلاغ کے ذریعے، عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کے فریضے کو صحافت کہتے ہیں۔'' یہ کسی بھی مستقل طور پر جاری ہونے والے اخبار کے لیے صحیفہ نگاری میں مصروف رہنے کا اجتماعی نام ہے۔ رسائل کے لیے

باقاعدہ ملازمت کرنے والے بھی اپنے آپ کو صحافی کہتے ہیں۔

صحافت کی ابتدا چھوٹی موٹی کتابوں کی اشاعت سے ہوئی جنھیں عرفِ عام میں کتابچہ یا پمفلٹ کہا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں جرنلسٹ پمفلٹئر (pamphleteer) یعنی 'پمفلٹ نگار' تھا۔ پمفلٹ نگاری میں کتابچوں کے ذریعے نئی باتیں عوام تک پہنچائی جاتی تھیں۔ کسی بھی مسئلے پر رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپ کر فروخت کی جاتیں۔ پڑھے لکھے عوام اور خواص ان مطبوعہ کتابوں یا کتابچوں کو خرید کر پڑھتے اور تازہ تفصیلات سے متعارف ہوتے تھے۔ عموماً ایسے کتابچے دینی معاملات کی حمایت میں یک طرفہ ہوا کرتے تھے۔ جب خبروں کی اشاعت عام ہونے لگی تو یہ ضروری ہوگیا کہ جو بھی خبر چھاپی جائے، پوری دیانت داری کے ساتھ چھاپی جائے۔ یہ تعصب یا جانب داری سے پاک ہو اور جب کسی بحث طلب معاملے پر روشنی ڈالنے کی ضرورت پڑے تو یہ ناگزیر ہو تاکہ متنازع معاملے کے دونوں رُخ قارئین کے سامنے پیش کیے جاسکیں۔ اس لحاظ سے اخبارات غیر متعصب اور زیادہ بامقصد ثابت ہوا کرتے تھے۔ مدیر کی رائے خبر کی تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ ایک علیحدہ اور مخصوص جگہ شائع کی جاتی تھی۔ اس تحریر کو 'اداریہ' یعنی ایڈیٹوریل کا نام دیا گیا ہے۔ تمام حقائق اداریے میں ضروری توضیح اور اپنی رائے کے ساتھ مناسب و معقول الفاظ میں پیش کرنا مدیر کی اہم اور مقدس ذمے داری قرار دی گئی۔ قارئین کو بھی موقع فراہم کیا گیا کہ کسی بھی مسئلے پر وہ مدیر کی موافقت یا مخالفت کا رویہ پہچان کر اپنی رائے قائم کریں۔ مشہور سیاسی جماعتوں کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے کثیر الاشاعت اخبارات بھی یہی رویہ اختیار کرتے ہیں کہ جو بھی خبر ہوتی ہے وہ جوں کی توں شائع کردی جاتی ہے مگر اداریے کے ذریعے عوامی رائے پر اثر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

صحافت کی صحیح خدمت صرف خبروں کو جمع کر کے شائع کردینے کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی، اس کی کئی اہم ذمہ داریاں ہیں۔ صحافت کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ عوام شائع شدہ خبروں کی صداقت کو پوری طرح قبول کریں۔ اس کے لیے صحافی کا فرض ہے کہ وہ صرف حقائق پر مبنی خبروں کی اشاعت کرے۔ دلچسپی بڑھانے کے لیے خبروں کی صداقت میں خرد برد غیر اخلاقی فعل ہے۔ وہ سرکاری فیصلوں تک کو شک کی نظر سے دیکھے۔ اگر وہ ہر سرکاری فیصلے کو معتقدانہ نظر سے دیکھنے لگ جائے تو وہ حکومت کا طرف دار سمجھا جائے گا۔ جمہوری نظام میں ایسے صحافیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہر چیز کی جائز تعریف و توصیف کی جائے مگر عوامی بہبود کا خیال بالاتر رکھتے ہوئے تنقید سے اپنی بیداری کا ثبوت دینا جمہوری صحافی کا جائز رویہ سمجھا جاتا ہے۔ اس اُصول کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہر معاملے میں حکومت کی نکتہ چینی کی جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جمہوریت میں اخبارات کا ہمیشہ بیدار رہنا، سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنا اور مسائل کو گہرائی سے جانچنا ایک اچھے صحافی کی اہم ذمے داری ہے۔

اخبارات عوامی تحریکات کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ حق پر مبنی اور انصاف پسند مہم کا ساتھ دیتے ہیں۔ رشوت ستانی، غبن اور جعل سازی کے واقعات کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ رشوت خور، اقربا پرور اور بدنیت سیاست دانوں کے ہتھکنڈوں کا راز صحافی عوام کے روبرو لاتے ہیں۔ ظالم یا غیر مقبول سرکاری افسران کی غلط کاریوں کی تفصیلات اخبارات کے صفحات پر نمایاں کی جاسکتی ہیں۔

اخبارات کے ذریعے تجارت، صنعت و حرفت اور دیگر فائدہ مند مصروفیات کا فروغ ممکن ہے۔ اشتہارات کے ذریعے اخبارات نئی مصنوعات کا تعارف کراتے ہیں۔ فی زمانہ اشتہارات اخبارات کی ریڑھ کی ہڈی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اخبارات علم اور

تفریح دونوں فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں۔

سائنس، طب، حفظانِ صحت، خانہ داری، نجوم اور دیگر کئی موضوعات پر معلوماتی فیچر اخبارات میں شائع کیے جاتے ہیں۔ ہفت وار ایڈیشن کے ذریعے خاندان کے تقریباً سبھی افراد کے لیے مضامین اور تفریحی مواد کی اشاعت بھی اخبارات کی بڑی خصوصیت ہے۔ اخبارات نے حکومتیں قائم کی ہیں۔ کئی حکومتوں کو استحکام بخشا ہے اور کئی حکومتوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا ہے۔ مشہور فاتح نپولین بوناپارٹ کو اخبارات کی طاقت کا صحیح علم تھا۔ اس کا قول تھا کہ تین مخالف اخبار ایک ہزار بندوقوں سے بھی زیادہ خوف ناک ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی حالیہ تاریخ میں گوپال کرشن گوکھلے کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جنھوں نے اپنے اخبار کی آواز کو کافی مضبوط بنا لیا تھا۔ لوک مانیہ تلک کے اخبارات 'کیسری' اور 'مراٹھا' سے انگریز حاکم ہمیشہ لرزاں رہا کرتے تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے اخبار 'الہلال' کی تحریروں کا اثر دیکھ کر فرنگی کانپ جاتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے حصول میں اخبارات کا تاریخی کردار رہا ہے۔

لندن کے تقریباً ایک درجن ناشروں نے ۱۶۲۲ء میں ایک انجمن قائم کی اور اہتمام کیا کہ ایک دوسرے کو خبریں تبادلے میں بہم پہنچائی جائیں۔ اس طرح ہر ناشر کو زیادہ سے زیادہ خبریں مہیا ہونے لگیں اور وہ اپنے پمفلٹ ہر ہفتے شائع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ شروع شروع میں ایسے غیر مجلد رسالوں میں غیر ملکی خبروں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ پھر مقامی اور سیاسی تفصیلات بھی ان میں جگہ پانے لگیں۔ خواص کے علاوہ عوام بھی ان تفصیلات کو جاننے میں خاصی دلچسپی لیتے۔ اس طرح پمفلٹوں کی فروخت میں مسلسل اضافہ ہونے لگا۔ ایسے پمفلٹوں کی روز افزوں مقبولیت نے گویا اخبار نویسی کے لیے راہ ہموار کی۔

اس زمانے کے حکمراں صحافت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ناخوش تھے۔ وہ آزادانہ رائے کا اظہار کرنے والے اخبارات کی بے باکی سے نالاں تھے۔ چنانچہ اخبارات کے مدیروں کو اعلانیہ رشوت دی جانے لگی۔ جو اخبار نویس رشوت لینے سے انکار کرتے انھیں طرح طرح سے ستایا جاتا بلکہ قید خانوں میں ڈال کر انھیں سخت سزائیں دی جاتیں۔ کسی ملک میں یہ قانون رائج کر دیا گیا کہ لائسنس حاصل کیے بغیر کوئی اخبار شائع نہیں کرسکتا۔ جہاں آمرانہ حکومتیں قائم نہ تھیں، وہاں بھی حکمراں طبقے کا یہ خیال تھا کہ سرکاری معاملات میں صرف چند تعلیم یافتہ افراد یا دانشور دلچسپی لیں اور عام آدمی کا ہر معاملے سے واقف رہنا چنداں ضروری نہیں۔ اخبارات کی پہنچ صرف چند افراد تک محدود کرنے کی غرض سے اخبارات پر بھاری ٹیکس لگایا گیا تاکہ گرانی کی وجہ سے عام آدمی اخبار خرید نہ سکے۔ ایسے وقت میں ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کی ایجاد سے خبریں زیادہ تیز رفتاری سے اخبارات کے دفتروں میں آنے لگیں۔ چھپائی کی مشینیں بھی عام ہوئیں۔ ان کے کام کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی۔ ریلوے کے آجانے سے اخبارات جو اکثر و بیشتر بڑے شہروں تک محدود رہ جایا کرتے تھے، اب چھوٹے چھوٹے شہروں بلکہ قصبوں میں پہنچنے لگے۔ یورپ اور امریکہ میں اشتہارات کو بہت فروغ حاصل ہوا جس کی وجہ سے اخبارات کو کافی آمدنی ہونے لگی۔ چونکہ اخباروں کی تعدادِ اشاعت بہت زیادہ بڑھنے لگی تھی، ان کی لاگت میں بھی کمی آتی گئی۔ وہ اتنے ارزاں ہوگئے کہ معمولی مزدور یا کلرک بھی اخبار خریدنے کے قابل ہوگیا۔

ہندوستان میں طباعت کا کام سب سے پہلے پرتگالی مسیحی مبلغوں نے شروع کیا۔ ۱۵۵۷ء میں انھوں نے گوا میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع کی جس میں مسیحی تبلیغی کام کرنے والوں کے لیے سوال و جواب کی صورت میں عیسائی مذہب کی اہم معلومات درج تھی۔ جب ۱۸۱۱ء میں بھاپ کے انجن کی ایجاد ہوئی تو چھپائی کی مشین بھی بھاپ کی مدد سے چلائی جانے لگی اور فی گھنٹا ایک ہزار

اوراق کی رفتار سے چھپائی ممکن ہوئی۔ آج کل ایسی تیز رفتار مشینیں اخبارات کے دفتروں میں نصب ہیں جو فی گھنٹا دس ہزار اور اس سے بھی زیادہ تعداد میں اخبار چھاپ دیتی ہیں۔

ہندوستان کا پہلا اخبار کلکتہ سے ۲۹ر جنوری ۱۷۸۰ء کو شائع ہوا۔ 'ہکیز بنگال گزٹ' (Hicky's Bengal Gazette) اس ہفت روزہ اخبار کا نام تھا۔ اس کا مدیر، طابع، ناشر اور مالک جیمس آگسٹس ہکی تھا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے طابع کی حیثیت سے وابستہ تھا۔ اس انگریزی اخبار کے صرف دو ورق تھے جس میں کئی اشتہارات شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار ابتدا ہی سے حکومت مخالف رہا۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز پر کئی اہانت آمیز جملے اس اخبار میں مسلسل شائع ہوئے تھے۔ ہکی کو حکومت کی طرف سے بہت ستایا گیا مگر اس نے اپنی حق گوئی اور بے باکی کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر کار حکومت نے اس اخبار کو بند کرا دیا۔

کلکتہ کے بعد مدراس سے اخبارات شائع ہوئے اور بعد میں ممبئی سے اخبارات نکلنے لگے۔ ابتدائی اخبارات غیر ملکی باشندوں نے انگریزی زبان میں شائع کیے۔ گنگادھر بھٹاچاریہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے انگریزی زبان میں ایک اخبار 'بنگال گزٹ' کے نام سے جاری کیا۔ مشہور مصلح راجا رام موہن رائے نے بھی 'مِراۃ الاخبار' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں اُردو اور ہندی اخبارات نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے ساتھ ہی عوام میں اخبارات سے زیادہ لگاؤ پیدا ہوگیا۔ لوگ جنگی خبروں میں گہری دلچسپی لینے لگے۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہ دلچسپی اور بڑھ گئی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں صحافت نے کافی ترقی کر لی ہے۔

آج دنیا بھر میں ہزاروں اخبارات روزانہ شائع ہوتے ہیں جن کی اشاعت کی مجموعی تعداد کروڑوں میں بتائی جاتی ہے۔ آج دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک نہیں ہے جہاں سے روزانہ اخبار شائع نہ ہوتا ہو۔

مشقی سرگرمیاں

*** ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔**

۱۔ صحافی کے لیے لازمی صفات لکھیے۔
۲۔ صحافت کی تعریف کی کسوٹی پر اُردو کے کسی اخبار کو پرکھیے۔
۳۔ اداریے کی خصوصیات بیان کیجیے۔
۴۔ صحافی کے فرائض بیان کیجیے۔
۵۔ اخبار نویسی کی راہ ہموار کرنے والے مراحل کو قلم بند کیجیے۔
۶۔ ہندوستان کے اوّلین صحافیوں کی خدمات کا تذکرہ کیجیے۔
۷۔ تیز رفتار چھپائی کا سبب اور اس کے فائدے بیان کیجیے۔

*** ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔**

۱۔ صحافت اور صحافی کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
۲۔ صحافت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ناخوش حکمراں طبقے کی زیادتیوں کے بارے میں لکھیے۔
۳۔ اخبارات علم اور تفریح دونوں فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ مثالوں سے واضح کیجیے۔

۴۔ ’’تین مخالف اخبار ایک ہزار بندوقوں سے بھی زیادہ خوف ناک ہوتے ہیں۔‘‘ نپولین بوناپارٹ کے اس قول کے بارے میں اپنی رائے تحریر کیجیے۔

۵۔ ’’دلچسپی بڑھانے کے لیے خبروں کی صداقت میں خرد برد غیر اخلاقی فعل ہے۔‘‘ اس بیان کی موافقت/ مخالفت میں اپنی رائے تحریر کیجیے۔

۶۔ ’’جمہوریت میں اخبارات کا ہمیشہ بیدار رہنا، سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنا اور مسائل کو گہرائی سے جانچنا جدید صحافی کی اہم ذمے داری ہے۔‘‘ اس بیان کے بارے میں اپنی رائے لکھیے۔

۷۔ ’فی زمانہ اشتہارات اخبارات کی ریڑھ کی ہڈی تسلیم کیے جاتے ہیں۔‘ اس بیان کی وضاحت اپنے الفاظ میں کیجیے۔

* **ہدایت کے مطابق قواعدی سرگرمی مکمل کیجیے۔**

۱۔ اخبارات عوامی تحریکات کی حمایت کرتے ہیں۔
(جملے کو طورِ مجہول میں تبدیل کیجیے)

۲۔ یہ فن صرف کتابوں سے نہیں سیکھا جا سکتا۔
(مثبت جملے میں تبدیل کیجیے)

۳۔ مشہور فاتح نپولین بوناپارٹ کا قول تھا کہ تین مخالف اخبار ایک ہزار بندوقوں سے بھی زیادہ خوف ناک ہوتے ہیں۔
(جملے کی ساخت پہچانیے۔ جملے کا نحوی تجزیہ کیجیے)

سرگرمی/ منصوبہ

مختلف ملکی، بین الاقوامی، مقامی، سیاسی، سماجی، تعلیمی وغیرہ خبروں اور مکالموں کے تراشوں پر مشتمل ایک مکمل اختیار تیار کیجیے۔

۵

اُردو کا ضبط شدہ ادب

ظ۔ انصاری

جان پہچان

ظ۔ انصاری کا اصل نام ظل حسنین نقوی تھا۔ وہ ۶ رفروری ۱۹۲۵ء کو سہارن پور میں پیدا ہوئے تھے۔ گھریلو تعلیم کے بعد انھوں نے میرٹھ کے مُجیبیہ کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مختلف اخبارات میں جن میں 'انصاری نامہ، قومی جنگ' اور 'روز نامہ انقلاب' شامل ہیں، خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ماہنامہ 'شاہراہ' اور ہفتہ وار 'آئینہ' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ظ. انصاری نے روس میں رہ کر متعدد کتابوں کے ترجمے کیے۔ ممبئی یونیورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر بھی رہے۔ ان کی تصانیف میں 'کتاب شناسی، غالب شناسی، اقبال کی تلاش، خسروؔ کا ذہنی ارتقا' اہم ہیں۔ 'کانٹوں کی زبان' ان کے اداریوں کا مجموعہ ہے۔ درج ذیل اداریہ اسی کتاب سے لیا گیا ہے جو ۲۹ر مارچ ۱۹۸۶ء کو اخبار 'انقلاب' ممبئی میں شائع ہوا تھا۔ ظ۔ انصاری اہم ترقی پسند ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ۳۱ رجنوری ۱۹۹۱ء کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔

دو دن پہلے ہمیں بمبئی دوردرشن (ٹی وی) کے ایک پروگرام میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ عنوان تھا 'اُردو کی ضبط شدہ نظمیں'۔ اب تک کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں آزادی کے اس ادب کا انتخاب کیا گیا ہے جو آزادی کی لڑائی کے دوران لکھا اور چھاپا گیا تھا۔ کوئی ۳۵ر برس پہلے مرحوم رسالے 'نیا ادب' نے ایک خاص نمبر اسی موضوع پر نکالا تھا۔ چند سال ہوئے کہ دو جلدوں میں 'ہندوستاں ہمارا' کے عنوان سے مرحوم جاں نثار اخترؔ نے قومی روح رکھنے والا ادب یکجا کیا۔ حال میں علی جوادؔ زیدی نے 'ضبط شدہ نظمیں' کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا جو اُردو ہندی دونوں رسم خط میں لکھنؤ سے چھپا ہے۔

ان سب کتابوں میں وہی ادب شامل ہے جو کتابوں اور رسالوں میں بکھرا پڑا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ ادب ہے جو اخباروں میں، اشتہاروں میں اور سینہ بہ سینہ گلیوں، محفلوں اور بازاروں میں پھیلا اور کتابوں تک نہ پہنچ سکا۔ اس میں ایسی تحریریں بھی تھیں جن کے مصنف گمنام جیے اور بے نام سِدھارے۔ ایسے بھی تھے جنھیں لکھنا اور اپنا نام پھیلانا نہیں آتا تھا مگر سینے میں آزادی کی جوالا دہک رہی تھی۔ کچّی پکّی شاعری کر لیتے تھے، سنا کر جی ہلکا کر لیتے تھے۔ لوگ محبت سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے، گاتے اور چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے تھے۔

ظفر علی خاں، شورشؔ کاشمیری، چراغ حسن حسرتؔ، محمد دین تاثیرؔ، مخدومؔ محی الدین، سجاد ظہیر، رشید جہاں، سرشارؔ سیلانی جیسے نامور لوگ دنیا سے اُٹھ گئے جن کی اکثر تحریریں روز نامہ اور ہفتہ وار اخباروں کے ذریعے لاکھوں پڑھنے والوں تک پہنچیں۔ ان اہلِ قلم کی تحریروں کا بھی کافی حصہ وقتی اور ہنگامی ادب کے فائل میں دھرا رہ گیا۔ ان کے علاوہ مولانا امداد صابری اور خان غازی کابلی جیسے درجنوں ایسے جاں باز گزرے ہیں جنھیں اپنی تحریروں کو مانجھنے کا بھی وقت نہیں ملا اور ہنگامی ادب کی فہرست تک میں ان کے نام نہیں ملتے۔ جب کوئی قوم، انسانوں کا کوئی گروہ سیاسی، سماجی یا تہذیبی بندھن توڑنے کے لیے اُٹھتا ہے تو ادب سے اس کا دوگونہ رشتہ بن جاتا ہے۔ ایک یہ کہ ادب اگلی منزل کی نشاندہی کرے، تشویق کرے، بہتر قدروں کا مشتاق بنائے اور وقت سے دو قدم آگے چلے۔ دوسرے یہ کہ وقت کی ترجمانی کرے، آواز میں آواز ملائے اور اس کے نقشِ قدم اپنے ورقوں پر محفوظ کر لے۔

دونوں قسم کی تحریریں، تصنیفیں اپنے وقت پر غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ وقت گزرنے کے بعد اگر ان میں کوئی فنی خوبی ہو تو زندہ رہ جاتی ہیں ورنہ پرانی یادوں کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہیں۔ یہ صرف ہندوستان میں نہیں، سبھی ملکوں میں ہوا ہے، سبھی زبانوں کے ساتھ یہ بیتی ہے۔

جس دن ہندوستان میں اُردو پریس نے جنم لیا، اسی دن سے ضبطی کے سرکاری نوٹس کے درشن بھی کیے۔ اب اُردو اخبار نویسی کی عمر ڈیڑھ سو سال سے اوپر ہو گئی اور کم از کم اتنی ہی تعداد اُن لکھنے والوں کی ہے جو قبل از اشاعت سنسرشپ، زرِ ضمانت کی ضبطی، اخبار، کتاب، نظم یا مضمون کی سرکاری ضبطی سے گزرے اور گزرتے رہے۔ لکھنؤ، لاہور، کلکتہ اور بمبئی ترتیب وار ان ضبطیوں کے مرکز رہے ہیں۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کا مشہور شعر ہے ؎

هم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

'ضبطی' کا قافیہ 'خبطی' محض اتفاقی نہیں، یہ اکبرؔ کے زمانے میں زباں زدِ خاص و عام تھا۔ سرکاری ملازم اور خوش حال زمینداروں کا جو کوئی ذہین اور پرجوش بیٹا آزادی کی ہنگامہ خیز تحریک میں کود پڑتا یا انقلابیوں کی صحبت میں پڑ جاتا، اُسے 'خبطی' کا خطاب ملتا تھا اور یہ کہہ کر چڑایا جاتا تھا کہ وہ 'ضبطی' کی راہ پر لگ گیا ہے۔

کسی تصنیف، نظم، نثر یا تحریر کا بحقِ سرکار ضبط ہو جانا ایک فریق کے لیے عزت کی اور باقی دو کے لیے اذیت کی بات تھی۔ مصنف تو نام کماتا، ایڈیٹر اور پرنٹر پبلشر مالی نقصان اُٹھاتے۔ بعض اوقات ایڈیٹر اور مصنف دونوں ایک ہی شخصیت ہوتی تھی جیسے منشی پریم چند، ظفر علی خاں، مہاشے کرشن، آغا شورش، حسرتؔ موہانی، سیّد جالب، عبدالرزّاق ملیح آبادی، دیوان سنگھ مفتونؔ اور بمبئی کے حافظ علی بہادر خاں۔ اس صورت میں یا تو وہ کسی نوعمر اور نومشق کو 'قربان گاہ' کے لیے نامزد کر دیتے۔ یوں نامزد ہونا بھی عزت کی بات تھی۔ بعض ایڈیٹر ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے ضبطی کا وار سینے پر لیا اور مصنف کو اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا۔

۱۹۰۸ء میں مولانا حسرتؔ موہانی نے 'اُردوئے معلیٰ' رسالے میں ایک طویل مضمون چھاپا: 'مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'۔ حکومت یوپی نے ان سے سوال جواب کیا۔ مولانا نے مصنف کا نام نہ بتایا۔ حکومتِ ہند سے آرڈر آیا کہ مضمون نہایت قابلِ اعتراض ہے۔ ایڈیٹر کو سزا دی جائے۔ مولانا نے جیل کاٹی۔ ان کا رسالہ بند ہوا۔ پریس کو تالا لگ گیا، کتابیں چھکڑے میں بھر کر ردی کے بھاؤ نیلام کر دی گئیں اور مولانا 'خبطی خالہ' کے لقب سے سارے علی گڑھ میں مشہور ہو گئے۔ آج مولانا حسرتؔ کی تحریروں کا اچھا خاصا سرمایہ پائندہ ادب کے سرمایے میں گنا جاتا ہے۔

یہ ضبطیاں انگریزی راج کے زمانے میں عام طور سے ان تحریروں کی ہوا کرتی تھیں جن سے بوئے بغاوت آتی ہو۔ ان میں ادبی معیار یا مصنف کے وقار کا کوئی سوال نہ تھا لیکن 'ضبطی' کی ایک اور قسم بھی ۱۹۲۲ء کے بعد منظر پر اُبھری۔

گاندھی جی نے جب چورا چوری کے حادثے کے بعد جس میں پولس والے سمیت ایک تھانہ جلا دیا گیا تھا، قومی آزادی کی اُبلتی ہوئی دیگ پر ڈھکنا رکھ دیا، تحریک اچانک بند کر دی تو خون کی حدت میں فساد کے سلسلے کی شروعات ہوئی اور فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی کی تحریریں پے در پے چھپنے لگیں۔ قومی درد کے بیمار چیختے تھے کہ یہ خرافات بند کی جائے۔ کونسل بیٹھتی تھی اور دو چار ہفتے بعد اشتعال

پھیلا چکنے کے بعد سرکاری عہدے دار اسے ضبط کر لیتے تھے۔ ضبطی کا اعلان ہوتے ہی اس تحریر کی مانگ اور بڑھ جاتی تھی اور یوں ضبطی بھی بعض انگارے کھانے، آگ اُگلنے والوں کی تجارتی غرض کے لیے کارآمد ثابت ہوتی تھی۔

افسوس کہ ضبط شدہ تحریروں کا یہ سیاہ سلسلہ پھر رواں ہوا ہے۔ جس قومی آزادی کی بھٹی میں ایندھن ڈالنے کے لیے آزادی پسند اہلِ قلم نے اپنی ہڈیاں جلائیں، اپنی کتابیں جلوائیں، اپنا گھر بار پھونکا، آج اسی آزادی کی جلوہ افروزی کے کوئی پچاس برس بعد بار بار ایسی تحریروں کی ضبطی کی مانگ اُٹھتی ہے جو تحریریں دل آزاری اور فرقہ وارانہ توہین بلکہ گالم گلوج کی غرض سے کاغذ کا منہ دیکھتی ہیں۔

کلکتے میں ایک صاحب نے 'اسلام کا مردہ ہاتھ' نامی مضمون شائع کر دیا۔ اس کی نقلیں ہزاروں کی تعداد میں مفت بانٹی گئیں۔ اِدھر اُدھر سے روز ایسی خبریں آتی ہیں۔ ان خبروں سے بعض کم سمجھ لوگ اشتعال میں آجاتے ہیں اور یوں دریدہ دہن اور بدنیت مصنفوں کی کاری گری کا اوزار بن جاتے ہیں۔

'اِسے روکو، اُسے ضبط کرو' کی صدا بلند نہ کی جائے تو اِن سستے پٹاخوں کو کوئی پوچھے بھی نہیں۔ یہ پٹاخے، غیر ادبی، غیر علمی اور نامہذب تحریروں کے ردّی پلندے سرِ بازار چھوڑے ہی جاتے ہیں اشتعال دلانے کی نیت سے۔ ان سے مشتعل ہو جانا بجائے خود نادانی اور کوتاہ اندیشی ہے۔ کس منہ سے کہیں کہ ہماری زبان کے اخبار اور ہماری برادری کے شہرت پسند بھائی ان اشتعال انگیزیوں کا شکار ہونے میں اوروں سے زیادہ جلد باز نکلتے ہیں۔ ہمیں تو زیادہ محتاط ہونا چاہیے تھا۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ ضبط کی گئیں کتابوں میں جس قسم کا ادب شامل تھا، اس کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ ہنگامی ادب لکھنے والوں سے متعلق معلومات دیجیے۔

۳۔ سماجی اضطراب اور بغاوت سے ادب کا تعلق بیان کیجیے۔

۴۔ تحریروں کی اہمیت حاصل کرنے کی وجہ اور اس کے اثرات کا تذکرہ کیجیے۔

۵۔ اشتعال انگیز تحریروں کے نقصانات واضح کیجیے۔

۶۔ مولانا حسرتؔ موہانی کے 'خبطی خالہ' کے لقب سے مشہور ہونے کا واقعہ لکھیے۔

۷۔ ظ۔ انصاری کے اداریوں کے پیشِ نظر صحافت میں اداریے کی اہمیت واضح کیجیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ ''اِسے روکو، اُسے ضبط کرو'' کی صدا بلند نہ کی جائے تو ان سستے پٹاخوں کو کوئی پوچھے بھی نہیں۔ اداریے کے اس جملے کی روشنی میں غیر ضروری خبروں اور باتوں کی تشہیر سے متعلق اپنی رائے لکھیے۔

۲۔ اُردو زبان کے اخبار اور شہرت پسند بھائی اشتعال انگیزیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ظ۔ انصاری کے اس بیان کی روشنی میں اخباری خبروں کا تجزیہ کیجیے۔

سرگرمی / منصوبہ

۱۔ کوئی تین اخباروں سے اداریے نقل کیجیے اور ہر اداریے سے متعلق اپنی ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

۲۔ کسی ایک روزنامے کے مختلف کالموں کا البم تیار کیجیے اور ہر کالم پر تبصرہ لکھیے۔

٦ کہانیاں رہیں نہ کردار

شاہد لطیف

جان پہچان

شاہد لطیف شیخ ۲/ مارچ ۱۹۵۹ء کو بھساول، ضلع جلگاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بہادر شاہ ظفر اُردو ہائی اسکول، بھساول سے مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انھوں نے ممبئی کا رُخ کیا اور نیشنل کالج، باندرہ سے بی کام کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے والد سیفؔ بھساولی معروف شاعر تھے لہٰذا مشاعروں اور شعرا کی ضیافت کے ماحول نے شاہد لطیف کی عمدہ ذہنی تربیت کی اور انھیں ادب کا شعور بخشا۔ ۱۹۸۹ء میں وہ روزنامہ 'انقلاب' سے جونیئر سب ایڈیٹر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے اور سینئر سب ایڈیٹر اور فیچر ایڈیٹر کے عہدوں تک ترقی حاصل کی۔ ۲۰۰۴ء میں انھیں ادارت کی ذمے داری سونپی گئی جو تا حال جاری ہے۔ صحافت کے سلسلے میں انھوں نے امریکہ، برطانیہ، عمان، قطر، روس، سعودی عرب، ملیشیا، جاپان اور ویتنام کے سفر بھی کیے ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'جہات' شائع ہو چکا ہے۔

"کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔"...

"کسی گاؤں میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔"...

"کسی جنگل میں ایک لومڑی تھی جس کی چالاکی دور دور تک مشہور تھی۔"...

"پرانے زمانے میں ایک چغل خور وزیر تھا۔"...وغیرہ

زمانۂ قدیم سے لے کر چند دہائی پہلے تک، گھروں کے بچے ایسی کہانیاں سنتے سنتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچتے اور پھر دوسرے دن موقع پا کر دریافت کرتے تھے کہ "پھر اس بادشاہ کا، اُس لومڑی کا، اُس وزیر کا اور اُس بڑھیا کا کیا انجام ہوا؟" حقیقت یہ ہے کہ کہانیاں بچوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالتی تھیں اس لیے کہانیاں لکھی گئیں، کہانیاں پڑھی گئیں، کہانیاں سنائی گئیں؛ کہانیوں نے سینہ بہ سینہ سفر کیا، کہانیاں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئیں؛ کہانیاں فلم کے قالب میں ڈھلیں اور کہانیاں مختلف کرداروں کے ذریعے اسٹیج پر بیان کی گئیں۔ کہانیوں کی غیر معمولی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتیں مگر حقیقت سے عاری بھی نہیں ہوتیں۔ ان سے ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کہانیوں ہی نے کتنوں کو بہادر بنایا، کتنوں کو ایمان داری سکھائی، کتنوں میں عدل و انصاف کا مادّہ پیدا کیا، کتنوں کی قوتِ تخیل میں اضافہ کیا اور کتنوں کی شخصیت میں وہ اوصاف پیدا کیے جن کا ایک زمانہ معترف ہوا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ دنیاداری میں مبتلا ہونے کے بعد کہانیوں اور اُن کی طاقت کو بھول گئے ہیں۔ ٹی وی سیریلوں کی 'ساس بہو' کے جھگڑوں میں اُلجھ گئے ہیں۔ بہت کم لوگ ہوں گے جنھیں وہ کسان یاد ہوگا جس کے سات بیٹے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ جنھیں کسان نے سات لکڑیوں کا گٹھا توڑنے کے لیے کہا تھا۔ اتحاد کی ضرورت کل سے زیادہ آج ہے مگر وہ کہانی جو اتحاد کا سبق دیتی تھی، بھلا دی گئی ہے۔ یاد رہتی تو ممکن تھا کہ اتحاد عنقا نہ ہو جاتا۔

مرکزی دھارے میں رہنے کی ضرورت برسوں کے تغافل کے بعد آج زیادہ محسوس کی جا رہی ہے کیونکہ لوگ باگ وہ کہانی بھول گئے ہیں جس میں مرغی کے بچے ساتھ ساتھ رہتے تھے سوائے ایک بچے کے جسے چیل اُٹھا کر لے گئی تھی۔ ہمیں تو وہ دفینے بھی یاد

نہیں جن میں سیکڑوں اشرفیاں ہوتی تھیں۔ ایک کہانی میں بتایا گیا تھا کہ دفینے کی تلاش میں بہتوں نے اپنا وقت گنوایا مگر وہ اُس فقیر کے ہاتھ لگا جس نے کبھی ایک اشرفی کی بھی تمنا نہیں کی تھی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مَیں آج یہ کون سا موضوع لے کر بیٹھ گیا۔ آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں اس لیے کہ ہماری آپ کی زندگیوں میں کہانیوں کی جگہ نہیں رہ گئی ہے۔ نہ کہانیاں پڑھی جاتی ہیں نہ سنی جاتی ہیں، نہ ان سے استفادہ کیا جاتا ہے جبکہ بچپن میں سنی اور پڑھی جانے والی کہانیوں نے لوگوں کی زندگیاں بدلی ہیں اور انھیں مقصدِ حیات عطا کیا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کہانیاں وقت گزاری کا ذریعہ تھیں یا بچوں کو سلانے کے لیے سنائی جاتی تھیں، وہ غلط نہیں تھے مگر مشہور شخصیات کی سوانح پڑھ لیجیے، درجنوں مثالیں مل جائیں گی کہ ان پر بچپن کی کسی کہانی کا اثر سب سے زیادہ رہا۔ بچوں کی قوتِ متخیّلہ کو کیوں فراموش کیا جائے۔ ایک سند باد جہازی کا کردار کہانی سننے والے ہر بچے کے ذہن میں مختلف ہوتا تھا۔ ایک الہ دین کا کردار ہر بچے کو مختلف انداز میں متاثر کرتا تھا۔ آئیے، اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھیں۔

دو ایسے طالب علموں کو بلائیے جو ڈرائنگ میں اچھے ہوں۔ اُن سے کہیے کہ وہ الٰہ دین کی تصویر بنائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ دونوں کی بنائی ہوئی تصویریں ایک دوسرے سے بہت الگ ہیں۔ اب لوٹ کر آج کے ٹی وی زدہ دَور میں آیئے اور محسوس کیجیے کہ ایک ٹی وی سیریل الہٰ دین کا کردار ایک اداکار کے ذریعے پیش کر رہا ہے۔ اب اُنھی دو طلبہ سے کہیے الہٰ دین کی تصویر بنانے کے لیے۔ وہ دونوں ایک جیسی تصویر پیش کریں گے۔

اخلاقی اور تہذیبی قدروں کے علاوہ یہ بھی ایک نقصان ہے جسے محسوس کیا جانا چاہیے۔ آج کے دور میں اگر کہانیاں بچوں تک پہنچتی بھی ہیں تو وہ ایک اداکار میں ڈھل کر پہنچتی ہیں۔ بچوں کو سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کا موقع نہیں دیتیں۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ بچے اپنے تصور اور تخیل کے مطابق کسی کردار کو ڈھالیں، ان کے سامنے اداکار کے بھیس میں وہ کردار موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دَور کی سب سے مقبول کہانی جو اپنے مرکزی کردار کے حوالے سے پوری دنیا میں مشہور ہے، وہ ہیری پوٹر سیریز ہے۔ ملاحظہ کیجیے تصور و تخیل کا یہ نقصان، لاکھوں نہیں کروڑوں بچوں کے ذہن میں ہیری پوٹر کی ایک ہی تصویر ہے جبکہ کل تک ہزار بچوں کے ہزار ذہنوں میں ایک الگ الہ دین ہوتا تھا۔

تو صاحبو! کہانیوں کی اپنی اہمیت ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ آج کل شہر شہر، قریہ قریہ جو ماحول ہے کہ چوری، ڈکیتی، قتل و غارت گری اور ایسے ہی دیگر جرائم عام ہیں تو اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ بچپن میں جو ذہن بنتا ہے، وہ بن نہیں پا رہا ہے۔ وہ اس لیے نہیں بن پا رہا ہے کہ مذہب سے دوری ماحول میں رچ بس گئی ہے اور بچوں میں ایک عظیم کردار کی داغ بیل ڈالنے والی کہانیوں کو ہم نے خیر باد کہہ دیا ہے جن میں نصیحت ہوتی تھی، سبق ہوتا تھا، عبرت ہوتی تھی۔ اس طرح یہ کہانیاں اپنے دامن میں بہت طاقتور اصلاحی پہلو لیے ہوتی تھیں۔ اب آپ ان تمام جرائم سے خوف زدہ بھی ہیں اور ان سے جیسے تیسے لڑ بھی رہے ہیں مگر گھر کا ماحول اور درس گاہوں کا ماحول ٹھیک کرنے کی فکر کسی کو نہیں ہے۔ بیرونی ملکوں میں 'اسٹوری ٹیلنگ سیشن' ہوتے ہیں، ہم چاہیں تو قصے کہانیاں سننے سنانے کے لیے اپنے دیسی طرز کو دوبارہ زندگی عطا کر سکتے ہیں۔ دادی امّاں کا جیتا جاگتا کردار ایک بار پھر گھروں کے ماحول کو جگمگا سکتا ہے بہ شرطے کہ اس کی فکر کی جائے۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ کہانیاں بچوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالتی ہیں، اس حقیقت کے بارے میں مصنف کی رائے لکھیے۔
۲۔ کہانیوں کی خوبیاں اور فوائد بیان کیجیے۔
۳۔ ان کہانیوں کا تذکرہ کیجیے جنھیں لوگ بھول گئے ہیں۔
۴۔ لوگوں کی زندگیوں پر کہانیوں کے ذریعے مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیجیے۔
۵۔ بچوں کی قوتِ متخیّلہ کو کہانیوں کے ذریعے فروغ حاصل ہوا، اس بات کو ثابت کرنے کے لیے مصنف کے ذریعے پیش کی گئی مثال بیان کیجیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ کہانیوں کے تاثر کو دور تک پہنچانے کے جن طریقوں کو اپنایا گیا، انھیں تحریر کیجیے۔
۲۔ ''ہم نے کہانیوں کو بھلا دیا ہے۔'' وجہ تحریر کیجیے۔
۳۔ 'مرغی کے نرالے بچے' کی کہانی کو جس مسئلے سے مربوط کیا گیا ہے، اسے اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
۴۔ اپنی کہانیوں کے کرداروں کو نہ پہچاننے کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کی وضاحت کیجیے۔
۵۔ کہانی سنانے کے جلسوں سے ہونے والے فائدے بیان کیجیے۔
۶۔ بچوں کا ذہن نہ بن پانے کی وجوہات بیان کیجیے۔

سرگرمی/منصوبہ

۱۔ مضمون میں جن کہانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اُنھیں تلاش کر کے لکھیے اور ان پر تبصرہ کیجیے۔
۲۔ مولانا الطاف حسین حالؔی کی نظم 'بڑھیا کا دِیا' تلاش کر کے پڑھیے۔ نقل کیجیے اور اس نظم کی مدد سے کہانی لکھ کر نتیجہ بیان کیجیے۔

۱ نظامت

تمہید

مختلف ضرورتوں اور مقاصد کی تکمیل کے لیے سماجی، تعلیمی، مذہبی، تہذیبی، سیاسی، ادبی و تفریحی تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان تقریبات کو دلچسپ اور کامیاب بنانے میں جہاں پروگرام کی نوعیت، مشمولات، عنوانات اور شرکا اہم ہوتے ہیں، وہیں ناظم (نظامت کرنے والا) بھی بہت ضروری اور اہمیت کا حامل فرد ہوتا ہے۔

ناظم کسی تقریب کے مشمولات و نکات کو اپنے حسنِ نظامت سے بہتر انداز، دلکش لب و لہجے اور برمحل و موزوں اشعار و اقوال سے سجا کر اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ تقریب سامعین اور ناظرین کے لیے دلچسپی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

نظامت کیا ہے؟

نظامت ایک فن ہے اور موجودہ پیشہ ورانہ زمانے میں روزگار کا ایک ذریعہ بھی۔ ایک اچھا ناظم مناسب لب و لہجے، پراثر تمہیدی کلمات اور تقریب کی نوعیت کے لحاظ سے اپنے اظہار کو برجستہ اور دلچسپ بنا دیتا ہے۔ وہ تقریب کی مناسبت سے اشعار کا انتخاب، اقوال کا استعمال، رنگِ ظرافت کی آمیزش، مناسب و موزوں الفاظ میں تبصرے اور تجزیے کی شمولیت اور حالاتِ حاضرہ کے لحاظ سے خبروں کے بیان کو بروئے کار لا کر اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس سے تقریب رواں دواں رہتی ہے۔

نظامت کے شعبے

ماضی قریب میں عموماً مذہبی، سماجی، ادبی اور سیاسی تقریبات میں نظامت کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے۔ یہ نظامت محدود رہا کرتی تھی۔ ناظم محض اعلان کرنے تک محدود تھا۔ مگر وقت کے ساتھ 'نظامت' میں بھی تبدیلی آئی۔ ناظم کی حیثیت مرکزی ہوگئی۔ اس کی ذمے داریوں میں اضافہ ہوا۔ تقریبات کی نوعیت تبدیل ہوئی اور رابطے کی ضرورت بڑھتی گئی۔ نت نئی تقریبات الگ الگ عنوان اور انداز سے منعقد ہونے لگیں۔ ان تقریبات کو مؤثر اور کامیاب بنانے میں ناظمِ تقریب کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ فن مقبول ہوا اور آج یہ جز وقتی روزگار کا ایک اچھا ذریعہ بن گیا ہے۔

نظامت کے فن کے پیشِ نظر اس کے مختلف شعبے تشکیل پا گئے ہیں۔

تقریبات کے لحاظ سے شعبے اور پروگرام

شعبے	غرض و غایت
سماجی تقریب	اصلاحِ معاشرہ، سماجی بیداری مہم، الوداعی، تہنیتی تقریب، استقبالیہ
ادبی تقریب	مشاعرہ، نثری نشست، ادبی کتابوں کا اجرا، سیمینار، مباحثہ
ثقافتی تقریب	ڈراما، نکڑ ناٹک، رقص، موسیقی، گیت گاین
سیاسی تقریب	جلسہ، جلوس، احتجاجی میٹنگ، ہڑتال
سرکاری تقریب	یومِ آزادی، یومِ جمہوریہ، سرکاری اسکیموں سے متعلق جلسہ
مذہبی تقریب	جلسہ، وعظ، مجلس
کھیل کود کی تقریب	افتتاحی و اختتامی تقریب، تقسیمِ انعامات، راست اطلاعات (کمنٹری)
پیشہ ورانہ تقریب	صنعت وحرفت، کاروبار سے متعلق رہنمائی کی تقریب، ورکشاپ
ریڈیو، ٹی وی نشریات	بحث ومباحثہ، انٹرویو، پیشکش

نظامت ذریعۂ روزگار

مختلف النوع تقاریب کا اہتمام و انتظام نیز ان کی انفرادیت کو قائم رکھنے اور انھیں کامیاب بنانے کے لیے ناظمِ تقریب کا انتخاب اہمیت کا حامل ہوتا جارہا ہے۔ اس شعبے میں مہارت رکھنے والے افراد کو باقاعدہ معاوضہ و مشاہرہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔ ٹی وی اور ریڈیو پر نظامت کرنے والے ناظم (compere) تو باقاعدہ ملازمت کرتے ہیں۔ دیگر تقاریب میں بھی نظامت کرنے والے جز وقتی طور پر اس شعبے سے منسلک ہوکر روزگار حاصل کررہے ہیں۔

نظامت کیسے کریں؟

(الف) پیشگی تیاری

(i) **مطالعہ** : مطالعہ علم میں اضافے اور معلومات کی حصولیابی کا ذریعہ ہے۔ اس سے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ اور فکری ارتقا ہوتا ہے۔ کامیاب ناظم اپنے شعبے کے لحاظ سے مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تاکہ اس شعبے سے متعلق صحیح و مستند معلومات کا بروقت اظہار کرسکے۔ اخبارات کے مطالعے سے وہ حالاتِ حاضرہ سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ زبان و ادب اور شعر و افسانے کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کرکے صحیح زبان اور صحیح تلفظ ادا کرتے ہوئے ضرورت کے مطابق موزوں اشعار بھی سناتا ہے۔ ناظم صرف ایک ہی زبان کا مطالعہ نہیں کرتا بلکہ وہ مختلف زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کرتا ہے تاکہ موقع و محل اور ضرورت کے لحاظ سے انھیں استعمال کیا جاسکے۔

مطالعے کی دوقسمیں ہیں :

(الف) مسلسل مطالعہ

(ب) وقتی مطالعہ

(الف) مسلسل مطالعہ :

یہ مطالعہ بامقصد ہونا چاہیے۔ اپنے ذوق وشوق کی تکمیل کے لیے اس مطالعے کو باضابطہ جاری رکھنا چاہیے تاکہ معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔

(ب) وقتی مطالعہ :

یہ مطالعہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔تقریب کی نوعیت کے لحاظ سے،تقریب کے مقاصد کے پیشِ نظر،مشمولات، مقررین اور نکات کا لحاظ رکھتے ہوئے کچھ اہم اور منتخب مواد کا مطالعہ نظامت کو مؤثر بنانے میں مددگار ہوتا ہے۔

(ii) سماعت : ایک اچھے اور پیشہ ور ناظم کو بہترین سامع بھی ہونا چاہیے۔اسے چاہیے کہ پروگرام کی نظامت سے پہلے دیگر تقریبات کے ناظم کی نظامت کو بغور سنے۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کو نوٹ کرے۔ دوسروں کی غلطیوں سے بھی سیکھے۔ ان کی خوبیوں کو دھیان میں رکھ کر نئی خوبیاں پیدا کرے۔

سننے سے تلفظ کی اصلاح ہوتی ہے۔ الفاظ کی ادائیگی کا سلیقہ آتا ہے۔لب ولہجہ درست ہوتا ہے۔ اندازِ بیان میں تبدیلی آتی ہے۔ سنا ہوا مواد دیر تک یاد رہتا ہے اس لیے دیگر تقاریب کی ریکارڈنگ سننا چاہیے۔ یوٹیوب اور دیگر چینلوں پر پروگرام سنتے رہنا چاہیے۔اس سے نظامت میں نکھار آسکتا ہے۔

(iii) اظہارِ خیال کی تیاری : نظامت میں آواز کے ساتھ اظہارِ خیال میں سلیقہ مندی اور تسلسل ضروری ہے۔ دیے ہوئے نکات کے تحت کسی کو مدعو کرنے اور اس کی بات ختم ہونے کے بعد موزوں الفاظ میں مختصر اور جامع تبصرہ اور تمہیدی کلمات کہنا ضروری ہوتا ہے۔ اچھا ناظم سلیقہ مندی سے اظہارِ خیال کی مشق کرتا ہے۔ پروگرام سے قبل کچھ اہم باتوں کو نوٹ کرکے ان کی مشق کرلیتا ہے تاکہ دورانِ تقریب ان کا استعمال بہتر طریقے سے کرسکے۔

(iv) مشق : ناظمِ تقریب کو چاہیے کہ وہ مندوبین سے متعلق معلومات کی زبانی مشق کرلے۔تقریب کے دوران کب کیا بولنا ہے؟ کہاں کون سا شعر پڑھنا ہے؟ کس معلومات کو بیان کرنا ہے؟ سامعین کی توجہ مبذول کرانے کے لیے کن باتوں کا اظہار ضروری ہے؟ تقریب سے پہلے ایک کامیاب ناظم ایسی مشق ضرور کرتا ہے۔

(ب) نظامت شروع کرنے سے پہلے

۱) لازمی ہے کہ ناظم تقریب کے موضوع اور اس کے مقصد سے متعلق معلومات حاصل کرلے۔

۲) تقریب کے دعوت نامے کے پیش نظر حفظِ مراتب کا خیال رکھے۔

۳) تقریب کے شرکا (سامعین وناظرین) کی عمر، دلچسپی، پسند اور توقعات کو دھیان میں رکھے۔

۴) تقریب کے دوران ہونے والی تبدیلیوں کے لیے ذہنی طور سے تیار رہے۔ بروقت تبدیلی ہو تو صورتِ حال پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے، اس کا شعور رکھے تا کہ تقریب میں خلل واقع نہ ہو۔

(ج) دورانِ نظامت

ایسا کریں!

۱) تقریب کے آغاز میں سامعین کو مناسب القاب سے مخاطب کریں۔ روایت کے مطابق سلام و استقبال کریں۔ تعارف پیش کریں۔

۲) مناسب لب و لہجے اور اچھے الفاظ میں، موزوں اشعار کی مدد سے تمہیدی کلمات پیش کریں اور تقریب کے عنوان کا اعلان کریں۔

۳) ترتیب شدہ پروگرام کے لحاظ سے تقریب کو ایک روانی کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ ہر مرحلے کو دوسرے مرحلے سے مربوط کرنے کے لیے مختصر و جامع تبصرہ کریں۔ اقوال، ظریفانہ جملے، اشعار وغیرہ سے اگلے مرحلے کا آغاز کریں۔

۴) موقع و محل کے لحاظ سے وقت کا خیال رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق اپنی گفتگو کریں۔ دورانِ نظامت سامعین کو اپنی آواز اور معلومات کے سحر سے باندھے رکھیں۔ سامعین کے تجسّس کو برقرار رکھیں۔

۵) بروقت اور حالات کے لحاظ سے مناسب تبدیلی کریں۔

ایسا نہ کریں!

۱) مبالغہ آرائی سے کام نہ لیں۔

۲) چیخ و پکار نہ کریں۔

۳) مقررین کی تمام باتوں کو نہ دہرائیں۔ صحیح غلط کا فیصلہ نہ سنائیں۔ موازنہ نہ کریں۔

۴) بار بار ایک ہی بات کی تکرار نہ کریں۔

اگر ان تمام باتوں پر توجہ دیں تو آپ ایک اچھے ناظم بن سکتے ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

۱) کامیاب ناظمِ تقریب کی خوبیاں بیان کیجیے۔

۲) نظامت کی پیشگی تیاریوں کے بارے میں اپنے تجربات لکھیے۔

۳) نظامت کے دوران 'ایسا کریں' اور 'ایسا نہ کریں' سے متعلق نکات لکھیے۔

۴) ''نظامت کے لیے مطالعہ اور مشق ضروری ہے۔'' اپنی ذاتی رائے لکھیے۔

سرگرمی/منصوبہ

۱) یومِ جمہوریہ / یومِ آزادی کی تقریبات کے لیے نظامت کا خاکہ تیار کیجیے۔

۲) 'ترغیبِ یومِ مطالعہ' پروگرام کی نظامت کے لیے نکات تیار کیجیے۔

۳) اسکول کی کسی الوداعی تقریب کی نظامت کا خاکہ تیار کیجیے۔

پروف ریڈنگ

تمہید

کسی کتاب کی اشاعت کے مراحل میں متنی تصحیح ایک اہم مرحلہ ہے جسے انگریزی میں 'پروف ریڈنگ' کہتے ہیں۔ کتاب ہی کی طرح رسائل، اخبارات، اشتہارات، رقعات، خطوط وغیرہ کی اشاعت میں بھی متنی تصحیح کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اشاعتی اداروں میں خاص طور پر اخبارات و رسائل کے دفتروں میں اس مقصد کے لیے قابل افراد کا تقرر کیا جاتا ہے اور انھیں معقول تنخواہ دی جاتی ہے۔

اشاعت سے پہلے کسی عبارت کو بغور پڑھ کر اس میں موجود املا اور زبان و بیان کی غلطیوں کی نشان دہی کرنے کا عمل پروف ریڈنگ کہلاتا ہے۔ کتابت یا کمپیوٹر کمپوزنگ کے دوران عبارت میں غلطیاں رہ جاتی ہیں یا کچھ الفاظ چھوٹ جاتے ہیں۔ پروف ریڈنگ کے دوران انھیں تلاش کر کے درست کیا جاتا ہے۔ تحریر میں معمولی غلطیاں بھی معنی ومفہوم میں بڑی خرابیاں پیدا کر دیتی ہیں مثلاً ایک اہم ملکی رہنما کے متعلق ایک اخبار میں خبر شائع ہوئی جس میں ملک کی خاطر ان کی قید و بند کی صعوبتوں کا تذکرہ تھا۔ کاتب نے غلطی سے لفظ 'جیلیں' کو 'جیبیں' لکھ دیا جس کی پروف ریڈنگ نہ ہوسکی اور خبر اس طرح شائع ہوئی: ''ہمارے مشہور قومی رہنما ملک کی آزادی کی خاطر جیبیں بھرا کرتے تھے۔''

عوام تک پہنچنے والی کسی بھی تحریر کا صرف ونحو اور زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک ہونا ضروری ہے۔ قلم کار کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ معیاری اور بے عیب زبان لکھے۔ اس کے بعد اسے شائع کرنے والے کا فرض ہے کہ اسے صحیح طور پر لکھوائے اور پروف ریڈنگ کروا کر اس عبارت کو اغلاط سے پاک کرے۔ اگر کتابت یا کمپوزنگ کی غلطیوں کے ساتھ وہ تحریر شائع ہوجائے تو اسے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ عبارت کو صحتِ زبان کے ساتھ شائع کرنے کے تقاضے ہی نے پروف ریڈنگ کے فن کو جنم دیا۔ ترسیل و ابلاغ کی ترقی سے اخبارات و رسائل کے علاوہ اطلاع نامے، خطوط، پمفلٹ، پوسٹر اور بینر کی اشاعت میں زبردست اضافہ ہوا ہے اس لیے پروف ریڈنگ کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔

پروف ریڈنگ کرنے والا مصحح کار یا پروف ریڈر کہلاتا ہے۔ اشاعت سے پہلے وہ عبارت کے شائع شدہ پروف دیکھ کر غلطیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران وہ اِملا کی درستگی، جملوں کی ترتیب، علاماتِ اوقاف کے صحیح استعمال اور صحتِ زبان کے علاوہ عبارت میں پیراگراف کی ترتیب پر بھی توجہ دیتا ہے۔ بعض اوقات مرکب الفاظ کا دوسرا حصہ نچلی سطر میں چلا جاتا ہے، وہاں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ مرکب الفاظ ایک ہی سطر میں لکھے جائیں۔ کبھی دو الفاظ کے درمیان خالی جگہ زیادہ چھوٹ جاتی ہے، اسے بھی عیب سمجھا جاتا ہے۔

پروف ریڈنگ ایک نازک کام ہے۔ اکثر بار بار پروف ریڈنگ کے باوجود عبارت میں غلطیاں رہ جاتی ہیں اسی لیے عام طور پر اسے تین مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔

پہلی قرأت : کسی ماتحت کی مدد سے اصل عبارت کا ٹائپ کیا ہوا یا کتابت شدہ مسودہ پڑھوایا جاتا ہے۔

دوسری قرأت : پہلی مرتبہ نظر آنے والی غلطیوں کی جانچ اور نئے سرے سے نظر آنے والی غلطیوں کی نشان دہی کے علاوہ فہرست میں صفحات کے نمبرات کا اندراج، تصاویر، خاکے وغیرہ کا بغور مطالعہ کر کے غلطیوں کو درست کیا جاتا ہے۔

تیسری قرأت : دوسری مرتبہ پڑھنے پر جو غلطیاں نظر آتی ہیں، انھیں ٹھیک کر کے پوری کتاب کو اچھی طرح جانچا جاتا ہے کیونکہ شائع ہونے کے بعد ان غلطیوں کو درست کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

پروف ریڈر کی خوبیاں

پروف ریڈر کے لیے مخصوص قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی زبان کی تعلیم کے علاوہ باریک بینی، غور وفکر اور مطالعے کی عادت ضروری ہے۔ اس کے لیے صحتِ الفاظ، معیاری زبان اور قواعد کے اُصولوں سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ پروف ریڈر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لفظوں کے لغوی معنی سے واقف ہونے کے علاوہ ان کے محلِ استعمال کو بھی بخوبی جانتا ہو۔ پروف ریڈر کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ الفاظ بامعنی ہوں، سیاق وسباق سے مطابقت رکھتے ہوں بلکہ اسے لفظوں کی تکرار اور بے محل اور نامناسب الفاظ کی بھی نشان دہی کرنے میں مہارت حاصل ہو۔ عبارت میں کوئی عیب موجود ہو تو پروف ریڈر اس عیب کو درست کرنے کی کوشش کرے۔

جس مضمون کی پروف ریڈنگ کی جا رہی ہو، پروف ریڈر کو اس کا گہرا علم ہونا چاہیے۔ ذوقِ مطالعہ، کام کی لگن اور موضوع سے دلچسپی پروف ریڈر کی امتیازی خوبیاں ہیں۔ کتاب کی ترتیب و تدوین کا سلیقہ اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا جاننا بھی پروف ریڈر کے لیے ضروری ہے۔ زبان و ادب سے پروف ریڈر کی گہری واقفیت لازمی ہے۔ صحتِ زبان، معیاری الفاظ اور قواعد کے اُصولوں کی پابندی پر بھی پروف ریڈر کی گرفت ہونی چاہیے۔ پروف ریڈر کے لیے مختلف علوم وفنون سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

پروف ریڈنگ کے وسائل

پروف ریڈنگ کے دوران پروف ریڈر کو مختلف کتابوں کی مدد حاصل کرنی چاہیے۔ اس میں لغت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ پروف اُردو زبان میں ہو تو اُردو لغت کے علاوہ ان زبانوں کے لغات بھی استعمال کرنا چاہئیں جن کے الفاظ عبارت میں استعمال کیے گئے ہیں۔ بعض اوقات انگریزی یا ہندی الفاظ کے معنی اور املا دیکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ حوالہ جاتی کتب، اصطلاحات سے متعلق کتابیں اور قاموس اور انسائیکلوپیڈیا کی بھی ایک پروف ریڈر کو ضرورت پیش آتی ہے۔

پروف ریڈنگ اور کمپیوٹر کمپوزنگ

کمپیوٹر کی ایجاد نے مختلف قسم کی سہولتیں مہیا کی ہیں۔ ان میں زبان کی غلطیوں کی نشان دہی اور زبان کی تصحیح کا عمل بھی شامل ہے۔ انگریزی، مراٹھی اور دیگر زبانوں میں 'اسپیل چیک' کے ذریعے کمپوزنگ کے بعد یا کمپوزنگ کے دوران ہی عبارت کی غلطیوں کا پتا لگا کر انھیں درست کیا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر ان غلطیوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ہی صحیح متبادل بھی فراہم کرتا ہے۔ اُردو کمپوزنگ میں اب تک یہ سہولت حاصل نہیں ہے مگر اس سلسلے میں کوششیں جاری ہیں۔ شاعری میں پائے جانے والے سہو اور اسقام کو دور کرنے کے لیے بھی ویب سائٹ موجود ہیں جن سے اشعار کی تقطیع اور بحر کا نام معلوم کرنا آسان ہو گیا ہے۔

ان تمام سہولتوں کے باوجود پروف ریڈر کو انگریزی، ہندی اور مراٹھی کی تصحیح کرنے والے ایپ استعمال کرنے کے بعد بھی پروف پڑھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ان میں بھی غلطیوں کا احتمال رہ جاتا ہے۔

پروف ریڈنگ کی اہمیت

ادیب کے تخلیقی عمل کے بعد ادبی متن کی اشاعت کے مقصد سے کاتب/ کمپوزر، پروف ریڈر، طابع اور ناشر اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان تمام افراد کی مہارت اور کام کے معیار سے کتاب کی افادیت اور قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ مختلف مراحل میں اگر کتاب ماہرین کے ہاتھوں سے گزر کر مکمل ہو تو وہ اہمیت و افادیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ اس میں پروف ریڈنگ کا مرحلہ سب سے اہم ہے۔ کتاب کتنی ہی خوب صورت اور قیمتی ہو لیکن اس میں زبان و بیان اور اِملا کی غلطیاں پائی جائیں تو اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ کسی کتاب کو قابلِ مطالعہ بنانے میں پروف ریڈر اور طابع اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کتاب کی ظاہری تزئین کاری کے ساتھ ہی اغلاط سے پاک ہونا کتاب کی قدر و قیمت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

پروف ریڈنگ سے متعلق افراد/ اجزا

طبع شدہ صفحات	Printout	کاتب	Calligrapher
مطبع	Press	مشینی متن ساز	Composer
طابع	Printer	مسودہ برائے تصحیح	Proof
چھپائی - طباعت	Printing	تصحیح کے نشانات	Proof Marks
		مسودہ برائے طباعت	Press Copy

تصحیح کار (مسودے کی غلطیوں کی نشان دہی کرنے والا) - Proof Reader

پروف ریڈر کے لیے ہدایات

پروف ریڈنگ ایک اہم مہارت ہے جس کے بغیر اغلاط سے پاک اور قابلِ مطالعہ کتابوں کی اشاعت ممکن نہیں۔ کتابیں سماجی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تعلیمی ترقی میں بھی صرف کتابوں کا مطالعہ کافی نہیں ہے بلکہ صحیح، معیاری اور بے عیب کتابیں ہی اس تعلق سے کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے اچھی، معیاری اور مفید کتابوں کی اشاعت کے لیے پروف ریڈر کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہے۔ کتابوں سے اغلاط کو دور کرنا اور عبارت کی تصحیح کرنا پروف ریڈر کی اوّلین ذمے داری ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ پروف ریڈر عبارت کی کتابت یا کمپوزنگ کے دوران ہونے والی غلطیوں کی نشان دہی کر کے انھیں مصنف کی نظر میں لائے۔ پروف ریڈر کتاب کا مصنف یا مرتب نہیں ہے۔ اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ متن یا عبارت میں تبدیلی کرے یا جملوں کی ساخت میں ایسی تبدیلی کرے جس سے معنی و مفہوم بدل جائے۔ پروف ریڈر کو عام طور پر مسودہ کا تین مرتبہ مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ اس میں موجود غلطیوں کی اصلاح کی جا سکے۔ پروف ریڈر کا ناشر اور کتاب کے مصنف سے رابطہ ضروری ہے تاکہ کتاب کی اشاعت کا کام مؤثر طریقے سے تکمیل تک پہنچے۔

۳ ترجمہ نگاری

تمہید

آج انسانی معاشرے میں بڑھتے ہوئے روابط اور عالم کاری کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں ایک دوسرے سے خاصے ربط میں آ گئی ہیں۔ زبانیں ایک دوسرے کے ربط میں آجائیں تو وہ ایک دوسرے کو متاثر کرتی اور ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتی ہیں۔

معاشرے میں رہنا اور ایک دوسرے سے رشتہ رکھنا افراد کی ضرورت ہے۔ آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کے لیے انھیں زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر سماج میں مختلف زبانوں کے لوگوں سے واسطہ پڑ جائے تو پھر باہمی گفتگو اور اظہارِ خیال کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں ترجمے کا فن فریقین کے درمیان 'پل' کا کام کرتا ہے۔ آج عالم کاری کی وجہ سے ترجمہ نگاری وقت کی اہم ضرورت بن گئی ہے۔ اس وقت دنیا میں تقریباً چھے ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں ادب کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ اس کی تفہیم و تشہیر ترجمے کے بغیر ممکن نہیں۔

گیارھویں جماعت میں اُردو مضمون کے تحت 'زبان' پر غور کرتے وقت ترجمہ نگاری کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ عالم کاری کے بڑھتے رجحان کی وجہ سے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اور دیگر بیرونی ممالک میں حصولِ تعلیم اور ملازمت کے کئی مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ بھارت میں چونکہ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اس لیے یہاں ترجمہ نگاری کے فن کو اہمیت حاصل ہوئی ہے۔

ترجمہ نگاری : ایک عملی مشق – ترجمہ نگاری کا فن نہایت قدیم ہے۔ اپنے ذاتی تجربات کو بیان کرنا یا اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ دوسروں کے تجربات اور خیالات معلوم کرنے کے لیے بھی ترجمے کا استعمال ناگزیر ہے۔ دیگر زبانوں، ادب اور تہذیبوں سے باہمی ربط استوار کرنے کے لیے بھی ترجمہ آلہ بن سکتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

"Translation is a bridge to join the gulf between multiple languages."

ترجمے کی تعریف

۱۔ اے.ایچ.اسمتھ کے مطابق ترجمے سے مراد ایک زبان کے الفاظ کے معنی دوسری زبان میں بیان کرتے وقت اصل معنی کو جوں کا توں پیش کرنے کی کوشش ہے۔

۲۔ ایک زبان کے تحریری متن میں پیش کردہ خیال کو دوسری زبان کے تحریری یا تقریری متن میں بیان کرنا ترجمہ کہلاتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت صرف الفاظ کے معنی ہی تبدیل نہیں کیے جاتے بلکہ بین السطور میں جو جذبہ، احساس یا مطلب چھپا ہوتا ہے، اسے ترجمے کی زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔

مغربی ممالک میں ترجمہ نگاری کا خیال لاطینی زبان سے آیا ہے جس کی وجہ سے وہاں انگریزی سے دیگر مغربی زبانوں اور مغربی زبانوں سے انگریزی میں ترجمے ہونے لگے۔ اُردو میں عربی، فارسی سے ترجمے کی روایت عرصۂ قدیم سے رہی ہے۔ آج دنیا کی مختلف

زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم دستیاب ہیں۔قرآن مجید کے اُردو تراجم اور عربی فارسی کے کلاسیکی ادب کو اُردو میں ڈھالنے کی روایت اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ بھارت چونکہ مختلف زبانوں اور بولیوں کا ملک ہے اس لیے یہاں صوبوں کے زبان و ادب کی تفہیم کے لیے ترجمہ نگاری از حد ضروری مظہر ہے۔ اُردو میں ان صوبائی زبانوں کے ادب کو پیش کرنے کے لیے ترجمہ نگاری کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ تاحال اُردو میں رامائن، مہابھارت، گیتا وغیرہ کے اُردو تراجم دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ بعض علاقائی زبانوں کے ادب کے بھی تراجم ہوئے ہیں۔ اگر ترجمے کے فن کو ماہرانہ انداز میں سیکھا جائے تو یہ روزگار کا اچھا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

ترجمے کی اقسام

- **بامحاورہ ترجمہ :** اس قسم کے ترجمے میں ترجمے کی زبان کے معیار، اس کے فطری پن اور لطافت کی چاشنی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ الفاظ کے معنی کشید کر کے دوسری زبان کے الفاظ میں سمونے کی کوشش کی جاتی ہے۔

خصوصیات : یہ لفظی اور آزاد ترجمے کے بین بین ہوتا ہے مگر ترجمے کو زبان کے فطری پن سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔

ترجمے کا اسلوب : بامحاورہ ترجمے میں زبان کے اسلوب کی چھاپ دِکھائی دیتی ہے۔ جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے، اس زبان کے معیار اور اس کے فطری رویے پر زور دیا جاتا ہے۔

مثالیں : شاہ عبدالعزیز کا ترجمۂ قرآن بامحاورہ ترجمہ ہے۔ آپ کی درسی کتاب میں شامل ڈراما روسی زبان سے ترجمہ کیا ہوا بامحاورہ ہے۔

- **لفظی ترجمہ :** لفظی ترجمے میں صرف الفاظ کے معنی ہی پر زور دیا جاتا ہے۔ زبان کے اسلوب اور بیان کی شگفتگی کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

خصوصیات : اس میں زبان کے صَرف و نحو کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا۔

ترجمے کا اسلوب : لفظی ترجمے کا اسلوب غیر متوازن اور غیر معیاری ہوتا ہے۔ الفاظ کے معنی ہی کا خیال رکھنے کی وجہ سے جملوں کی روانی مفقود ہوتی ہے۔

مثالیں : شاہ عبدالقادر کا ترجمہ 'موضّح القرآن' لفظی ترجمہ ہے۔

- **منظوم ترجمہ :** منظوم ترجمہ نگاری کا فن بے حد مشکل ہے۔ اس میں عروضی اُصولوں کو برتنے کے ساتھ اصل متن کے خیالات کو جوں کا توں پیش کرنے میں دِقّت آسکتی ہے۔

خصوصیات : ترجمے کی زبان میں شعری اسالیب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی بات کی وضاحت ایک شعر میں اور بعض اوقات ایک بند میں کی جاتی ہے۔

ترجمے کا اسلوب : دیگر زبانوں کے شعری محاسن کی بجائے ترجمے کی زبان کے شعری محاسن اور اس کے عروضی اُصولوں کے مطابق متن کو نظم میں ڈھالا جاتا ہے۔

مثالیں : قرآن حکیم کے منظوم تراجم سیماب اکبرآبادی اور کیفؔ بھوپالی نے کیے ہیں۔ ان کے علاوہ رامائن، گیتا اور مہابھارت کے منظوم ترجمے اُردو میں دستیاب ہیں۔

- **آزاد ترجمہ/ ترجمانی :** دوسری زبان کے کسی متن کے مطالب کو آزادانہ طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں کلیدی مفہوم پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

خصوصیات : دوسری زبان کے ادب سے لطف اندوز ہونا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اصل عبارت کے ہر جملے پر اس قسم کے ترجمے میں غور نہیں کیا جاتا۔

ترجمے کا اسلوب : آزاد ترجمے میں خیالات کی طوالت کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے ترجمے گویا اصل متن کا خلاصہ ہوتے ہیں۔

مثال : علامہ اقبالؔ نے بھرتری ہری کی سنسکرت نظم کی اُردو میں ترجمانی کی ہے مثلاً

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ترجمہ نگار کا کردار

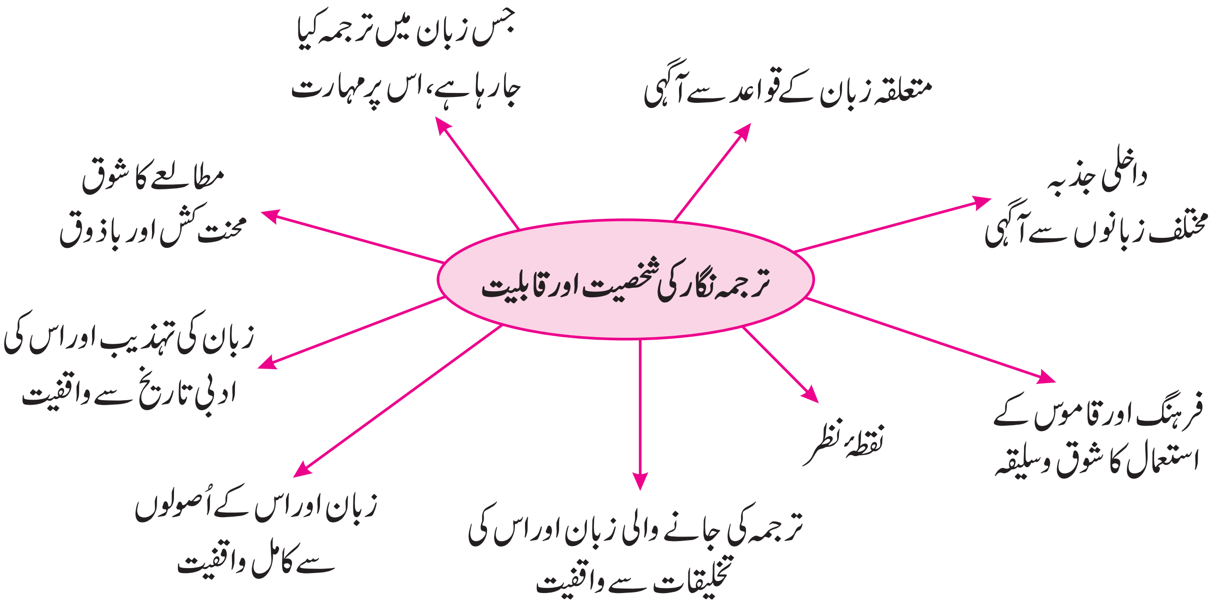

ترجمہ نگار دو زبانوں کی تہذیبوں کو جوڑنے والا پل ہوتا ہے۔ ترجمہ صرف تکنیکی عمل نہیں بلکہ ترجمہ کیے جانے والے اصل متن سے متوازی تخلیقی ادب پارہ ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمے کے فن کو مہارت سے جوڑا جاتا ہے اور یہی مہارت ترجمہ نگار کی شخصیت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ چونکہ ترجمے کے ذریعے دیگر زبانوں کے ادب پارے باذوق قارئین تک پہنچ پاتے ہیں اس لیے ترجمہ نگار کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ترجمے کے لیے 'بہترین' ادبی تخلیق کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ترجمہ کی جانے والی تخلیق جتنی اہم اور معروف ہوگی، ترجمہ نگار

اسے صرف معیاری زبان ہی نہیں بلکہ عوامی بولیوں کے الفاظ سے بھی مرصّع کرے گا۔ کسی زبان کے ایک لفظ کے لیے دیگر زبانوں کے مختلف الفاظ کے معنوی پہلوؤں سے واقفیت بھی ترجمہ نگار کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ الفاظ کے معنی ترجمے میں پیش کرنے کی بجائے اس میں پنہاں خیال کو پیش کردینے سے ترجمہ دل کو چھولیتا ہے۔

ترجمہ کی جانے والی زبان میں دیگر زبانوں کے الفاظ جوں کا توں مِل جائیں یہ ضروری نہیں بلکہ بعض اوقات تو ترجمہ کیے جانے والے الفاظ کے معنی بھی ترجمے کی زبان میں نہیں ملتے مثلاً مراٹھی الفاظ 'जिव्हा' اور 'भाषा' کے لیے اُردو میں صرف 'زبان' ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ترجمہ نگار کی مہارت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ضروری ہے کہ متعلقہ زبان کے متن کو بغور پڑھا جائے۔ اس کی تفہیم لازمی ہے۔ پھر سیاق وسباق کے مطابق متن کی لفظیات کے معنوں کا تعین اور ان متعینہ معنوں کے مطابق رواں ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔

ترجمہ نگاری کا عملی میدان

اخبارات، عدالتیں، سرکاری محکمے اور ابلاغ کے مختلف اداروں میں ترجمہ نگاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی اسامی کے لیے انٹرنیٹ کی ویب سائٹ پر اشتہار دیے جاتے ہیں۔ آن لائن کام کرنا اور آن لائن اُجرت پانا اس طریقے سے ترجمے کا کام کرنے کا چلن عام ہورہا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلمی دنیا وغیرہ میں ترجمہ نگاری کے مواقع حاصل ہیں۔ فی زمانہ بین الاقوامی کمپنیاں اپنے عالمی فروغ کے لیے ترسیل وابلاغ کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ اس کے لیے انھیں ماہر ترجمہ نگاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے علاوہ درج ذیل اداروں میں بھی ترجمہ نگاروں کی ضرورت کو محسوس کیا جارہا ہے۔

۱۔ تعلیمی حلقے : آج تعلیمی اداروں میں ترجمہ نگاری کی ضرورت ہے۔ تکنیکی تعلیم، طبّی تعلیم، انجینئرنگ، قانون، ہوم سائنس، آرٹس (فنون)، معاشیات، سائنس وغیرہ میں ترجمہ نگاری کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ صنعت وحرفت، بینک اور روزمرہ کے لین دین میں بھی ترجمے کا استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ طبّی حلقے : دواؤں کے اشتہارات، ادویہ کے معلوماتی پرچے وغیرہ مختلف زبانوں میں تیار کرنے کے لیے بھی ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳۔ قانون کے حلقے : اَن پڑھ اور کم تعلیم یافتہ کسانوں کو زرعی قوانین کی معلومات مثلاً سات بارہ کے کاغذات، حکومت کی جانب سے دی جانے والی مختلف سہولتوں کی معلومات، بینکوں سے لین دین کے قوانین وغیرہ کے ترجمے، کم تعلیم یافتہ لوگوں کو سہولت بہم پہنچا سکتے ہیں۔

۴۔ سیر وتفریح کے حلقے : ملکی و غیر ملکی سیاحت کرنے والوں کو تفریحی مقامات، ہوٹلوں (رہائش گاہوں)، وسائلِ سفر (ریل، ہوائی جہاز وغیرہ) کی معلومات بہم پہنچانے کے لیے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۵۔ مترجم : تجارتی حلقے میں مترجم کے پیشے کو بڑی اہمیت حاصل ہے مثلاً بڑے سرکاری افسروں یا حکومت کے سربراہوں کو غیر ملکوں میں سفر کے دوران مترجم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مترجموں سے ہی یہ سربراہ اپنی تقریریں درست کرواتے ہیں اور دو حکومتی

سربراہوں کی گفتگو کے درمیان رابطے کا کام کرتے ہیں۔

تاریخی اور تفریحی مقامات پر غیر ملکی سیاحوں کی رہنمائی اور گائیڈ کے فرائض انجام دینے کے لیے بھی مترجمین کی ضرورت پیش آتی ہے۔

کمپیوٹر کے ذریعے ترجمہ نگاری بھی آج وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آج 'گوگل مترجم' ایک پیشے کے طور پر روزگار مہیا کر رہا ہے۔

ترجمہ نگاری کے اُصول وضوابط

۱۔ ترجمہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ ترجمے کے لیے ایسی ہی تخلیق کا انتخاب کرے جو تا دیر باقی رہنے والی ہے۔

۲۔ ترجمے کے لیے منتخبہ تخلیق کے ساتھ انصاف کرے۔

۳۔ ترجمہ واضح، اغلاط سے پاک اور اعتماد کے لائق ہو۔

۴۔ تخلیق کے ساتھ مترجم بدظنی کا رویہ اختیار نہ کرے۔

۵۔ ترجمہ نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے خیالات کو ترجمے میں شامل نہ کرے۔

۶۔ جس زبان میں اور جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے، مترجم دونوں زبانوں کے قواعد سے واقف ہو۔

۷۔ ترجمہ قارئین کی دلچسپی کا سبب بنے۔

۸۔ ترجمہ کیے جانے والے متن میں آنے والی حوالہ جاتی کتب، رسالے، اخبارات، مقامات وغیرہ کے ناموں کا ترجمہ نہ کریں۔

۹۔ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، اسی زبان کے رسم خط کا استعمال کیا جائے۔

۱۰۔ تخلیق کی اہمیت کے پیش نظر یہ طے کیا جائے کہ اس کا آزاد ترجمہ مناسب ہوگا یا بامحاورہ۔

ترجمہ کیسا ہو؟

ہر ترجمہ نگار کے اپنے بنیادی اُصول ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی فکر ہوتی ہے۔ کسی ایک تخلیق کے کئی ترجمہ نگار ہو سکتے ہیں۔ ترجمہ رواں اور فطری انداز میں ہو۔ ترجمہ اصل متن کے مطابق ہو۔ قاری اصل متن سے واقف نہیں ہوتا، وہ ترجمے پر اعتماد کر لیتا ہے اس لیے اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔

معیاری زبان اور بولی دونوں کے لیے مترجم کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے اس لیے مترجم کو چاہیے کہ زبان اور بولی کے فرق کو ملحوظ رکھ کر ترجمہ کرے۔ بولی کے الفاظ کے ساتھ لکھی گئی کسی تخلیق کا ترجمہ کرتے وقت معیاری زبان پر اصرار نہ کیا جائے۔ مترجم کو زمانے کی قید اور اس دور کی تہذیب کا علم ہونا ضروری ہے۔ مختلف بولیوں اور ان کے تہذیبی ماحول سے مترجم کما حقہ واقف ہو۔

مشقی سرگرمیاں

۱۔ نوٹ لکھیے۔

- لفظی ترجمہ
- بامحاورہ ترجمہ
- منظوم ترجمہ
- آزاد ترجمہ/ترجمانی

۲۔ ترجمہ نگاری کا عملی میدان مفصل بیان کیجیے۔

۳۔ ترجمہ نگاری میں روزگار کے مواقع پر اپنی رائے تحریر کیجیے۔

۴۔ اُردو میں ترجمہ کیجیے۔

पुस्तके म्हणजे माहितीचा खजिना. पुस्तके नवनवीन गोष्टींची माहिती देतात, अपले ज्ञान वाढवतात, नवीन शब्दांची ओळख करून देतात. पुस्तके आपणांस विचार करायला लावतात. आपल्या विचारांना दिशा देतात. ज्ञानबरोबरच आपले मनोरंजन करतात. पुस्तके आपल्याला सोबत करतात. घरात एकटे आहात, वेळ जात नाही, कंटाळा आलाय, आपल्यासोबत बोलायला कोणी नाही, तर काढा पुस्तके अन् करा सुरुवात वाचायला. बघा, वेळ कसा मजेत जाईल. केवळ गोष्टींचीच पुस्तके असतात असे नाही. थोर व्यक्तींची चरित्रे, प्रवासवर्णन, कथासंग्रह, काव्यसंग्रह, नाटके, कादंबरी, ऐतिहासिक, वैज्ञानिक व निसर्गाशी संबंधित असणारी अनेक पुस्तके असतात.

۵۔ مراٹھی میں ترجمہ کیجیے۔

۱۔ آج اسکول میں صدر مدرّس نے غالبؔ کی غزل پڑھائی۔ مزہ آ گیا۔

۲۔ ڈاکیے نے کتابوں کا پارسل لا کر دیا۔

۳۔ بڑے بھیا بنگلور سے آ رہے ہیں۔

۴۔ آج اسکول کی فیس ادا کرنا ہے۔

۴

بلاگ

تمہید

سائنس اورٹکنالوجی نے اکیسویں صدی میں خوب ترقی کی جس کے سبب اطلاعاتی مواصلاتی ذرائع کی ترقی میں بھی تیزی آئی، جدید مواصلاتی ذرائع وجود میں آئے اور سماجی رابطے کے ذرائع (سوشل میڈیا) عام لوگوں تک پہنچنے لگے۔علم، معلومات، تفریح اور اشتہار بازی پر ذرائع ابلاغ کی اجارہ داری ختم ہوئی اور عام لوگوں کی رسائی ان تک ہوئی۔ انٹرنیٹ کے سبب سماجی روابط کے سائٹس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور ایک عام آدمی بھی اس کے فوائد سے محروم نہ رہ سکا۔ سماجی روابط کے ذرائع کی مدد سے ہر کوئی اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرسکتا ہے۔ واٹس ایپ، فیس بک، ٹویٹر، انسٹاگرام وغیرہ بلاگ ہی کی قسمیں ہیں۔

تعریف

اُردو میں لفظ بلاگ کی کوئی جامع تعریف ابھی تک وضع نہیں ہوئی ہے مگر عرفِ عام میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''بلاگ دراصل انٹرنیٹ پر ہمارے خیالات، جذبات، محسوسات اور مشاہدات کا تحریری اظہار ہوتا ہے۔'' یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شاعر اشعار کے ذریعے اپنے محسوسات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

بلاگ انگریزی کے دو لفظ Web اور Log سے مل کر بنا ہے۔ بلاگ ویب سائٹس کی ایک ایسی قسم ہے جس میں کسی ادارے، گروہ، کمپنی یا شخص کی طرف سے معلومات (مواد) کو مکمل آزادی اور باقاعدگی کے ساتھ روزانہ شائع کیا جاتا ہے۔''

بلاگ کو اگر جدید طرز کی آن لائن ڈائری کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ ایک ایسا آن لائن پلیٹ فارم ہے جہاں آپ اپنے خیالات، احساسات، تجربات اور معلومات کو آپس میں بانٹتے اور قارئین سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ بلاگ میں آپ گرافکس اور ویڈیوز کا استعمال بھی آزادی کے ساتھ کرسکتے ہیں۔ آپ کا بلاگ نہ صرف آپ کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ آپ کے جذبات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ قارئین اور آپ کے درمیان کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ کسی ایڈیٹر کی قینچی سے آپ کے خیالات اور جذبات کی قطع و برید نہیں ہوتی۔ جیسی آپ کی سوچ ہوگی ویسا ہی آپ کا بلاگ ہوگا۔

بلاگ کسی بھی موضوع پر تحریر کیا جاسکتا ہے مگر زیادہ تر بلاگرز اپنے بلاگ سماجی اور سیاسی موضوعات پر تحریر کرتے ہیں۔ تاہم آج کل کی نوجوان نسل کا زیادہ زور انفارمیشن ٹکنالوجی جیسے موضوع پر ہے اور وہ اسی موضوع پر بلاگ تیار کرنا پسند کرتی ہے۔

وسعت

یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنی دریافت، ایجاد اور خیالات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے خیالات ونظریات کی ترویج واشاعت چاہتا ہے۔ یہی وہ جستجو ہے جو لوگوں کو بلاگ لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

بہت سی کمپنیاں اپنے ملازمین کو بلاگ لکھنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ مائیکروسافٹ کے سیکڑوں ملازمین باقاعدگی سے بلاگ لکھتے

ہیں۔ یہی حال دیگر اہم کمپنیوں کا بھی ہے جن کے ملازمین بلاگ میں اپنے اہم تجربات اور مشاہدات بیان کر کے قارئین کی رہنمائی کرتے ہیں۔ بلاگ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سیاست کے اہم اوزار کا کام کرتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ترقی یافتہ اقوام کی بہت سی سیاسی شخصیات اپنے بلاگز لکھتی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے اعلیٰ عہدیداران ہوں یا یونیورسٹی کے محققین، فلمی ستارے ہوں یا ذرائع ابلاغ سے منسلک لوگ، بلاگ سب کی ضرورت بن چکے ہیں۔ بلاگ اب اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ پیسا کمانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا مشہور بلاگ ہو جسے آپ اشتہارات سے پاک دیکھیں۔ لوگوں میں دوسروں کے بلاگ پڑھنے کا رجحان، اپنے بلاگ لکھنے سے بھی زیادہ ہے اس لیے ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ پوری ویب سائٹ کے مقابلے اُسی سائٹ پر موجود کسی مخصوص بلاگ کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسے بلاگ پر اشتہارات لگا کر ان کی شہرت سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے جبکہ گوگل ایڈ آن کے اشتہارات تو آپ کو تقریباً ہر چھوٹے بڑے بلاگ پر نظر آتے ہی ہیں۔ بلاشبہ بلاگنگ اس وقت انٹرنیٹ کی اہم ترین سرگرمی شمار کی جاتی ہے۔ لاکھوں لوگ اپنے بلاگ لکھتے یا دوسروں کے بلاگ پڑھتے ہیں اور یہ ایک جنون کی طرح انٹرنیٹ پر پھیلتا جا رہا ہے۔

بلاگ کی تاریخ

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جسٹن ہال نے links.net کے نام سے پہلا بلاگ ۱۹۹۴ء میں شروع کیا۔ 'ویب لاگ' کا لفظ جارن بارگر (Jorn Barger) نے پہلی دفعہ ۱۹۹۷ء میں استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد لفظ بلاگ کو پیٹر مرہولز (Peter Merholz) نے مزاحیہ انداز میں لفظ 'ویب لاگ' کو توڑ کر blog کے طور پر استعمال کیا اور یہیں سے یہ لفظ مشہور ہو گیا۔ Xanga نامی سائٹ پر جو بلاگنگ میں ایک بڑا نام ہے، ۱۹۹۸ء تک صرف ۱۰۰/ بلاگ تھے مگر ۲۰۰۵ء تک ۲۰/ ملین سے تجاوز کر چکے تھے۔ اس کے بعد دوسرے لاتعداد بلاگ ہوسٹنگ ٹولز میدان میں آئے اور بلاگنگ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اوپن ڈائری بلاگنگ نے سب سے پہلے صارفین کو کسی بھی بلاگ پر تبصرہ کرنے کی سہولت فراہم کی جو بہت کامیاب رہی۔ مشہور بلاگ ہوسٹنگ مہیا کرنے والوں میں سب سے آگے گوگل کا بلاگر (blogger) یا بلاگ اسپاٹ (blogspot) نظر آتا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ گوگل نے بلاگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر بلاگر کو خرید لیا تھا۔

اُردو بلاگنگ

۲۰۰۵ء میں اُردو بلاگرز سامنے آنا شروع ہوئے۔ انھی بلاگرز کی بدولت انٹرنیٹ پر اُردو تحریر کی مکمل ویب سائٹس منظرِ عام پر آئیں۔

اُردو بلاگ بنانے کے مراحل

- کمپیوٹر کو اُردو لکھنے کے قابل بنانا۔
- بلاگنگ سروس کا انتخاب اور بلاگ سیٹ اَپ کرنا۔
- بلاگ پر اُردو بہتر انداز میں دِکھانے کے لیے بلاگ کے تھیم/ٹیمپلیٹ منتخب کرنا۔

کمپیوٹر کو اُردو لکھنے کے قابل بنانا

وِنڈوز کمپیوٹر پر اُردو بہتر انداز میں پڑھنے اور لکھنے کے لیے اُردو اِنسٹالر استعمال کیا جاتا ہے۔

گوگل آؤٹ پٹ ٹولز میں سے اُردو انسٹالر ڈاؤن لوڈ کر کے اِنسٹال کریں۔

بلاگنگ سروس کا انتخاب اور بلاگ سیٹ اَپ

اُردو بلاگ بنانے کے لیے سب سے پہلے بلاگنگ سروس کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ کئی کمپنیاں بلاگ بنانے کی سہولت مفت فراہم کرتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال گوگل کا بلاگ اسپاٹ ہے۔ بلاگر اور بلاگ اسپاٹ ایک ہی سروس کے دو نام ہیں۔ بلاگ اسپاٹ کے علاوہ بھی کئی کمپنیاں بلاگنگ کے لیے مفت سروس فراہم کرتی ہیں جیسے ورڈ پریس وغیرہ۔ مفت کی بلاگنگ سروس استعمال کرنے کی بجائے پیسے خرچ کر کے اپنے ذاتی ڈومین اور ہوسٹنگ پر بھی بلاگ بنایا جاسکتا ہے۔

بلاگ کا تھیم/ٹیمپلیٹ

تھیم اور ٹیمپلیٹ ایک ہی چیز ہے۔ ورڈ پریس والے اسے تھیم کہتے ہیں جبکہ بلاگ اسپاٹ والے ٹیمپلیٹ۔ جب بلاگ سیٹ اَپ کرلیا جاتا ہے تو اس کے بعد اس پر کوئی مناسب سا اُردو تھیم یا اُردو ٹیمپلیٹ لگایا جاتا ہے تاکہ بلاگ دیکھنے والوں کو اُردو بہتر انداز میں نظر آئے۔

مزید اگر آپ ویب ڈیزائننگ کی تھوڑی بہت معلومات رکھتے ہیں تو پھر آپ خود بھی کسی انگریزی تھیم یا ٹیمپلیٹ کا آسانی سے اُردو ترجمہ کرسکتے ہیں۔ گوکہ ورڈ پریس تھیم کا اُردو ترجمہ کرنے کے لیے اُردو محفل کا تھریڈ (thread) کافی پرانا ہوچکا ہے مگر پھر بھی کافی سودمند ہے۔

یاد رکھیں 'ورڈ پریس سی ایم ایس' کے ذریعے ذاتی ہوسٹنگ پر بنے بلاگ اور بلاگ اسپاٹ پر مفت میں اپنی مرضی کا تھیم یا ٹیمپلیٹ اَپ لوڈ کیا جاسکتا ہے جبکہ 'ورڈ پریس ڈاٹ کام' پر بنے بلاگ پر اُردو تھیم مفت میں اَپ لوڈ نہیں کیا جاسکتا۔ ورڈ پریس ڈاٹ کام پر اُردو بہتر انداز میں دِکھانے کے لیے ہر پوسٹ کے شروع اور اختتام پر کچھ ایچ ٹی ایم ایل کوڈ داخل کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ مفت میں بلاگ بنانے کے لیے ورڈ پریس ڈاٹ کام کی بجائے بلاگ سپاٹ کا انتخاب کیا جائے۔

دائرۂ عمل

ذاتی تجربات کے اظہار کے لیے تیار کیے ہوئے بلاگ کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہوگیا ہے۔ اب اس کا استعمال فطری اظہارِ خیال سے لے کر انتخابات میں ووٹ مانگنے تک یا آدمی کے ذاتی مفاد سے لے کر مختلف چیزوں کے اشتہار اور فروخت تک بڑھ گیا ہے۔ حتیٰ کہ کوئی بھی شعبہ اس کے اثر سے باقی نہیں بچا ہے۔ ہم یہاں بلاگ کی چند مثالیں پیش کررہے ہیں۔

بلاگ کے شعبے

۱۔ ذاتی ۲۔ اجتماعی ۳۔ کاروباری ۴۔ ادبی ۵۔ مذہبی ۶۔ سیاحتی ۷۔ تعلیمی

درج بالا شعبوں کے علاوہ بھی بلاگ کا استعمال بڑے پیمانے پر ہورہا ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا میں تقریباً ایک کروڑ

لوگ بلاگ بنا چکے ہیں۔350 کروڑ سے زیادہ لوگ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کا استعمال کر رہے ہیں اور ان میں سے 40 کروڑ سے زیادہ لوگ ہندوستانی ہیں۔اس کا مطلب ہندوستان میں ٹکنالوجی کا استعمال کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

بلاگ کی خصوصیات

۱) بلاگ کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہونی چاہیے۔

۲) عنوان پر کشش ہونا چاہیے۔

۳) خیالات کا اظہار واضح ہونا چاہیے۔

۴) بلاگ میں مہیا کی ہوئی جگہ کا بہترین استعمال ہونا چاہیے۔

۵) مواد قاری کے تجسّس کو ترغیب دینے والا ہونا چاہیے۔

۶) کسی متنازعہ موضوع پر بلاگ لکھنے سے گریز کرنا چاہیے۔

۷) سمعی و بصری وسائل کی لنک ہونی چاہیے۔

بلاگ کی قسمیں

۱۔ ذاتی بلاگ ۲۔اجتماعی بلاگ ۳۔ مائیکرو بلاگ ۴۔کارپوریٹ اور تنظیمی بلاگ ۵۔متحدہ بلاگ ۶۔ شعبہ جاتی بلاگ

۱) ذاتی بلاگ :

جب کوئی شخص بلاگ پر اپنے ذاتی خیالات، احساسات، جذبات اور پسند کے مطابق مضمون لکھتا ہے تو اُسے ذاتی بلاگ کہتے ہیں۔

۲) اجتماعی بلاگ:

جب ایک سے زائد بلاگرز بلاگ پر اپنے مضامین پوسٹ کرتے ہیں تو اُسے اجتماعی بلاگ کہتے ہیں۔

۳) مائیکرو بلاگ :

مائیکرو بلاگنگ ڈیجیٹل وسائل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو پوسٹ کرنے کے لیے مفید ہے جیسے میٹنگ، انتخابی تشہیر، کتاب کا حوالہ وغیرہ دیا جاتا ہے جس سے وقت اور محنت کی بچت ہوتی ہے۔

۴) کارپوریٹ اور تنظیمی بلاگ:

یہ سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کے کام کاج کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اپنے ماتحتوں تک تازہ ترین معلومات پہنچانے کے لیے اس بلاگ کا استعمال کرتے ہیں۔

۵) متحدہ بلاگ:

فرد یا ادارہ ایک خاص مقصد کے تحت جمع ہوتے ہیں۔عمر اور جنس کے حساب سے ان کے ذوق وشوق بھی مخصوص ہوتے ہیں۔ اسی کے مطابق یہ بلاگ تیار کیا جاتا ہے۔

۶) **شعبہ جاتی بلاگ :**

صحافت، علمِ طب، سیاحت، باغبانی، فوٹو گرافی وغیرہ مخصوص پیشوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بلاگ میں مضامین پوسٹ کیے جاتے ہیں۔

بلاگ کے اہم عناصر

۱)	بلاگ	آن لائن ڈائری
۲)	بلاگر	بلاگ تحریر کرنے والا
۳)	بلاگ ٹولز	بلاگ تیار کرنے کے وسائل
۴)	بلاگنگ	بلاگ تحریر کرنے کا عمل
۵)	بلاگ پوسٹ	بلاگ کی تحریر
۶)	بلاگوسپیئر	بلاگ کے قارئین

بلاگ بنانے کا طریقہ

بلاگ دوطرح سے بنائے جاسکتے ہیں۔اوّل تو یہ کہ آپ کسی بلاگ ہوسٹنگ فراہم کرنے والی ویب سائٹ پر رجسٹریشن کرواکر اپنا بلاگ لکھیں۔ جبکہ دوسرا راستہ یہ ہے کہ آپ اپنا ڈومین نیم اور ویب ہوسٹنگ خریدیں اور پھر کسی بلاگنگ ٹول کو ویب سائٹ پر اِنسٹال کرکے اپنا بلاگ بنالیں۔

بلاگ کے ٹولز

۱) **گوگل اکاؤنٹ (Google Account) کھولنا :**

بلاگ بنانے کے لیے انٹرنیٹ پر آپ کا گوگل اکاؤنٹ ہونا ضروری ہے۔اپنا موبائل نمبر اور دیگر ضروری معلومات فراہم کرکے گوگل اکاؤنٹ کھولا جاسکتا ہے۔

۲) **بلاگ کا پتا (Blog Address) :**

انٹرنیٹ پر بلاگ کا ایک ہی پتا (Address) ہوتا ہے۔اِس ایڈریس کا دوسرا بلاگ نہیں ہوتا۔

۳) **تھیم (Theme) :**

تھیم کی دو قسمیں ہیں : Customize اور html

Customize میں تھیم پہلے سے تیار کردہ ہوتے ہیں جو آسانی سے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ html تھیم بنانے کے لیے کمپیوٹر کی زبان (computer language) کا جاننا ضروری ہے۔

۴) **لے آؤٹ (Layout) :**

بلاگ کی بناوٹ کس طرح ہو؟ یہ لے آؤٹ میں طے کیا جاتا ہے مثلاً بلاگ کا نام، کالم کی تعداد، gadgets کہاں ہونے

چاہئیں، مواد کی جگہ کا تعین وغیرہ لے آؤٹ میں طے کیا جاتا ہے۔ لے آؤٹ میں ہم تبدیلی کر سکتے ہیں۔

۵) ہیڈر (Header):

بلاگ کا نام، لوگو، تصویر وغیرہ header کی مدد سے بنائے جاتے ہیں۔

۶) کراس کالم (Cross Column):

Cross Column کا استعمال فہرست کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اس میں بلاگ کے صفحات اور پوسٹ کو جوڑا جاتا ہے۔

۷) مین پوسٹ (Main Post):

مین پوسٹ کے ذریعے اپنا تیار کردہ مضمون شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں ہم مختلف رنگوں اور تصاویر کا استعمال کر سکتے ہیں۔

۸) ذرائع/معاون آلات (Gadgets):

پہلے سے تیار کردہ gadgets سے ضرورت کے مطابق ہم دوسرے gadgets استعمال کر سکتے ہیں مثلاً configure image کا استعمال ہم کسی تصویر یا مضمون کو شائع کرنے کے لیے کر سکتے ہیں HTML/JAVA configure کا استعمال animated تصویر دِکھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ خوب صورت بلاگ تیار کرنے کے لیے ویب پر html کوڈ مفت فراہم کیے جاتے ہیں۔ Gadgets کی مدد سے بلاگ خوب صورت بنایا جاسکتا ہے۔ ہم کوئی تصویر اور لوگو گوگل ڈرائیو پر اَپ لوڈ کر کے اُس کی لنک gadgets میں ڈال کر اُسے قاری کے لیے مہیا کر سکتے ہیں۔

۹) پوسٹ (Post):

مختلف مضامین، تقاریر، اظہارِ خیال وغیرہ کا شمار پوسٹ میں ہوتا ہے۔

۱۰) پیجز (Pages):

پیجز پوسٹ کی طرح ہوتے ہیں جو gadget میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ کراس کالم میں زیادہ تر پیجز کا استعمال ہوتا ہے۔

۱۱) اسٹیٹس (Status):

پورے بلاگ کی معلومات اس میں حاصل ہوتی ہے جیسے آپ کے بلاگ کے مضمون کو کتنی مرتبہ شیئر کیا گیا، کتنا پسند کیا گیا، کتنا ڈاؤن لوڈ کیا گیا اور کتنے لوگوں نے اس بلاگ پر وِزِٹ کیا۔

۱۲) ارننگ (Earning):

بلاگ پر ہم مختلف کاروباری اشتہارات دے سکتے ہیں۔ بلاگ کے ذریعے کیے گئے کاروبار کی وجہ سے ہمیں آمدنی ہوتی ہے۔

۱۳) کمینٹس (Comments):

بلاگ کے مضمون پر لوگوں کے ذریعے کیے گئے کمینٹ کو تشہیر کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔

۱۴) سیٹنگ (Setting):

بلاگ کو شائع کرنا، چُھپانا (hide)، صارفین کو استعمال کی اجازت دینا وغیرہ سیٹنگ میں جا کر کیا جاسکتا ہے۔

۱۵) گوگل ڈرائیو (Google Drive) اور بلاگ کا تعلق :

بلاگ پر مضامین، تصاویر، لوگو وغیرہ شائع کرنے کی حد مقرر ہوتی ہے۔ بلاگ پر storage کی کمی ہوتی ہے اس لیے یہ تمام مواد ہم گوگل ڈرائیو پر اَپ لوڈ کرکے اُس کی لنک بلاگ میں دے سکتے ہیں۔

اُردو کے چند مفید بلاگ

1) http://ghalibb.blogspot.com/
2) http://ghubar-e-khater.blogspot.com/
3) http://ncpulblog.blogspot.com/
4) http://urduseek.com/blog/
5) http://mushahidrazvi.blogspot.com/

مشقی سرگرمیاں

۱) بلاگ کی ضرورت پر نوٹ لکھیے۔
۲) بلاگ کی تعریف و وسعت تحریر کیجیے۔
۳) بلاگ کی تاریخ مفصل بیان کیجیے۔
۴) عمدہ بلاگ کی خصوصیات اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
۵) اگر آپ کو اپنے بلاگ کے لیے عنوان کا انتخاب کرنا ہے تو آپ کن باتوں کا خیال رکھیں گے؟
۶) کسی مضمون پر آپ اپنا بلاگ کیوں بنائیں گے؟ وجوہات کے ساتھ تحریر کیجیے۔
۷) کسی اُردو بلاگ کا مطالعہ کرکے اپنی رائے تحریر کیجیے۔
۸) اپنا بلاگ تیار کرتے وقت اُسے دلکش، جاذب نظر اور معلومات سے بھرپور بنانے کے لیے آپ کن باتوں کا خیال رکھیں گے؟
۹) بلاگ کی مختلف قسموں کی اہمیت مختصر بیان کیجیے۔

بلاگ کے ہوم پیج کا نمونہ

۵ ریڈیو جاکی

تمہید

دورِ حاضر میں ایک دوسرے سے تعلق پیدا کرنے کے لیے انسان مختلف عوامی رابطے کے ذرائع استعمال کرتا ہے جن میں تحریری، سمعی اور بصری ذرائع شامل ہیں۔ طباعتی ذرائع ابلاغ میں اخبارات ورسائل وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ سمعی ذرائع ابلاغ میں ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیپ ریکارڈر کے علاوہ ریکارڈنگ کے دیگر جدید ذرائع شامل ہیں۔ سمعی و بصری ذرائع میں ٹیلی ویژن، فلم، ویڈیو ریکارڈنگ، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ ان ذرائع سے تخیلی مواصلات، عوامی تفریح، عوامی بیداری، رہنمائی اور دیگر شعبوں کی معلومات کا ذخیرہ کر کے عوام تک پہنچایا جاتا ہے۔ ان ذرائع ابلاغ میں ریڈیو سے تعلق رکھنے والے 'ریڈیو جاکی' کی معلومات ذیل میں دی جا رہی ہے۔

۱۹۲۷ء میں بھارت میں 'انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی' نے اُس وقت کی حکومت سے معاہدہ کیا اور ممبئی اور کولکاتا میں ریڈیو اسٹیشن شروع کیے۔ حکومتِ میسور نے ۱۹۳۵ء میں قائم کردہ ریڈیو اسٹیشن کو 'آکاش وانی' سے موسوم کیا۔ اس کے بعد بھارت سرکار نے ریڈیو اسٹیشن کے لیے اسی نام کو اختیار کر لیا۔

'بہوجن ہِتائے - بہوجن سُکھائے' آکاش وانی کا نعرہ تھا۔ آکاش وانی سے اعلانات، خبریں، تقاریر، انٹرویو، مباحثے، ریڈیائی ڈرامے، موسیقی اور مختلف کھیلوں کا آنکھوں دیکھا حال جیسے مختلف پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جو عمر کے لحاظ سے مختلف زمروں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ریڈیو کی جدیدیت کو اختیار کر کے نظامت کا نیا انداز، نئے تصور کے ساتھ 'ریڈیو جاکی' کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

ریڈیو جاکی کا پس منظر

۱۹۲۰-۳۰ء کی دہائی میں شروع ہونے والا ریڈیو کا سفر ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مستحکم ہوا۔ ۲۳/ جولائی ۱۹۷۷ء کو چینئی میں FM اسٹیشن شروع ہوا۔ ۱۹۹۳ء تک آل انڈیا ریڈیو کی نشریات سرکاری ہوا کرتی تھیں۔ اس کے بعد سرکار نے ریڈیو کے شعبے کو نجی کر دیا۔ ۳/ جولائی ۲۰۰۱ء سے 'ریڈیو سٹی بنگلور' بھارت کا اوّلین نجی ایف. ایم ریڈیو اسٹیشن شروع ہوا۔ دی ٹائمز گروپ نے 'ریڈیو مرچی' اسٹیشن ۴/ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو اندور سے شروع کیا۔

مہاراشٹر میں نجی ایف. ایم ریڈیو ۲۰۰۲ء سے شروع ہوا۔ ریڈیو مرچی، ریڈیو سٹی، ریڈ ایف. ایم، ایف. ایم گولڈ وغیرہ اسٹیشن قابلِ ذکر ہیں جن سے ۲۴/ گھنٹے تفریحی پروگرام کا نشریہ جاری رہتا ہے۔ صبح سے رات تک مسلسل جاری رہنے والے مختلف پروگرام میں بجنے والے گیت کئی مرتبہ دہرائے بھی جاتے ہیں۔ البتہ درمیان میں تبدیلی آتی ہے۔ مختلف پروگراموں کو پیش کرنے کے لیے مختلف ناظم ہوتے ہیں جنھیں 'ریڈیو جاکی' (آر. جے./.R.J) کہتے ہیں۔

ریڈیو جاکی کا تصور

ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام میں خوش اسلوبی اور متاثر کن انداز میں نظامت کرنے والی شخصیت کو 'ریڈیو جاکی' کہتے ہیں۔اسی طرح پہلے سے ریکارڈ شدہ موسیقی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے پروگرام چلانے والا فرد 'ڈِسک جاکی' (ڈی.جے./.D.J) کہلاتا ہے۔

ریڈیو جاکی یعنی آر.جے. مختلف طرز کی موسیقی جیسے گیت، غزل، صوفی سنگیت، ہپ ہاپ وغیرہ پر مبنی موسیقی ریز پروگرام پیش کرتا ہے، ٹاک شو منعقد کرتا ہے۔ پروگرام کے دوران سامعین سے فون کے ذریعے بات چیت کرتا ہے اور مہمانوں کا انٹرویو لیتا ہے۔ ماحول، کھیل، خبروں کی سرخیاں اور ٹرافک کی تازہ صورتِ حال وغیرہ کی معلومات فراہم کرنا بھی آر.جے. کی ذمے داری ہوتی ہے۔ ریڈیو جاکی اپنے تعارف میں مخفف .R.J (آر.جے) کے ساتھ اپنا ذاتی نام بتاتا ہے مثلاً 'میں آر.جے. جاوید یا آر.جے. اُپورواآپ سے مخاطب ہوں۔' عام طور پر ایک آر.جے. کو مسلسل تقریباً ۲ سے ۳ گھنٹے تک سامعین کو محظوظ کرنا پڑتا ہے۔اس لحاظ سے اسے برجستہ، حاضر جواب، موقع محل کی مناسبت سے گفتگو کرنے والا اور مختلف النّوع معلومات کا جاننے والا ہونا چاہیے۔ان اوصاف کی وجہ سے ہی وہ زیادہ مقبول ہوسکتا ہے۔معلومات کی فراہمی کے وقت اسے زبان پر عبور بھی ہونا چاہیے۔ آر.جے. مقامی زبان کے ساتھ اُردو، ہندی اور انگریزی زبان کو ملا کر نظامت کرتا ہے۔ گویا وہ بیک وقت کئی زبانوں کا جاننے والا ہوتا ہے۔ آر.جے. کی آواز، انداز اور پیش کیے جانے والے پروگرام ہی اس ریڈیو اسٹیشن کی شناخت بن جاتے ہیں۔ مسلسل دو سے تین گھنٹے تک تفریح کرنے کے لیے وہ مختلف موضوعات اور تدابیر کا استعمال کرتا ہے مثلاً فون پر سامعین سے گفتگو، مباحثے، مختلف طرز کے مقابلوں کا انعقاد، سال گرہ منانے، اسی طرح قومی اور بین الاقوامی سطح پر منائے جانے والے خاص دنوں پر بات چیت وغیرہ کا نظم کرتا ہے۔

سامعین کی کثیر تعداد کو پروگرام میں شامل کرلینا اور پھر اس میں مصروف رکھنا بہت اہم کام ہے۔ بعض اوقات براہِ راست نشریے میں موضوعاتی معلومات پر بحث و مباحثہ بھی کرایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی کسی مشہور شخصیت کو ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں مدعو کیا جاتا اور اُن کا انٹرویو لیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی نغمے پیش کرنے یا گانے بجانے کا کام بھی جاری رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ سامعین کے کان سے دل تک کامیاب رسائی حاصل کرنے والا آر.جے کہلاتا ہے۔

ریڈیو جاکی کے کام کی نوعیت

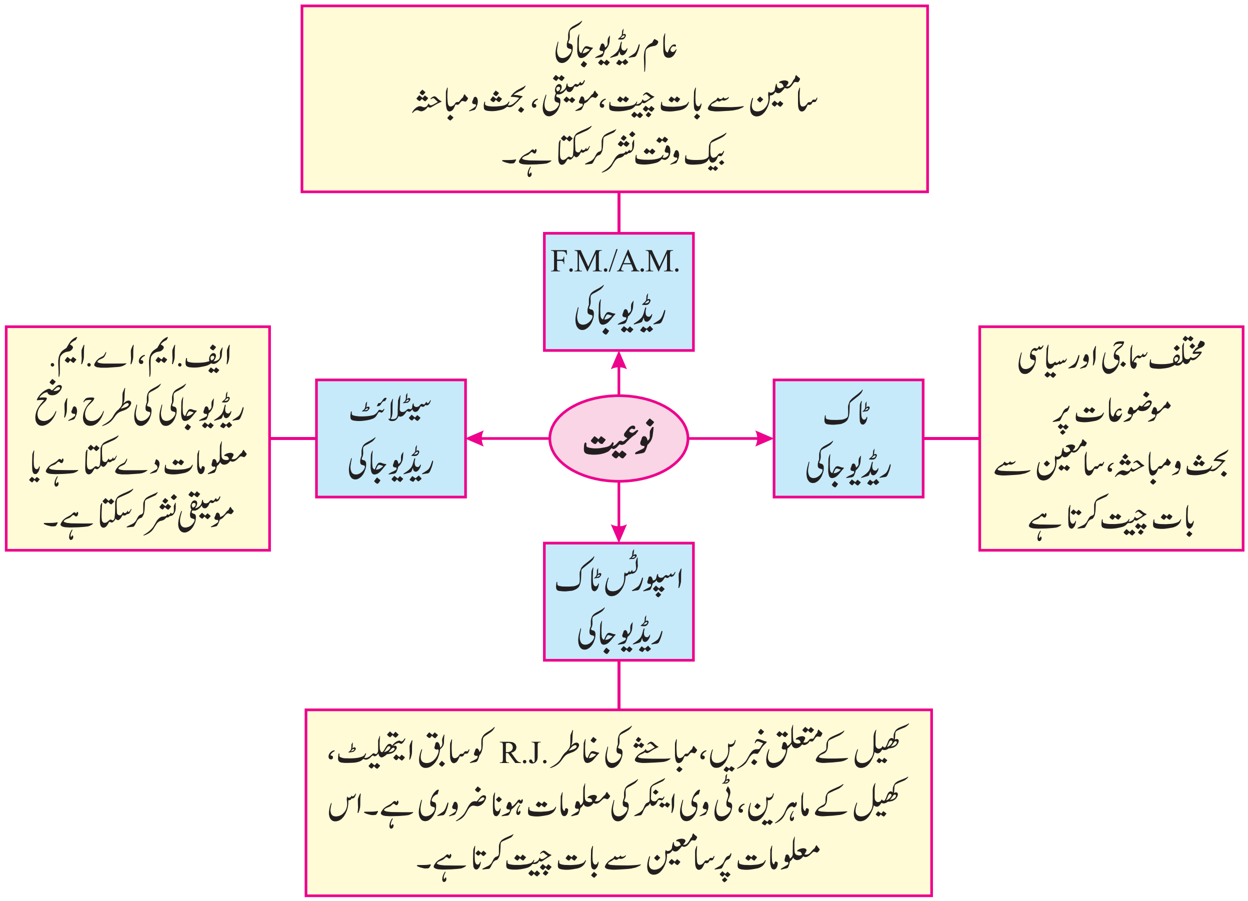

ریڈیو جاکی کے شعبے کی وسعت میں کافی اضافہ ہوتا نظر آ رہا ہے اور اس شعبے سے متعلق نئے نئے مواقع کھلتے نظر آ رہے ہیں۔ اس میں ایف.ایم، اے.ایم پر جاکی، مختلف سماجی، سیاسی موضوعات پر سامعین سے خوش اسلوبی سے بات چیت کرنے والا ریڈیو جاکی، کھیل سے متعلق بات چیت کرنے والا اسپورٹس جاکی، اسی طرح سیٹلائٹ ریڈیو جاکی موجود ہیں۔ یہ ریڈیو جاکی کسی مسئلے پر واضح اور پُرزور طریقے سے بول سکتا اور پروگرام نشر کرسکتا ہے۔

ریڈیو جاکی کے کردار کے مختلف پہلو

- آر.جے کی شخصیت خوش مزاج، زندہ دل، حاضر جواب، ہشاش بشاش ہونی چاہیے۔
- آر.جے کو کثیر الجہات اور ہمہ گیر شخصیت کا مالک ہونا چاہیے۔
- آر.جے کو تخلیقی ذہن کا مالک ہونا چاہیے۔
- آر.جے کو بولنے اور بحث ومباحثے کا ذوق وشوق ہونا چاہیے۔
- آر.جے کے پاس عمدہ طرزِ تکلم ہونا چاہیے۔
- موقع ومحل کے اعتبار سے آر.جے کے پاس لطائف اور اشعار کا ذخیرہ ہونا چاہیے۔

ریڈیو جاکی کے لیے درکار مطالعے اور زبان کی مہارت

- آر۔ جے کو نظامت سے دلچسپی ہونی چاہیے۔ مطالعے کی عادت ہونی چاہیے۔
- آر۔ جے کو زبان، ادب اور تہذیب کے متعلق معلومات ہونی چاہیے۔
- آر۔ جے کو سماجی، سیاسی، تاریخی اور جغرافیائی وغیرہ معلومات ہونی چاہیے۔
- آر۔ جے کو فلم انڈسٹری، موسیقی اور رقص کے شعبوں کی عمدہ معلومات ہونی چاہیے۔
- آر۔ جے کو سوشل میڈیا پر آنے والے نئے رجحان اور تازہ ترین معلومات کا بھی علم ہونا چاہیے۔
- آر۔ جے میں پروگرام کی نوعیت کے مدنظر لائحۂ عمل ترتیب دینے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔
- آر۔ جے کو نظامت کے دوران بعض اوقات اعداد و شمار پر مبنی معلومات فراہم کرنی پڑتی ہے اس لیے متعلقہ معلومات اس کے علم میں ہونی چاہیے۔
- آر۔ جے کو مادری زبان کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں اور بولیوں کی بھی معلومات ہونی چاہیے۔
- درج بالا صلاحیتوں کو مزید بہتر بنانے اور کامیاب آر۔ جے بننے کے لیے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ جو نوجوان ایسی پیشہ ورانہ صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لیے اس شعبے میں بہت مواقع ہیں۔

ریڈیو جاکی کی آواز اور نظامت کی خصوصیات

- آر۔ جے کی آواز بہت صاف، واضح اور پُرکشش ہونی چاہیے۔
- آر۔ جے کا اندازِ بیان دل نشین اور اندازِ پیش کش دل آویز ہونا چاہیے تاکہ سامعین کو معلومات کے ساتھ ساتھ سکون بھی محسوس ہو۔
- آر۔ جے کی آواز کا اُتار چڑھاؤ اور لہجہ مناسب ہونا چاہیے کیونکہ خیالات و جذبات کی پیش کش میں اس کا اہم کردار ہوتا ہے۔ آر۔ جے کو اس کی مشق بھی کرتے رہنا چاہیے۔
- منتخب نغمے، قصے سناتے وقت تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے۔ اسی درمیان سامعین کو موزوں اور ضروری معلومات بھی فراہم کرنی چاہیے۔
- کسی مشہور شخصیت کی سالگرہ پر مبارکباد دیتے وقت آواز میں خوش مزاجی اور توانائی ضروری ہے۔ البتہ کسی کی تعزیت کے وقت مناسب تبدیلی بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔
- صرف تفریح کو مدنظر رکھ کر جو آر۔ جے سامعین سے مخاطب ہوتا ہے، وہ بہترین آر۔ جے بنتا ہے مگر تفریح کے ساتھ ساتھ پروگرام کو دلچسپ بنانے کے لیے موزوں معلومات فراہم کرنا بھی اہم ہے۔

آج ریڈیو کے شعبے میں روزگار کے متلاشی نوجوانوں کے لیے بہترین مواقع دستیاب ہیں۔

اندازِ گفتگو - ایک ضروری مہارت

آر. جے کو ایجنڈے کے مطابق ہی پروگرام کی پیش کش کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح مختلف مواقع پر مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور عام سامعین سے گفتگو کی جاتی ہے۔ اسٹوڈیو میں آنے والے ماہرین ومہمانان کا براہِ راست انٹرویو یا ریکارڈ شدہ انٹرویو کی طرز پر فون کے ذریعے بھی انٹرویو لیا جاسکتا ہے۔ جب آر. جے متعلقہ شخصیت کو فون کر کے انٹرویو لیتا ہے تو اُسے 'ڈائل آؤٹ' (Dial Out) کہا جاتا ہے مثلاً کسی مشہور فن کار کے انتقال کے بعد اس فن کار کے متعلقین سے اسٹوڈیو سے فون پر گفتگو کی جاتی ہے۔

سامعین کو مخصوص موضوع دے کر فون کے ذریعے ان کی آرا، تجربات وغیرہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسے 'ڈائل اِن' (Dial In) کہا جاتا ہے مثلاً قومی یا ریاستی بجٹ ظاہر ہونے پر اس سے متعلق عوام کے تاثرات جاننا۔

- متعلقہ فرد سے ہونے والی گفتگو کھلے دل سے ہونی چاہیے۔
- انٹرویو میں لطف اندوزی ہونا چاہیے۔
- متعلقہ فرد کے کام کی مکمل معلومات حاصل کر کے سوالات اور موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے۔
- 'ڈائل اِن' پروگرام کے براہِ راست نشریے میں گفتگو مختصر کرنا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ سامعین کو شامل کیا جانا چاہیے۔
- سامعین یا مقرر سے مخاطب ہوتے وقت آر. جے کو شیریں گفتار اور حاضر جواب ہونا چاہیے۔
- آر. جے کو چاہیے کہ وہ موزوں اور مختصر کلام کرے اور مخاطب کو زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے۔

ریڈیو - پیشہ ورانہ مواقع :

آر. جے پروگرام کے شعبے :

- خواتین کے لیے
- نوجوانوں کے لیے
- تعلیمی پروگرام
- زراعتی پروگرام
- تہوار سے متعلق پروگرام
- موسیقی سے متعلق پروگرام
- نشری سیمینار
- سامعین کے خطوط
- ناگہانی آفت
- سائنسی خبریں

ریڈیو جاکی کے شعبے

آپ اگر تفریح کے ساتھ دل کھول کر دوسروں کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں تو آپ ایک بہترین آر. جے بن سکتے ہیں۔ واضح تلفظ، زبان کا علم، موسیقی کا علم، تخلیقی ذہانت، حاضر جوابی اور مشاہدے جیسی خصوصیات کی بنیاد پر آپ ریڈیو جاکی کے کسی بھی شعبے میں ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں دیے ہوئے شعبوں کو بطور ملازمت اور صنعت کے لیے منتخب کیا جاسکتا ہے۔

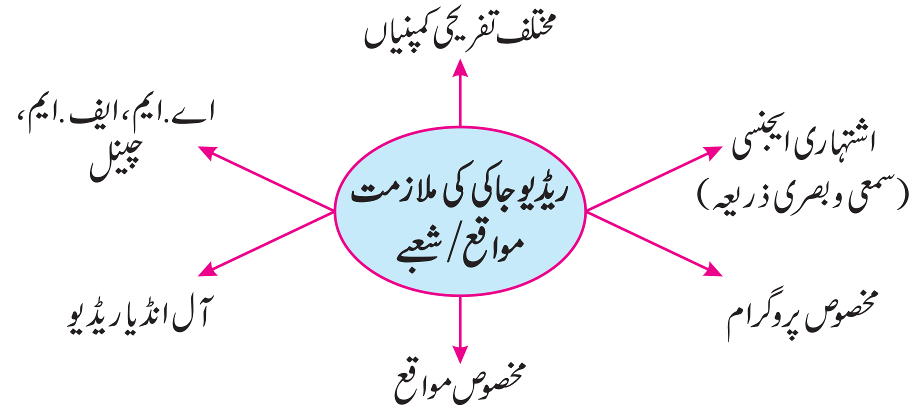

مثالی نمونہ

''السلام علیکم، آداب، گڈ مارننگ۔ ریڈیو سٹی 91.9 پر آپ سن رہے ہیں مجھے یعنی آر.جے فرحان کو۔
آج پیر کا دن اور صبح کے سات بجے ہیں۔ باہر رِم جھم رِم جھم بارش ہو رہی ہے۔ موسم خوش گوار ہے۔ چھائی بہار ہے اور اس رومانی ماحول میں آپ کا انتظار ہے۔ صبح کے اس پہلے نشریے میں آج موسم کی مناسبت سے پیش ہے...آج کا پہلا نغمہ...''

ریڈیو ہر گھر تک آسانی سے پہنچنے والا تیز رفتار ذریعہ ہے۔ آج اس شعبے میں آر.جے کی شخصیت مقبول ترین ہے۔ مختلف علاقائی، قومی اور بین الاقوامی ریڈیو اسٹیشن کے قیام کے ساتھ آج کل ریڈیو چینل بطور صنعت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

مشقی سرگرمیاں

۱) ریڈیو جاکی بننے کے لیے کی جانے والی کوشش بیان کیجیے۔
۲) آپ آر.جے ہیں ایسا فرض کیجیے اور 'نوجوانوں کے لیے کریئر کے مواقع' اس موضوع پر پروگرام کا ایجنڈا بنائیے۔
۳) آر.جے عمدہ متکلم ہوتا ہے، نوٹ لکھیے۔
۴) ریڈیو جاکی کے شعبے میں پیشہ ورانہ ملازمت کے مواقع میں اضافے کے اسباب بیان کیجیے۔

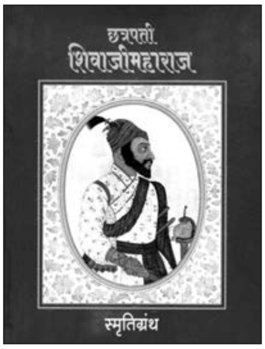

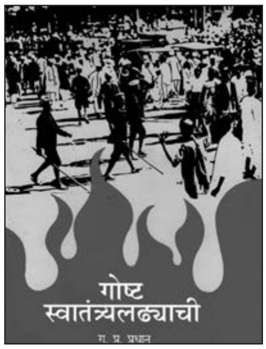

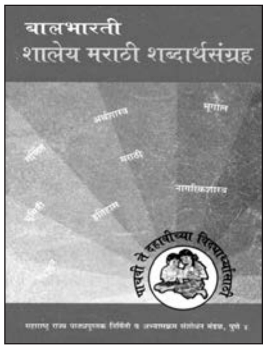

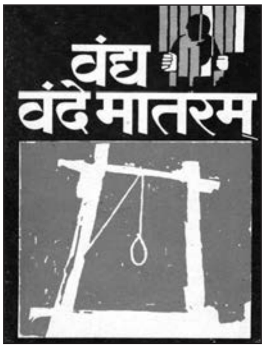

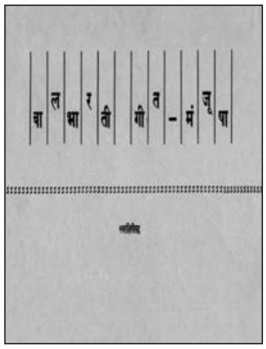

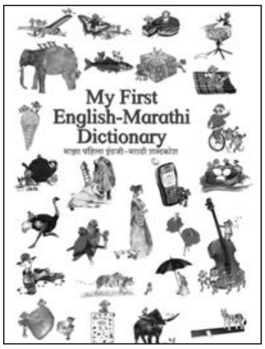

- पाठ्यपुस्तक मंडळाची वैशिष्ट्यपूर्ण पाठ्येत्तर प्रकाशने.
- नामवंत लेखक, कवी, विचारवंत यांच्या साहित्याचा समावेश.
- शालेय स्तरावर पूरक वाचनासाठी उपयुक्त.

पुस्तक मागणीसाठी www.ebalbharati.in, www.balbharati.in संकेत स्थळावर भेट द्या.

साहित्य पाठ्यपुस्तक मंडळाच्या विभागीय भांडारांमध्ये विक्रीसाठी उपलब्ध आहे.

ebalbharati

विभागीय भांडारे संपर्क क्रमांक : पुणे - ☎ २५६५९४६५, कोल्हापूर- ☎ २४६८५७६, मुंबई (गोरेगाव) - ☎ २८७७१८४२, पनवेल - ☎ २७४६२६४६५, नाशिक - ☎ २३९१५११, औरंगाबाद - ☎ २३३२१७१, नागपूर - ☎ २५४७७१६/२५२३०७८, लातूर - ☎ २२०९३०, अमरावती - ☎ २५३०९६५

مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک نرمتی وابھیاس کرم سنشودھن منڈل، پونہ

₹ 98.00

युवकभारती इयत्ता अकरावी (उर्दू माध्यम)